دائرے
انسان
علم
آخری دن
ویریندر پٹواری

انسان
آخری دن
دائرے
ویریندر پٹواری

اکتوبر ۲۰۱۰ء

''اس کتاب کی طباعت کے لیے جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجیز سے مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ظاہر کی گئی آراء سے کلچرل اکیڈیمی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ اس ضمن میں کلچرل اکیڈیمی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔''

"I am thankful to the J&K Academy of Art, Culture and Languages for providing financial assistance for publishing of my manuscript entitled 'DAYERE' in Urdu language. The Academy should not be responsible in any way for any sort of controversy, omissions or commissions in the contents of this book."

Veerindar Patwari
Author

دائرے

(افسانے)

ویریندر پٹواری

تقسیم کار

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

سنِ اشاعت : ۲۰۱۰ء
قیمت : دوسو روپے
کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق : ایم آرٹس
مطبع : ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2
ناشر : مصنف

ISBN 978-81-8042-135-8

تقسیم کار

موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

منسوب کر رہا ہوں

اپنے والدین

آنجہانی پنڈت پریم ناتھ پٹواری مسرور کشمیری

آنجہانی سوماوتی پٹواری

اپنی لختِ جگر

مرحومہ آشا پٹواری سپرو

اور

اپنی شریکِ حیات

مرحومہ للیتا پشن پٹواری

کی یادوں

(جو میرا آخری سرمایہ ہیں)

کے نام — یہ کتاب!

فہرست

مجھے کچھ کہنا ہے

ایک تخلیق کار ہونا معاشرے میں باعثِ فخر ہے یا نہیں یہ ایک بحث کا موضوع ہے۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو خود کچھ کر نہیں سکتے اس لیے جو کر رہے ہیں ان کو وہ اپنی نکتہ چینی کا ہدف بنا لیتے ہیں۔ میں ایسے بھی لوگوں سے ملا ہوں جو کلاسیکل سنگیت خاص طور پر گائیکی کو Plannned Hysteria سمجھتے ہیں۔

پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا۔ نہ کوئی یلغار نہ کوئی جنگ! نہ جیت نہ ہار۔ مجھ سے پوچھ لیں تو میں اپنے عقیدے کے مطابق بس اتنا کہوں گا کہ جن پر علم کی دیوی ماتا سرسوتی مہربان ہو وہی تخلیق کار ہوتے ہیں۔

تخلیق کار، قلم کار، اداکار، سنگیت کار، صداکار، چتر کار، فلم کار یا فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والا شخص ہو سکتا ہے۔ ہاں کس کو کیا کرنا ہے یہ خدا کی رضا ہے۔ کسی کو عزّت، شہرت یا دولت مل جاتی ہے یہ بھی رضائے خدا ہے۔ عام طور پر مفکر سمجھتے ہیں کہ ایک تخلیق کار، چھوٹا یا بڑا، جانا مانا یا گمنام، اعزازات پانے والا یا نظر انداز ہو چکا ہو، ایک فنکار ہوتا ہے، اور ایک فنکار چار عدد جز کا مرکب ہوتا ہے:

پہلا جز - وراثت یعنی Inheritance

دوسرا جز - صحبت یعنی Company۔ اچھی صحبت سے وراثت میں پائی گئی تخلیقی صلاحیتوں کو تقویت ملتی ہے۔

تیسرا جز - تربیت یعنی Education، جو تخلیقی صلاحیتوں کی خامیوں اور خوبیوں کے بارے میں نہ صرف جانکاری دیتی ہے بلکہ مددگاری کے گُر بھی سمجھاتی ہے۔ جیسے کسی گایک کو سُر لے کا گیان۔

چوتھا جُز - تخلیق کار کا مشاہدہ، مطالعہ، تصوّر اور ریاض کے بعد ادائیگی۔

میں خوش قسمت ہوں کہ:

(۱) اپنے دادا آنجہانی گلاب رام پٹواری، ساکن سوپور، کشمیر

— اپنے نانا آنجہانی آفتاب رام پوتو، ساکن سوپور، کشمیر

— اپنے والد آنجہانی پریم ناتھ پٹواری مسرّور کشمیری

— اپنی والدہ آنجہانی سوماوتی پٹواری — سے مجھے تخلیقی صلاحیتیں ورثے میں ملیں۔

میرے والدِ مرحوم ایک زبان دان ہونے کے ساتھ ایک جانے مانے شاعر تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُردو، ہندی، فارسی اور انگریزی زبان پر عبور تھا۔ وہ مصوّر بھی تھے۔

جبکہ میری والدہ مرحومہ اسّی سال کی عمر میں سُر اور لے میں پنچم سُر میں کشمیری نغمے گایا کرتی تھیں۔ وہ مٹّی کے بُت بھی بنایا کرتی تھیں۔

(۲) میرے والدِ مرحوم کے ذوق کی وجہ سے بچپن سے میرا ادب سے لگاؤ ایک شوق بن گیا تھا۔

(۳) میرے پھوپھی زاد بھائی شری برج لال ڈار کو اُردو شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ ان کی وجہ سے مرحوم فیض احمد فیضؔ کا کلام تب میں نے سن کر یادداشت کا حصہ بنالیا تھا جب میں مشکل سے چودہ سال کا تھا۔ ان کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی جو میرے لیے گنجینۂ ادب ثابت ہوکر میرے لیے تربیت کا کام کرگئی۔

میرے چھوٹے بھائیوں شری راجندر پٹواری (جو ایک مشہور مصوّر بھی ہیں، میرے لیے اُردو کے مشہور ادبا و شعرا کی کتابیں ممبئی سے لایا کرتے تھے) اور ڈاکٹر اشوک کی صحبت اور تبادلۂ خیال سے بھی مجھے اپنی ابتدائی کہانیوں کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں جانکاری ملتی رہی۔ ممبئی میں پڑھائی کے دوران راجندر کی مرحوم علی سردار جعفری اور مرحوم ساحر لدھیانوی سے خاصی جان پہچان ہوگئی تھی اور میری پہلی کہانی کا انتخاب انھوں نے ہی کیا تھا۔

(۴) میں پیشے سے ایک سوِل انجینئر ہوں۔ شاید ادب سے ناطہ ٹوٹ چکا ہوتا اگر مرحوم تاجدار صدیقی، جو تب 'شاعر' ممبئی کے مدیر تھے، نے میری ایک کہانی اپنے جریدے میں شائع کرکے مجھے نیشنل لیول پر نہ لایا ہوتا۔ 'شاعر' میں چند اور کہانیاں شائع ہوئیں تو 'بیسویں صدی' دہلی میں بھی ایک کہانی شائع ہوئی۔ پھر کہانیاں واپس آنے کی بجائے مدیران کے خطوط آتے رہے اور میں نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔

جناب مظہر امام نے، جو خود ایک قد آور شاعر ہیں، میری حوصلہ افزائی کی۔ شری پران کشور اور شری وشنو بھاردواج نے قارئین سے میرا تعارف کرادیا۔ اس دوران ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے جریدے 'چنگاری' میں میری ایک کہانی شائع کر کے ایک بونے کو قد آور کہانی کاروں کے کارواں میں شامل کردیا۔

مرحوم پشکر ناتھ، مرحوم علی محمد لون، مرحومہ عصمت چغتائی اور مرحوم رام لال جیسے بلند ادب پروروں کی صحت مند تنقید نے میرے لیے ایک اچھی تربیت کا کام کیا۔ دراصل شروعات میں اپنی خوبیوں کے بارے میں جانکاری پانے سے اچھا ہے کہ اپنی خامیوں کے بارے میں احساس دلایا جائے، یہ میری تربیت تھی۔

تربیت کے بعد اُردو دُنیا نے مجھے اپنالیا اور نیشنل اور انٹرنیشنل سطح کے جرائد میں میری اب تک تقریباً دو سو ساٹھ کہانیاں شائع ہو کر بلند ذوق قارئین نے پسند کی ہیں۔

جموں یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے میرے افسانوں کے مجموعے 'بے چین لمحوں کا تنہا سفر' پر ایم فِل کے لیے ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ چند شہرت یافتہ تحقیق کاروں اور تنقید نگاروں نے اپنی انعامات و اعزازات پانے والی کتابوں میں میری افسانہ نگاری پر لکھے اپنے مضامین شامل کر کے میرے قلم پر میری گرفت کو مضبوط کر دیا ہے ورنہ ایک کار حادثے کی وجہ سے میں جسمانی طور پر اپاہج ہوں۔ نہ چل پھر سکتا ہوں اور نہ بول سکتا ہوں — مگر سوچ سکتا ہوں، سمجھ سکتا ہوں، پڑھ سکتا ہوں، لکھ سکتا ہوں۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے۔

اب تک میرے چھ افسانوں کے مجموعے اور دو ڈراموں کے مجموعے اُردو میں شائع ہوئے ہیں۔ ایک ناولٹ دیوناگری لپی میں شائع ہو چکا ہے اور اپنی مادری زبان کشمیری میں افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ دو عدد افسانوں کے مجموعے زیر طبع ہیں۔ بہت جلد منظرِ عام پر آنے کی اُمید باندھ لی ہے۔

میں نے اپنی کہانیوں اور ڈراموں میں کئی تجربات کیے ہیں۔ کچھ تجربات قارئین، سامعین اور ناظرین کو پسند آئے اور کچھ مسترد کر دیے گئے۔ مثلاً ناولٹ 'کب بھور ہوئی' نثری نظم میں لکھا تھا۔ قارئین نے میری اس کاوش کو خارج کر دیا۔ دراصل میں نے یہ ناولٹ اُردو میں 'وہ صبح کبھی تو آئے گی'' کے عنوان سے لکھا تھا اور ریاستی کلچرل اکادمی سے مالی تعاون لے کر اُردو اور دیوناگری لپی

میں ایک ساتھ شائع کرنے کا خواہشمند تھا۔ اکادمی نے ہندی میں چھاپنے کی منظوری دی اس لیے کتاب صرف ہندی میں ہی شائع ہو سکی۔ ہندی والوں نے ناولٹ کو اُردو کی کتاب سمجھ کر خارج کر دیا جبکہ اُردو والوں نے ناولٹ کو ہندی کتاب سمجھ کر قبول نہیں کیا۔

میں پچھلے دو سال سے مصر کی راجدھانی قاہرہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ رہتا ہوں۔ ادبی دُنیا سے کٹ گیا ہوں — مگر یکطرفہ — اس لیے کہ مجھے پڑھنے کو اُردو جرائد یا کتابیں مل نہیں سکتیں مگر میں لکھتا رہتا ہوں اور قارئین کے خطوط پڑھ کر دل چاہتا ہے کہ جب میں آخری سانس لوں، میرا قلم میرے ہاتھ میں ہو۔

'دائرے' میرا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کو میری تخلیقات پسند آئیں گی۔

—— ویریندر پٹواری

دائرے

دریائے جہلم جیسے کشمیر میں صدیوں سے بہتا آرہا ہے ویسے ہی دریائے نیل قاہرہ میں بہہ رہا ہے۔ وقت کی کروٹوں کے ساتھ بدل چکی یا بدل رہی زندگی کی داستانیں بتاتے ہوئے، ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے، عبادت کرنے والے اس دور کے مسلمان، اپنے دیوتاؤں کی پرستش کرنے والے فرعون (Pheros) کو آج بھی یاد کرتے ہیں اور روز صدیوں پرانے پیرامیڈس (Pyramids) میں روشنی اور صوتی اثرات سے سیاحوں کو فخر سے اپنے گزرے ہوئے زمانے کی یاد دلاتے ہیں!

مقطم (Mukattum) قاہرہ (Cairo) شہر میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے سارا شہر دریائے نیل اور تین عدد پیرامیڈس یوں نظر آتے ہیں گویا کھڑکی کھول کر اپنا باغیچہ دیکھا جا رہا ہو۔ بالکل ویسے ہی جیسے شنکر آچاریہ کے مندر کی پہاڑی سے جھیل ڈل باری پربت اور شہر سری نگر کشمیر کا ایک خوبصورت حصّہ نظر آتا ہے۔ میں قاہرہ کو دیکھ تو رہا تھا مگر اپنے وطن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اچانک ایک جانی پہچانی آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ گویا یہاں کے انسان نے گوتم بدھ کے صدیوں پرانے بت یا کسی مسجد کو توڑ کر تواریخ کی جیومیٹری کو مسخ نہیں کیا ہے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو گویا ایک پرانی پینٹنگ پر جمی دھول کو ہٹا کر میں نے ایک چہرہ پہچان لیا۔ چہرے پر وہی پُرکشش مرحوم بسم اللہ خاں (بھارت رتن شہنائی نواز) جیسی معصوم مسکراہٹ مگر آنکھوں میں ویسی چمک نہیں تھی جیسی ہمارے ہر دل عزیز پروفیسر جیومیٹری میں ہوا کرتی تھی۔

یوں تو ڈاکٹر نورالدین قریشی ہمارے انگریزی کے پروفیسر تھے لیکن چونکہ ہر بات یا موضوع بلکہ مسئلے کو جیومیٹری (Geometary) سے جوڑ کر ایک نئی بات پیدا کرنے کے عادی تھے اس لیے ہم یعنی اسٹوڈنٹس نے ان کا نام پروفیسر جیومیٹری رکھا تھا، وہ جب کسی سے خوش ہوا کرتے تھے تب مسکرا کر کہہ دیتے کہ جب تمھارے زاویے درست تھے تب تمھاری جیومیٹری غلط ہو ہی نہیں سکتی!

اپنی ناراضگی کا اظہار وہ یوں منہ کھول کر کرتے تھے گویا ایک غار کے اندر پھنسا انسان یہ کہہ رہا ہو کہ نظریہ بدل کر کیا زاویے بدل جاتے ہیں؟ اگر نہیں تو یہ جیومیٹری کیسے بدل گئی؟ ایک دائرہ تکون کیسے بن گیا۔

جب بھی کہیں اکثریت اقلیت پر دباؤ بنا دیتی تھی تب وہ اپنی تقریروں میں بس جیومیٹری کا حوالہ دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ ایک بڑے تکون میں چھوٹا تکون دل بن جاتا ہے۔ دل کو ٹھیس مت پہنچاؤ اے خدا کے بندو! ہاں دل کو بھی جسم کے لیے خطرہ پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بھی کسی کے بہکانے پر بھٹک کر اور پھر بھڑک کر! ان کی باتیں جلوس والے بھی کیسے سمجھ پاتے جبکہ جلسوں میں شریک ہوئے لوگوں کو بھی یہ سمجھ نہیں آیا کرتا تھا کہ وہ ان کے حق میں بول رہے تھے یا ان کے خلاف۔ کئی بار دونوں کی مار کھاتے رہے۔

ایک بار گرفتار بھی ہوئے تو اپنی ہر بات میں جیومیٹری کا حوالہ دے کر اس لیے گھر لوٹ آئے کیونکہ پولیس کے افسرِ اعلیٰ کو یا تو ان کی باتوں میں فلسفوں کی چاشنی نظر آئی تھی یا پھر خرافات کے کیڑے۔ کیونکہ وہ گہری سوچ کے بعد ان کو دروازے پر چھوڑ کر خود بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

پروفیسر جیومیٹری نے ایک یونانی مفکر کا حوالہ دے کر یہ بتانا چاہا تھا کہ دنیا بنانے والے نے جیومیٹری کی مدد سے ہی کائنات بنائی۔ چاند، سورج، ستارے، سیارے بھی جیومیٹری کی وجہ سے بنا لیے ہیں۔ انسان، حیوان، پرندے، درخت، پھل پھول، پہاڑ، دریا، سمندر بھی جیومیٹری کی مدد سے بنا لیے ہیں۔ پھر جواز کے لیے چند دائرے کھینچ کر انسان بنا لیے تھے۔ تکون بنا کر درخت اور پہاڑ بنا لیے تھے۔ بقول ان کے فسادات تب ہوتے ہیں جب پُر سکون جھیل کی سطح کو کاٹ کر لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں اور پھر اپنا وجود کھو کر کشتیوں کو ڈبو دیتی ہیں۔ جو کشتی بچ جائے وہ فاتح کہلاتی ہے۔ ہاں اگر جیومیٹری کا استعمال کیا جائے، یعنی کشتیاں اپنی منزل کو پانے کی خاطر متوازی لکیروں پر چل کر آگے بڑھتی رہیں تب لہریں بھی متوازی ہوں گی، ٹکرا کر فیصلہ کن نہیں بن سکتیں۔ ایک تکون ایک لکیر جوڑنے سے ایک تیر بن جاتا ہے۔ بانس کو کاٹ کر ایک لاٹھی بھی بن جاتی ہے اور ایک سُریلی بانسری بھی بن جاتی ہے۔ جیومیٹری کی مدد سے ایک بچے کا پلنا بھی بن سکتا ہے اور چتا یا قبر بھی بنائی جا سکتی ہے۔ لوہے کے ٹکڑے کو تلوار بھی بنایا جا سکتا ہے اور ایک ہل بھی بنایا جا سکتا ہے۔

پروفیسر جیومیٹری جب بھی کسی کے کارنامے سے خوش ہوتے اُس کو ایک جیومیٹری بکس دیا

کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس میں پنسل کی لکیروں کو مٹا دینے کے لیے ایک ربڑ بھی ہے۔ اگر اپنی یا کسی کی غفلت سے کوئی غلط زاویہ بن جائے تو اس کو مٹا دینا ہی بہتر ہے۔

سوچو اگر ایک خوبصورت محراب پر ایک تکونی پتھر رکھا جائے تو یوں نہیں لگے گا گویا ایک خوبصورت کمل کے پھول پر بے جان سنگِ مرمر کا ٹکڑا رکھا گیا ہو! یا ایک عقیدت مند کی تراشی ہوئی مورتی پر کالے رنگ کا جوتا رکھا جائے۔ عقیدت مندوں کی بات یا نظریات کی مخالفت کیا جیومیٹری سے جنون کی حد تک پیار کرنے والے ایسی بے ہودگیوں کو ذوقِ جمالیات کی توہین نہیں سمجھیں گے بلکہ جیومیٹری کی مدد سے کرشمات دکھانے والے اشرف المخلوق کی بے حرمتی کو برداشت کرے گا کوئی؟

سرحدوں کے تنازعوں کا بھی جیومیٹرک (Geomatric) حل یوں بتاتے رہتی تھی کہ ایک سرکاری ڈیلی گیشن (Delegation) میں عوام کو گاجر مولی، شلغم آلو کو ایسا سلسس (Isosylys) بتا کر ایک کھیت میں پرورش پا کر ایک ہی آسمان کے دائرے کے نیچے رہنے کی تجویز دے کر لہولہان ہوئے تو ایک اور یونانی مفکر کا حوالہ دے کر زہر کا پیالہ پینے کا دعویٰ کر کے سرحدوں کی لکیروں کو مٹا دینے پر اصرار کرتے رہے۔

اُن کی ایسی حرکتوں کے لیے کچھ لوگ ان کے جیومیٹری کے فلسفے کو دانشورانہ سمجھتے تھے خاص طور پر وہ لوگ جو شخصی راج کو ایک اژدہا تو مانتے تھے مگر عوامی راج کے اَن گنت سانپوں کے ڈنکوں سے نہ چین سے جی سکتے تھے اور نہ آرام سے ابدی نیند سو سکتے تھے۔ جبکہ سیاست کی شطرنج کے لیے وہ احمق ہونے کے سبب ایک معمولی پیادہ بھی نہیں تھے اس لیے نفرت کی بدبو سے اُکتا کر وہ اپنے بیٹے کے ساتھ امریکہ چلے گئے تھے۔ میں اور میرے چند ہم خیال دوست اپنے پروفیسر جیومیٹری کو ہوائی اڈے پر اس لیے الوداع کرنے گئے تھے کیونکہ ان کی باتیں غور سے سننے کے عوض انگریزی کی مفت ٹیوشن لیا کرتے تھے۔

ماضی کی تمام یادیں یوں مناظر بن کر ایک تقریباً اسّی سال کی بجھی بجھی آنکھوں کی گہرائیوں میں دیکھتا رہا۔ اچانک وہیل چیئر پر بیٹھے آدمی نے میرا نام لے کر یہ پوچھا کہ کیا میرا اسٹوڈنٹ بھی وہیل چیئر پر یہاں آیا ہے؟

گویا اُس کی نظریں ایک دل کش منظر سے ہٹ کر میری وہیل چیئر پر رُک گئی تھیں۔ میرے منہ سے گویا ڈکار کی طرح جیومیٹری نکل پڑا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں شرمندہ ہو کر نظریں جھکا دیتا ڈاکٹر قریشی مسکرا کر بول پڑے — ہاں، تمھارا پروفیسر جیومیٹری! وہ اپنے پوتے کے ساتھ لاہور

سے قاہرہ آئے تھے اور میں اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

ہمیں کشمیری میں گفتگو کرتے دیکھ کر وہ برسوں بعد کے ملاپ سے ڈر رہے تھے۔ کیونکہ دونوں افریقہ میں بطور ایشین (Asian) ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے۔ حالانکہ دونوں کا تعلق کشمیر سے تھا۔ فرق صرف جنگ بندی لائن کے آر پار کا تھا۔ اس لیے دونوں کو یہ خدشہ تھا جب ایک اسّی سال کا کشمیر کو اپنی مرضی سے چھوڑ آیا مفکر ایک ساٹھ سال کے جلاوطن کیے ہوئے وطن پرست کی گفتگو تکرار کی شکل اختیار کر کے ایک جنگ کی شکل اختیار کر کے قاہرہ شہر کو دیکھنے والے سیاحوں کے لیے ایک عالمی تماشہ نہ بن جائے! کشمیر کے موجودہ سیاسی کھیل دیکھ کر دونوں کے خدشات معنی خیز تھے مگر پروفیسر جیومیٹری اپنے طالبِ علم کو پھیروز (Pheros) کے بارے میں یوں جانکاری دے رہے تھے گویا وہ آسمان سے زمین پر رہنے والوں سے مخاطب تھے۔ پھیروز مصر کے باشندے تھے۔ آفتاب کے علاوہ اپنے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ ان کے عقیدوں کے مطابق انسانوں کی زندگی مرنے کے بعد بھی جاری رہتی ہے اس لیے وہ مُردوں کو نہ دفنایا کرتے تھے اور نہ جلایا کرتے تھے بلکہ مردوں کی تمام پسندیدہ چیزیں اُن کے ساتھ رکھ ایک ڈبے میں رکھا جایا کرتا تھا۔ ان صدیوں پرانے مُردہ جسموں کو ہم ممیز (Mummies) کہتے ہیں جسموں کی جیومیٹری وہی رہتی ہے صرف نہ وہ بول سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ نہ دیکھ سکتے ہیں۔ نہ رو سکتے ہیں اور نہ ہنس سکتے ہیں۔ یعنی زندگی کے غم اور خوشی کو محسوس کرنے کی بجائے ذات پاک دنیا بنانے والے کے روبرو رہ کر صدیاں گزار کر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ممیز!

ان پرمیڈس میں پھیروز کی ممیز میں اور یہ پرمیڈس بنانے والوں نے جیومیٹری کا صحیح استعمال کر کے دنیا کے ذی ہوش انسانوں کو اس دور میں بھی جیومیٹری کی ضرورتوں کا احساس دلایا ہے۔ اور میں اسلامک ری پبلک مصر کو دل کی عمیق گہرائیوں سے سلام کرتا ہوں کیونکہ وہ اپنے ماضی کو بھولنا نہیں چاہتے ہیں۔ آج کے اُجالوں کو گزرے زمانے کی بقول اُن کے تاریکیوں کو مٹا دینے والا سلسلہ چراغاں نہیں سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو جس شہر میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامک یونیورسٹی ہے وہاں نہ پرمیڈس ہوتے، نہ ممیز ہوتیں، نہ چرچ ہوتے اور نہ کہیں کوئی غیر مسلم نظر آتا۔

پھر اچانک ان کی آواز میں لرزش پیدا ہوئی اور وہ بھی بولتے رہے گویا کئی برسوں سے ایک برف کے تودے سے رُکا ایک چھوٹی سی ندی کا پانی، ایک چھوٹی سی جھیل کا پانی تودے کے اوپر بہہ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ افریقہ میں ایشیا کے بارے میں سوچ رہا ہوں تو ماضی میں کھینچے گئے

دائروں کو مسخ ہوتے دیکھ کر جب رو پڑتا ہوں تب میرے اپنے آنسوؤں کو اپنے ماضی پر نوحہ خوانی کو میری بڑھتی عمر کا تقاضا سمجھ کر آشوبِ چشم کا نام دیتے ہیں مگر میری کیفیت بھانپ کر وہ رُک رُک کر بولتے رہے۔ مصر کے لوگوں کو یاد ہے کہ رومنز (Romans) نے اُن پر حملہ کیا تھا۔ اپنے برصغیر کے بارے میں سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یونان کے حملہ آور سکندر کو پاکستانی عظیم سمجھ کر یاد کرتے ہیں اور ان کے اپنے ملک کے راجا پورس کو بھول گئے ہیں جس نے جہلم کے کناروں پر ایک حملہ آور کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ بھارت کے لوگ سلطان محمد غوری کا ڈٹ کا مقابلہ کرنے والے سمراٹ پرتھوری راج چوہان کو یاد کرتے ہیں مگر انگریزوں سے مقابلہ کرنے والی جھانسی کی رانی کے مسلمان سپہ سالار کا نام بھی نہیں جانتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی جیومیٹری ایک جیسی تھی۔

مجھ سے ایک کشمیری ہونے کے ناطے ایک انٹرویو میں پوچھا گیا کہ حضرت امیر خسرو جو ایران سے آٹھ صدی پہلے ہندوستان کی روحانی جیومیٹری میں سکون کی تلاش میں آئے تھے، ان کا پاکستان کے بارے میں کیا تصور تھا۔ پروفیسر جیومیٹری اس بارے میں شاید کچھ دل کھول کر باتیں کرتے مگران کے پوتے نے رب جانے، حقیقتاً یا مصلحتاً کسی اہم کام کا حوالہ دے کر ان کو اپنی کار کی طرف لے جانا چاہا۔ کیونکہ ہم دونوں وہیل چیئرس پر بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کے قریب آ کر ایک دوسرے کی وہیل چیئرس پر ہاتھ رکھ کر ایک ہی سمت میں چلتے رہے اس لیے میں نے اپنی جنم بھومی کشمیر کے بارے میں پوچھا تو وہ ایک آہ بھر کر بولے کشمیر ہی کی نہیں بلکہ برصغیر میں جیومیٹری بکس فرقہ پرست طاقتوں نے امن پسند لوگوں سے چھین کر مذہب کو مرکز مان کر اپنی ہوس پرستی کی دوری پر ایک تنگ دائرہ کھینچ کر عوام کو یرغمال بنا دیا ہے۔ ربڑ سے دائرے کو مٹایا جا سکتا تھا مگر شاطر عوام دشمن نے وہ بھی اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ اب ایک ہی اُمید ہے۔ وہ یہ کہ دائرے میں قید عوام ہی گھٹن محسوس کر کے دائرے کے اندر دائرے بنا کر گرداب کو ان دائروں میں تبدیل کر دیں جو ایک کنکر پھینک دینے سے جھیل کی سطح پر پیدا ہو کر ایک دوسرے کے نیچے آ کر کنارے تک پہنچ جاتے ہیں۔ میرا بیٹا اور ان کا پوتا دونوں رُک کر ایک دوسرے کو سوالیہ مگر پیار سے دیکھتے رہے۔

غالباً دائروں کے بارے میں سوچتے رہے!!

OO

ریت

ریت کا رنگ ایک جیسا نہ سہی مگر خاصیت ایک جیسی ہے۔ یعنی مٹی کی طرح ریت پانی کے ساتھ مل کر بھی پانی سے الگ ہو جاتی ہے یا کی جاتی ہے۔ صحراؤں میں چاروں طرف پھیلی ریت میں لہروں جیسی تصویریں یا نقوش اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر پانی کی دو بوندوں کے لیے ترس رہے مسافروں کو حلق کو تر کرنے کے لیے کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ ایک ایسے گاؤں کی کہانی ہے جو صدیوں پہلے سمندر کے کنارے ایک مچھیروں کا گاؤں ہوا کرتا تھا۔ ایک راکھشس کو گاؤں کی خوش حالی راس نہ آئی اس لیے اس نے سمندر کا پانی چوس کر سمندر کو ایک ریگستان میں بدل دیا اور تب سے اب تک منہ کھولے پانی کی ہر بوند چوس کر پیاسوں کو کربلا کی یاد دلاتا ہے۔

ایک رشی بابا لوگوں کے دُکھ درد دیکھ کر کپل وستو کے راجکمار سدھارتھ کی طرح موکش حاصل کرنے کی خاطر اس گاؤں میں آیا تھا اور سمادھی لینے سے پہلے ایک چھوٹا سا تالاب بنا کر بارش کا پانی جمع کر کے اپنی تشنگی کو لٹاتا رہا۔ لوگ جو دُور دُور سے پانی خرید کر اپنا کام کاج چلاتے تھے رشی بابا کی دیکھی دیکھی میں بہت سارے تالاب بنا کر سال بھر کے لیے پانی جمع کیا کرتے تھے۔

لیکن تین سال کی خشک سالی کی وجہ سے خوشبودار پانی کی گہری تہیں سوکھ کر تالابوں کی بدبودار تہیں بن گئیں تب وہ گاؤں کو چھوڑ کر جانے کے ارادوں پر عمل کرتے رہے! ایک دن رشی بابا کو خیال آیا کہ راکھشس کے منہ سے پانی نکالنے کی خاطر کنواں کھودا جائے! یعنی اعتقاد کے بل بوتے پر اعتماد حاصل کر کے تدبیر سے اپنی بگڑی تقدیر بنائی جائے۔ یہ بات رشی بابا نے اپنے موکش کے ارادے کو ترک کر کے گاؤں والوں کو بتا دی۔ لوگوں کو بابا کی باتوں میں تاثیرِ مسیحائی نظر آئی تو وہ تپتی دُھوپ میں ریت کو کھرچتے نظر آئے۔ ریت کو کُرید کُرید کر گہرائیوں میں لے جانے کی خاطر بزرگ لکڑی کی پٹیوں کا استعمال کر کے کنویں کو خاصی گہرائی تک لے گئے جس کو دیکھ کر بابا نے موکش کا ارادہ ترک کر کے خدمتِ خلق کو ترجیح دے کر لوگوں کو کنواں کھودنے کے لیے تیار کر لیا۔

رات میں کھدائی مشکل ہوتے ہوئے بھی لوگ حیات کے لیے آب تلاش کرنے کی خاطر تپتی ریت کو اپنے ناخنوں سے کھرچتے رہے جبکہ رشی بابا نظریں اٹھا کر ملتجی نظروں سے دُعا طب پر بیٹھے رب سے بارش مانگتا رہا اور ملتجی نظروں سے بادلوں کو دیکھنے کی سعی کرتا رہا۔ اور مایوس ہو کر آہیں بھرتا رہا۔

دن گزرتے رہے اور ایک دن گرج کی ڈراونی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اور پھر آسمان پر چھائے کالے بادل دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بارش ہو جائے تو تین سال سے چلی آ رہی خشک سالی ختم ہو کر کم از کم لوگوں کو پینے کا پانی تو مہیا کرے گی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر بارش سے گہرا کنواں ریت سے بھر بھی جائے گا ان کے گاؤں کے تالاب تو بھر جائیں گے۔ ہاں مگر لوگوں کی کڑی محنت رایگاں ہو جائے گی! بادل بن برسے آگے نکل گئے تو گاؤں کے واحد سبکدوش فوجی نے معنی خیز نظروں سے رشی بابا کو دیکھ کر کہا ”یہ کالے بادل نہیں تھے، دُھواں تھا! پڑوس کے علاقے میں بم گرایا گیا اور یہ دُھواں تباہی کی اطلاع دے گیا ہے!“ فوجی کی آواز میں تڑپ تھی! رشی بابا کے دل سے ایک ہوک اُٹھی مگر نظریں جھکا کر جب اُس نے گہرے کنویں میں جھانک کر دیکھا اور کھدائی کرنے والوں کی خوشی کا اندازہ لگا کر ان کی خوشی کا سبب جاننے کے لیے آوازیں دیں تو گاؤں کا سرپنچ رشی بابا کو ان کی تاثیر مسیحائی پر یقین دلانے کے لیے ایک بندر کی طرح ریت کو گرنے سے بچانے کی خاطر رکھے گئے لکڑی کی پھٹیوں پر چل کر رشی بابا سے ملنے آیا۔ اُس کی ایک مٹھی میں ریت تھی جو مٹھی سے اس لیے نہیں نکل گئی تھی کیونکہ اُس میں نمی تھی۔

رشی بابا خوشی سے اُچھل پڑے کیونکہ بقول ان کے یہ اعتقاد اور اعتماد کی جیت ہے، مگر جب اس نے ریت کو سونگھا تو گاؤں والوں کی تقدیر پر خوشی سے تانڈو کا رقص کرنے لگا۔ ”ارے تمھارے گاؤں میں تیل ہے! یہ بیچ کر پانی تو کیا آبِ حیات بھی لایا جاسکتا ہے۔ اناج، پھل، سبزیاں، کپڑے، زندگی کی تمام ضروریات خریدی جاسکتی ہیں۔ گاؤں میں سکھ ہی سکھ ہوگا! لوگوں کے دُکھ درد دیکھ کر میں موکش حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب دُکھ ہی نہیں تو میں سنیاس کیوں لوں۔ عیش و عشرت کی زندگی میں رب کا نام لینا تو راجے مہاراجے کا کام بھی ہوا کرتا تھا“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا اپاہج فوجی نے گہرے کنویں میں کام کرنے والے گاؤں والوں کو فوراً باہر آ کر کنویں کو فوراً بند کرنے کی وارننگ دی۔ رشی بابا نے فوجی کو روکا ٹوکا تو فوجی کی بیساکھیاں لرزنے لگیں اور وہ رو پڑا۔ پھر سسک سسک کر بول پڑا۔

”رشی بابا! یہ جان کر کہ ہمارے گاؤں کے اِرد گرد دُور دُور تک پھیلے ریگستان کی تہوں کے

نیچے تیل ہے تو پڑوسیوں کی طرح ہمارے گاؤں پر بھی بم گرائے جائیں گے! ایک ڈراونی گرج سنائی دے گی۔ کالے بادل اگلے گاؤں میں دکھائی دیں گے! ایک اور تواریخ کا ورق لکھا جائے گا اور ریت گواہی دے گی، قتلِ عام کی! یہ ریت کا وہ رنگ ہے جو وہی دیکھ سکتا ہے جو جنگ میں میری طرح زندہ تو رہتا ہے مگر میری طرح اپاہج بن کر۔ محتاج بن کر! ایک غلام بن کر!"

رشی بابا اور سرپنچ فوجی کو دیکھنے کی بجائے ریت کو دیکھتے رہے!

OO

زمین

ریاض زلزلے سے ہوئی تباہی کی ضمنی رپورٹ سرکار کو بھیج چکا ہے مگر پھر بھی وہ خود تباہی سے متاثر علاقے کا جائزہ لینے آیا اور یہ بھول کر کہ ندی پار کرنا سرحد کو پار کرنا ہے، وہ ندی کے دونوں کناروں پر واقع اُن گاؤں کا جائزہ لیتا رہا جو یا تو زمین میں دب گئے تھے یا کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ آس پاس نہ کوئی انسان نظر آرہا تھا اور نہ کوئی چرند یا پرند! سحر کی کرنوں سے زمین پر گھاس کے چند ٹکڑوں پر شبنم کے قطرے پکھراج کے مانند چمک رہے تھے، مگر یوں لگ رہا تھا جیسے ایک مُردے کو سجا کر زندگی کی شکل دی گئی تھی۔

ندی کا پانی بہہ تو رہا تھا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے ندی اپنے دونوں کناروں پر رہنے والے لوگوں کے المناک انجام پر نوحہ خوانی کر رہی ہے، جبکہ زمین خاموش تماشائی بن کر آسمان کو دیکھ رہی ہے، اس بار ایک ماں کی کوکھ پر آسمان سے کوئی ایٹم بم نہیں پڑا تھا بلکہ زمین کے اندر اُبل رہے آگ کے دریا نے گلستاں کو بیاباں بنا ڈالا تھا۔

زلزلے سے مرنے والوں، زخمی لوگوں اور ملبے سے نکالے گئے افراد کی بحالیات کے گوشوارے سرکار کو بھیجے جا چکے تھے اور ریاض بحثیت امدادی ٹیم کے سربراہ خود بھی یہ جان گیا تھا کہ علاقے میں کوئی بھی زندہ انسان ملبے کے نیچے پھنسا ہوا اور فوری توجہ یا مدد کا طلب گار نہیں ہے مگر ایک الہام نے اُس کو اُس جگہ پہنچا دیا تھا جہاں ایک جوان عورت ایک پُرانے ٹرنک سے لپٹ کر مدد کے لیے آوازیں دے رہی تھی مگر ندی کے بہاؤ کے شور میں اُس کی فریاد بے صدا ہو کر رہ گئی تھی۔

ریاض نے اُس کے بازوؤں سے بہہ رہے تازہ خون کو دیکھ کر خود اُس کی موجودگی محسوس کی تھی۔ کسی شیطان نے اُس کو کھینچ کر باہر نکالنے کے بجائے اُس کے کنگن اُتارنے کی خاطر اُس کو لہو لہان کر دیا تھا۔ ریاض نے خود خطرہ مول لے کر جب عورت کو نکالنا چاہا تھا تب وہ عورت ٹرنک کو پہلے نکالنے کی ضد کرتی رہی اور پوچھ تاچھ کے بجائے اُس کی باتیں غور سے سن لینے کے لیے اصرار

کررہی تھی۔ ریاض نے کہیں یہ پڑھ لیا تھا کہ منوہری کو اپنے محبوب سے جدا کیا گیا تھا تو موہن جوداڑو اور ہڑپہ شہر کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس لیے اُس نے سوچا کہ شاید اِس عورت کے پیار کے دشمنوں کی کالی کرتوتوں اور شیطانوں کی چال بازیوں کی وجہ سے محبت کے خوشبودار چمن کو نفرت کی آگ سے جھلسنے کی سزا قدرت نے زلزلے کی شکل میں دی ہوگی، قیامت کی جھلک دکھانے کی خاطر! مگر قدرت کا یہ فیصلہ امن پرست لوگوں کے خلاف کیوں؟ اگر زلزلے سے دہشت گردوں کے تربیتی اڈّے مسمار کرنے تھے تو عبادت گاہیں اور لوگوں کے مسکن کیوں؟ شاید شہدا اور غداروں کے چہروں کو عیاں کرنے کی خاطر!

اچانک عورت یوں بول پڑی جیسے برف پگھل رہی ہو اور پانی کے قطرے پھر منجمد ہو کر رُک جاتے ہوں اور عورت کی لرزرہی آواز نے ریاض کے خیالات کا تسلسل توڑ کر اُس کو عورت کی باتیں سن لینے کے لیے مجبور کردیا۔ وہ بولتی رہی اور ریاض اُس کے ہر لفظ کو بغور سن لینے کی خاطر خود خطروں سے کھیل کر اُس کے قریب رہنے کے لیے گرتی ہوئی دیوار کا سہارا لینے گیا۔ حالانکہ اُس کے ساتھ آئے ہوئے افسران نے اُس کو روکنے کی بہت کوشش کی تھی، کسی واقف کار نے ریاض کو کھل کر یہ بتا دیا تھا کہ وہ سرحد پار کر کے آئے ہیں اور افشا ہونے پر وہ مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ عورت گاؤں کے ایک بارسوخ لیڈر کی بہو ہے۔ کسی نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ شاید ٹرنک میں بم رکھا گیا ہو۔ عورت خود ہی ایک انسانی بم (Human Bomb) ہو، یہ اندیشہ بھی کسی نے اپنی قابلیت اور تجربہ کاری کا حوالہ دے کر ظاہر کیا مگر ریاض اپنے الہام کا دھاگہ مضبوطی سے پکڑ کر یا اپنی فرض شناسی کو ثابت کرنے کی خاطر اپنا کام لگن سے کرتا رہا۔

ریاض ریاست کا ایک قابل افسرِ اعلا ہے، وہ دل میں تصویر اُتار کر دماغ سے دیکھتا ہے، پھر سوچ کے دائرے کو دُور دُور تک پھیلا کر مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ عام کشمیریوں کی طرح مذہب پرست ہے لیکن فرقہ پرست نہیں ہے۔ وہ اُن میں سے تھا جو لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے اقتصادی انقلاب کے حامی ہیں اور جن کی نظریں ایل او سی (LOC) پر جمی رہنے کی بجائے سات سمندر پار تک جاتی ہیں اور چاہتے ہیں کہ جیسے جاپانی الیکٹرانکس (Electronics) دنیا پر حاوی ہیں ویسے ہی کشمیری اپنی ہنرمندی کی چھاپ دنیا کے مارکیٹ میں چھوڑ دیں۔ جس قدرت نے وسطی ایشیا کو تیل کے ذخیرے عطا کیے ہیں اُسی قدرت نے وادیٔ کشمیر کو خوبصورتی اور پانی کی بہتات سے نوازا ہے اس لیے نوجوانوں کو گمراہ ہونے سے بچ کر سیاحت کو فروغ دینے کے لیے

کام کرنا چاہیے۔

ریاض اپنے اس نرالے کام کرنے کے طریقے کی وجہ سے اکثر سیاست کے شکار ہو کر ایسے کام میں مصروف رکھا جاتا ہے جہاں وہ اکثر ہٹ لسٹ پر آ جایا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کو جب موسم کی خرابی کی وجہ سے ایک علاقے میں متاثرین کو معاوضہ دینے کے لیے بھیجا گیا تھا تب انھوں نے خراب فصل سرکار کو سپرد کرنے کے لیے کہا تا کہ اس سے مرغیوں کے لیے چارہ بنایا جا سکے۔ لوگوں کا جھوٹ پکڑا گیا تو ان کو وہاں سے ہٹا کر زلزلے سے متاثر ہوئے لوگوں کو امداد دینے و بحال کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور یوں وہ ایک کشمیری بولنے والی عورت (بلکہ لڑکی کہا جائے تو مناسب ہوگا، کیونکہ زبیدہ مشکل سے سولہ سترہ سال کی ہے) خدا نے اُس کو ایک حور بنایا ہے اور وہ ایک ندی کے کنارے پر واقع اپنے کھیتوں میں مست ہو کر ناچا گایا کرتی تھی، ندی کے پار کھیت تھے جو پاس ہو کر بھی ایک دوسرے سے بہت دُور تھے۔ یعنی ایک ہی ندی کے دو کنارے، دو مختلف ملک ہیں۔ زبیدہ جب بھی دوسرے کنارے کے کھیتوں میں ایک خوبصورت نوجوان کو گھوڑے پر آتے جاتے دیکھا کرتی تھی تو وہ اپنے آپ کو حبہ خاتون اور نوجوان کو سلطان یوسف شاہ چک سمجھتے سمجھتے سرحد پار کر کے اُس کے ساتھ نکاح کر گئی۔

زبیدہ بیوی تو بن گئی مگر بہو بن جانے میں دُشواریاں کانٹوں کی طرح ہر راستے پر بچھائی جاتی تھیں۔ سسرال والوں کا رہن سہن بلکہ سوچ سمجھ بھی الگ تھی۔ دراصل یہ علاقہ مہاراجا نے فتح کر کے اپنی ریاست سے ملا دیا تھا۔ زبیدہ کا باپ اکثر جان ہتھیلی پر رکھ کر بیٹی سے ملنے آیا کرتا تھا اور ہر بار وہ اُس کو اس پر کی گئی اذیتوں کا ذکر کرنے کی بجائے اپنے باپ سے کہا کرتی تھی کہ میرے سسرال والے مجھ سے تمھاری سب سے قیمتی چیز جہیز میں مانگ رہے ہیں۔

آخر ایک دن بے بس باپ ملٹری سے نظریں بچا کر یعنی سر پر کفن باندھ کر ایک ٹرنک بیٹی کو دے آیا تھا مگر جب سسرال والوں نے ٹرنک کھول کر دیکھا تھا تب زاہدہ کو ٹرنک واپس کر کے زمین کے کاغذات لانے کا حکم دیا گیا۔

زبیدہ ٹرنک اٹھا تو نہیں سکتی تھی اس لیے وہ ٹرنک کو گھسیٹ کر اُس پن چکی تک لے تو آئی تھی مگر اس رات پن چکی کی بوسیدہ چھت اُس پر گر پڑی تھی اور تین دن اور چار راتوں سے وہاں کسی ایسے آدمی کے انتظار میں تھی جو ٹرنک اس کے باپ تک پہنچا دے اور زمین کے کاغذ اس کو لا کر دے۔ اپنی التجا پوری کرتے ہی وہ ٹرنک سے لپٹ گئی اور سسکتے سسکتے خاموش ہو گئی۔

ریاض نے زبیدہ اور ٹرنک کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے نکالا۔ گھبراہٹ میں ٹرنک گر گیا تو اس کے اندر رکھی چیزیں باہر آ کر زمین پر بکھر گئیں۔ اُن میں زمین کے کاغذات تو نہیں تھے مگر بہت ساری کتابیں تھیں۔ دینی کتابیں، تواریخی کتابیں، ثقافتی کتابیں اور کشمیری نغمات کی کتابیں!

'گویا ان کو ندی کے پار ہماری زمین چاہیے تھی ایک کشمیری بہو نہیں؟' ریاض بڑبڑاتے ہوئے جب زبیدہ کے پاس گیا تب وہ ابدی نیند سو چکی تھی۔ جبکہ ندی کے آر پار زمین آسمان کو خاموش تماشائی کی طرح دیکھ کر سوچ رہی ہے کہ اچھا ہے آسمان ایک ہے۔ زمین کی طرح کہیں ہندوستان اور پاکستان نظر نہیں آ رہا ہے۔

آسمان میں بادل ہیں جو اپنی مرضی سے تیر رہے ہیں جو بارش یا برف بن کر زمین پر گرتے ہیں مگر زمین سے اُٹھ رہا دُھواں نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے؟ تم تک پہنچ جاتا تو جان پاتے گھٹن کیسی ہوتی ہے!

ریاض کی آنکھیں جو روز عبادت کے لیے اُٹھتی رہتی ہیں آج سورج کو دیکھ رہی ہیں اور وہ بڑبڑا رہا ہے کہ جب زمین سورج سے الگ ہو گئی تھی تب سورج نے زمین کے اندر ایک آگ کا دریا کیوں رکھ دیا تھا؟ نہ ہوتا تو اُبل رہی آگ سے زلزلے نہ آتے۔ زمین پر قہرِ آدم تو رُک نہیں سکتا۔ قہرِ آدم کی شکار ہوئی ہے یا قہرِ خدا کی شکار ہوئی ہے؟ بے چاری زمین تو دونوں کی شکار ہو رہی ہے! زمین پر ترس نہیں کھا سکتے تو پھر جوڑ دے زمین کو سورج کے ساتھ!

OO

کارواں بکھر گیا

کارواں بکھر گیا اور میں اپنوں سے بچھڑ گیا! اُمید ہم سفر بن گئی اور ایک اذیت ناک سفر کاٹ کر برگد کے اُس پیڑ کے قریب پہنچ تو گیا مگر یا تو منظر بدل گیا تھا، نہیں تو سفر کے دوران دُھول اور دُھویں سے میری نظر کمزور ہو گئی تھی! شک، اس وجہ سے میرے ذہنی انتشار میں خطرناک لہریں پیدا کرتا رہا کیونکہ اگر یہ وہی مقام ہے جہاں مجھے میری دادی بچپن میں اپنے ساتھ صدیوں پرانے درخت کے درشن کرنے لایا کرتی تھی تو دادی کے بھائی کا وہ خوبصورت گاؤں کیوں نظر نہیں آ رہا ہے؟ سوچا شاید شام کروٹ لے رہی ہے اس لیے رات بھر ایک بیاباں میں تنہا تنہا ہوں۔ میں اپنی ہر کروٹ کے ساتھ وسوسوں، اندیشوں، مایوسیوں کے بھاری بوجھ اپنے سینے پر اُٹھا کر سو نہیں پایا! چاندنی رات اور بھی ڈراؤنی ثابت ہوئی کیونکہ یوں لگا جیسے بہار کے موسم میں بھی درخت کی لمبی لمبی شاخوں پر برف کی تازہ تازہ تہیں نظر آ رہی تھیں! کہیں یہ درخت ایک فریب تو نہیں ہے؟ مجھے گمراہ کرنے کے لیے؟ یا میرے خدشات کا عکس بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ میں نے اپنے کارواں کو بکھرتے بکھرتے ایسے مناظر دیکھ لیے ہیں جن کو یاد کرتے ہی میری آتما کانپ جاتی ہے! سوچ سمجھ کر بار بار یہی خیال آتا رہا کہ مجھے سحر کا انتظار کرنا چاہیے تاکہ یہ جان پاؤں کہ کیا یہ وہی برگد کا پیڑ ہے جس کے نیچے کپل وستو کے راج کمار سدھارتھ نے تپسّیا کر کے مہاتما گوتم بدھ بن کر دُنیا کو امن اور شانتی کا پیغام دیا تھا تو میں بھی تپسّیا کر کے اپنے بکھرے کارواں کو ایک راستہ دکھا سکوں جہاں ہم نفس، ہم نوا، ہم خیال، ہم سفر بن کر اتنی بڑی دنیا میں زمین کا وہ ٹکڑا ڈھونڈا جا سکے جہاں ہندو اور مسلمان، انسان بن کر رہ سکیں۔ دنیا بنانے والے کی پرستش کریں، عبادت کریں!

دادی کہا کرتی تھیں کہ برگد کا پیڑ ایک چمتکاری درخت ہے جو صدیوں سے زمین کی نچلی تہوں سے چوس کر ہر موسم میں شاداب نظر آتا ہے۔ اس کی ٹہنیوں پر کونپلیں زندگی کا بچپن ہوتا ہے۔ سرسبز پتے جوانی اور زرد پتے بوڑھاپا ہے۔ پھر جب یہ پتے شاخوں سے الگ ہو جاتے ہیں

تب جنم سے موت کی کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ پندرہ سال کی عمر تک دادی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آیا کرتی تھیں لیکن ایک دن برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ایک ناگا بابا نے خوش ہو کر اپنے سامنے جل رہی متبرک آگ (Bonfire) سے نکالی گئی راکھ کا تلک لگا کر یہ بتا دیا کہ برگد کی جڑوں میں دنیا بنانے والے بھگوان برہما براجمان ہیں، اس کے تنے میں بھگوان وِشنو رہتے ہیں جبکہ درخت کی شاخوں میں بھگوان شنکر رہتے ہیں۔ یہ لٹک رہی شاخیں جو ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر رقص کرتی رہتی ہیں جبکہ پتے جل ترنگ بجاتے ہیں!

مجھے تب برگد کا درخت ایک خدائی کرشمے کی بجائے ایک قدرتی عجوبہ نظر آیا تھا وہ بھی اس لیے کہ لمبی لمبی شاخیں خود ہی زمین میں جڑیں پکڑ کر اپنے بے شمار سہارے بنا لیتی ہیں۔ یہ دیکھ کر ایک اور بات ذہن میں آتے ہی سامنے نظر آئی۔ ایسا لگا جیسے مہابھارت کے میدانِ جنگ میں کوروؤں کا ساتھ دینے والے بھیشم پتاما تیروں پر لیٹے ہوئے اُس کو آوازیں دے کر اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ غالباً مجھے یہ بتا دینے کے لیے کہ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ لڑو یا مرو مگر اپنے کارواں کو اکٹھا کر کے اکھڑے اُجڑے لوگوں کو پھر سے بسا لو ورنہ یہ دنیا ایک سیارہ بن کر رہ جائے گی۔ چاند یا جیوپیٹر (Jupitor) کی طرح۔ سوچا کاش کوئی اوتار یا پیغمبر اس وقت راہنما بن جاتا جس کی پرستش یا عبارت کر کے یہ جان پاتا کہ میں صحیح راستے پر چل رہا ہوں یا نہیں!

پر اچانک پچاس برس پہلے کہی رِشی کی باتیں یاد آتی رہیں۔ یہ بھی یاد آیا کہ میں نے رِشی سے پوچھا تھا کہ کیا یہ چمتکاری درخت مجھے میرے ہونے والے امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات بتا سکے گا، تب رِشی نے قہقہہ لگا کر یہ کہا تھا کہ جو بیت چکا ہے وہ بتا سکتا ہے۔ منوہری کو اپنے عاشق سے جدا کر کے منجو دھارا شہر کھنڈر بن گیا، یہ بتا سکے گا۔ ہٹلر نے کتنے یہودیوں کو قتل کر دیا تھا، یہ بتا سکتا ہے۔ عراق میں کیا ہوا، یہ بتا سکتا ہے۔ ہاں جو ہونے والا ہے وہ درخت کی حفاظت کرنے والا یہ ناگ بتا سکتا ہے۔ پوچھ لو، مگر قریب جا کر۔ تب میں برہما کی طرح تین سروں والا سانپ دیکھ کر چیخ پڑا تھا۔ اُسی چیخ کی گونج سن کر جب میں نے پلٹ کر دیکھا تھا تو روپہلی روشنی میں مجھے یوں لگا تھا جیسے حضرت موسیٰ کوہِ طور پر خدا سے باتیں کرنے آ رہا ہے۔ میری پھولتی ہوئی سانسیں دھیمی رفتار سے چلتی رہیں اور سحر کا انتظار کرنے کے لیے مجھے حوصلہ دیتی رہیں۔ مگر جس سحر کا میں انتظار کرتا رہا یہ وہ سحر تو نہیں تھی۔

برگد کا پیڑ اپنی ہی جگہ کھڑا تھا مگر بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ شاخیں تھیں مگر کسی بھی ٹہنی پر نہ کونپلیں

تھیں، نہ سر سبز پتے تھے اور نہ زرد پتے تھے! درخت یوں نظر آ رہا تھا جیسے تار تار ہوئے کفن پہنے ایک لاش جو نہ چتا پر لیٹ جانے کے لیے تیار تھی اور نہ لحد میں ابدی نیند سونے کے قابل تھی۔

میں نے جب قریب سے درخت کو دیکھنے کے لیے ایک قدم بڑھایا تب ایک لڑکے نے ایک سانپ کی طرح میری ٹانگوں میں کنڈلی ڈال ڈال کر اشاروں سے مجھے درخت کے پاس جانے سے روک دیا۔ یہ تقریباً پندرہ سال کا گوالا اپنے جانوروں کو کسی ایسی جگہ لے جانا چاہتا تھا جہاں سر سبز گھاس ہو! مگر اس کوشش میں اس نے چند پُر اسرار لوگوں کو برگد کے محافظ سانپ کو بھگتی کی آڑ میں اپنے بس میں کر کے درخت کی جڑوں میں کچھ ڈالتے ہوئے دیکھا تھا کیونکہ گوالا اپنی بھیڑ بکریوں کی وجہ سے اپنی موجودگی کو چھپا نہیں پایا تھا اس لیے ان اجنبی لوگوں کے تعاقب کا شکار بن کر اپنے جانوروں سے بچھڑ گیا تھا اور اب اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دراصل جس کو میں حضرت موسیٰ سمجھ بیٹھا تھا وہ یہی گوالا تھا۔

دراصل ہم دونوں کی داستانیں ایک جیسی ہیں ورنہ میرا پاگل منوا اس کو بھگوان کرشن سمجھ کر برگد کے پیڑ کا کرشمہ دیکھنے کی بجائے لڑکے کو سارتھی بنا کر اُن اجنبی لوگوں کا پیچھا کرتا جنھوں نے میرے کارواں میں گھس کر جانے کس سے کیا سرگوشیوں میں کہا کہ کارواں منتشر ہو کر پہلے ہجوم کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر بھگدڑ میں ماں اپنے ہی بچوں کو روند کر اپنوں کا ہاتھ چھوڑ کر اجنبی رہبروں کے ہاتھوں کے اشاروں پر انجانے راستوں پر چل کر ہر قدم ایک دوسرے سے دُور ہوتے ہوئے میری آنکھوں سے اوجھل ہوتی رہی!

گویا دادی کا کرشماتی برگد کا پیڑ ہی اُمید کا آخری سہارا بن کر میرے سامنے کھڑا تھا اور میں نے گوالے کو مشکلاً اس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کر دی اور یہ بھول کر کہ آج کے دور کا پندرہ سال کا لڑکا اگر جنگ کرنے کے لیے خود کش بم اپنے کمر سے باندھ سکتا ہے تو وہ بچاؤ کے لیے پینسٹھ (۶۵) سال کے ایک بوڑھے کو ایک نیا راستہ بھی دکھا سکتا ہے، میں درخت کے سامنے تپسیا کرنے کے ارادے سے بیٹھنے ہی والا تھا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور میں ایک گہرے کنویں کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

برگد کی جڑیں سوکھ چکی تھیں اور مجھے بھگوان برہما کہیں نظر نہیں آیا بلکہ یہ جان پایا کہ برگد کا بے جان پیڑ کنویں کی مضبوط دیواروں سے بنی ہوئی ایک آہنی بنیاد پر کھڑا تھا۔ یہ جان کر گوالے کی وہ باتیں یاد آئیں جو اس نے میرے جسم سے الگ ہو کر چیخ چیخ کر یوں کہی تھیں جیسے آسمان میں

خاموشی سے تیر رہے کالے بادل اچانک گرج کر پھٹنے کی اطلاع دے رہے ہوں!

گوالے نے یہ بھی کہا تھا کہ برگد کے پیڑ میں بیٹھے ہوئے تینوں ایشور برہما، وِشنو اور مہیش دھرتی کو چھوڑ کر اپنے تعمیرات کے ماہر وِشوا کرما کے ساتھ کسی نئے سیارے پر ایک نئی دنیا بسانے کے لیے کہیں صلاح مشورے کر رہے ہوں گے۔ اُس کی بات شاید اُس کے ایک نئے اوتار ہونے کا دعویٰ یا اطلاع ہو! اُس نے مجھے روکا تو میں رُک جاتا تو اچھا تھا۔ کنویں میں اتنی تپش ہے کہ مجھے لگ رہا ہے کہ میں موم کی طرح پگھلتا جا رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کنویں کی نچلی تہہ پر ایک آگ کا دریا بہہ رہا ہے؟

اگر آگ ہوتی تو انگاروں اور آنچ کی لالی تو نظر آ جاتی؟ کہیں کنویں میں کوئی جان لیوا پاؤڈر یا کوئی کیمیائی راکھ تو نہیں ہے؟ یہ کنواں آر ڈی ایکس (RDX) کا ذخیرہ تو نہیں ہے؟ گویا میں مر جاؤں گا تو مٹی مٹی کے ساتھ نہیں مل پائے گی؟ ہیروشما کی طرح میرا جسم بھی کیمیائی راکھ بن جائے گا؟ میرا جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، مگر آسمان پر بیٹھے فرشتو! زمین پر اُتر کر اُس گوالے کو بچا لو۔ وہی شیطانوں اور راکھشسوں کی شناخت کر سکے گا۔ اور اگر اُن کی شناخت ہو گئی تو شاید میرا بکھرا کارواں پھر ایک ہو کر، ایک ہی راستے پر، ایک ہی منزل کی تلاش کر لیں گے!

اور اگر ایسا ہو گا تو کتنا اچھا ہو گا!

اُف! مگر میں تو اپنے کارواں سے بچھڑ گیا ہوں۔ کیونکہ میرا کارواں بکھر گیا نا؟

○○

یاد آرہی ہے

جس طیارے میں پندرہ سال بعد اپنے وطن جارہا ہوں، بادلوں کے اوپر اُڑ رہا ہے مگر میں ذہنی طور پر زمین پر بچھی ہوئی برف کی چادر پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑتا ہوا، دوڑتا ہوا، اپنی بیتی یادوں کا تعاقب کررہا ہوں۔ یاد آرہی ہے مجھے وہ اُجلی صبح جو میں نے تب دیکھی تھی جب میں آٹھ برس کا تھا۔ رات بھر میں اپنے ابا کے ساتھ چپک کر سویا تھا اور چونکہ سردیوں کی شدّت کی وجہ سے مجھے کمرے سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی اور بوقتِ ضرورت اگر جانا بھی پڑجاتا تھا تو مجھے گھر کا کوئی ذمہ دار فرد شال میں یا کمبل میں یوں لپیٹ لے جایا کرتا تھا جیسے آج کل کسی نازک شے کو کوریئر سے بھیجنے کے لیے پیک کیا جاتا ہے۔ اُس صبح جب میں جاگ کر رات کو ہوئی زبردست برف باری کے بارے میں جان گیا تھا تب زمین پر بچھی ہوئی برف کی چادر دیکھنے کو دل مچل اُٹھا تھا۔

کشمیر میں اس وقت عام گھروں کی کھڑکیوں میں لکڑی کے بنائے ہوئے خوبصورت پنجروں کا استعمال ہوا کرتا تھا۔ گرمیوں میں پنجروں کے خوبصورت سوراخوں سے ٹھنڈی ہوائیں آیا کرتی تھیں جبکہ سردیوں میں کھڑکیوں پر کاغذ چپکا دیا جایا کرتا تھا تاکہ سرد ہوائیں کمرے کے اندر نہ آسکیں۔ کاغذ جو عام طور پر اخبار کے صفحات ہوا کرتے تھے یا فلموں کے بڑے بڑے پوسٹر۔ کبھی کبھی ردّی کاغذ کے اوراق، جو بذاتِ خود ایک کولاج کے مانند نظر آیا کرتے۔ ایسا میرے ابا کہا کرتے تھے کیونکہ وہ ایک اسکول ماسٹر ہونے کے علاوہ ایک مصوّر بھی تھے! کمروں میں دن میں مدھم روشنی کے لیے کاغذ میں تیل لگایا جاتا تھا تاکہ ایک بار بند کی ہوئی کھڑکی کو کھول دینے کی ضرورت کو کم کردیا جائے۔ لیکن اُس روز میری بیتابی جب صبر کی حدود پار کرتی گئی تو میں نے انگلی سے کاغذ میں چھید کرکے ایک سحر انگیز روشنی میں ایک ایسا دلکش منظر دیکھا تھا جو آج بھی میری یادداشت کی البم (Album) میں محفوظ ہے، میوزیم میں رکھے صدیوں پرانے سکّے کی طرح۔

برف باری بند ہو چکی تھی اور برف کی چادر پر کتوں کے چند پنجوں کے یا چند قدموں کے نشانات دیکھ کر میرا دل برف کی چادر پر اپنے قدموں کے نشانات چھوڑ کر ایک لمبا سفر طے کرنے کے لیے مچل اٹھا تھا۔ کیونکہ چند روز پہلے کیچڑ بھرے کوچے میں چلتے چلتے اپنے پھٹے جوتے سے اُٹھ رہی چھینٹوں نے میرے فرن (کشمیری پیرہن) کے پچھلے حصے پر ایسے نشان چھوڑ دیے تھے کہ والدین کی مرضی کے خلاف بازار جانے کا میرا کارنامہ میرے لیے ایک زبردست پٹائی یعنی سزا کے لیے ایک ثبوت بن چکا تھا اس لیے میں یہ کارنامہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرے پاؤں کے نشانات کسی اور کے بھی ہو سکتے تھے مگر میری زندگی کا اوّلین مشن کمرے میں اندر آ رہی سرد ہواؤں نے میری دلکش شرارت کو حماقت سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا تھا۔ گویا اُس تشنگی سے پیاسے کو پانی سے جنون کی حد تک پیار ہو گیا۔ یعنی برف سے پیار کرتے کرتے میں شاید ہمالیہ کی چوٹیوں پر تپسیا کرنے والا ایک جوگی بن گیا ہوتا اگر میں نے زندگی کے دوسرے رنگ نہ دیکھ لیے ہوتے۔ ایمان سے!

ہمارا گھر دریائے جہلم کے کنارے ایک تین منزلہ مکان میں ہوا کرتا تھا۔ ایک لمبی مگر بالکل سیدھی گلی دریا کو سڑک سے ملا رہی تھی۔ گویا کھڑکی سے جھانک کر کشتیوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کے اچھے بُرے مناظر دیکھنے کو ملا کرتے تھے اور سڑک کی چہل پہل بھی نظر آیا کرتی تھی۔ اور مجھے یاد آ رہی ہے اُن دنوں کی جب ہر موسم میں، بارش میں بھی اور برف باری میں بھی، امن میں بھی اور فسادات کے دوران بھی، ناگہانی آفتوں کے پہلے بھی اور بعد بھی۔ کشمکشِ زندگی جاری رہا کرتی تھی، کوئی چاہت کے بیج بو کر محبت کے گلستاں کو وجود میں لایا کرتے تھے اور کچھ لگاتار کوشش کیا کرتے تھے۔ بدکاریوں سے گلستانوں کو بیابانوں میں بدلنے کی کچھ عادتوں کی وجہ سے، کچھ عیبوں کی وجہ سے! کچھ اپنے آقاؤں کی فرماں برداری کرنے کی خاطر اور کچھ جنون کی خاطر! ایک کی پسند دوسرے کی ناپسند ظاہر کرنے کی سرپرستی بھی ہوا کرتی تھی کچھ لوگ ایسے واقعات کو ایک مجبوری یا ایک وقتی ضرورت سمجھ کر برداشت کیا کرتے تھے، وقتی طور پر سہی مگر ان رُکاوٹوں کے باوجود زندگی کا سفر سہانا ہوا کرتا تھا، ایک ہی قوم کے دونوں جزوں یعنی ہندوؤں کے لیے بھی اور مسلمانوں کے لیے بھی، بلکہ شورش کے دوران بھی گلی، کوچوں اور لمبے راستوں پر ڈرتے ڈرتے دونوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کا حال جاننے کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ کوئی کسی کو ناراض نہیں کیا کرتا تھا۔

یاد آ رہی ہے مجھے اُس دن کی جب برف کے مجسمے بناتے ہوئے میں اپنی مسلمان محبوبہ سے

عاشقانہ باتیں کر رہا تھا۔ لڑکی کی ماں نے میری ماں کی توجہ ہم پر مرکوز کرنے کی خاطر چلانا شروع تو کیا تھا مگر غصے میں مٹھاس کی چاشنی ڈال کر۔ یعنی اُس نے میری ماں سے کہا تھا کہ دیکھ تمھارا لاڈلا پڑھائی چھوڑ کر بیماری کو دعوت دے رہا ہے اور ساتھ میں اپنی بہن کو بھی بیماری کی تاثیر پہنچا رہا ہے۔ یعنی عقلمند کو فقط اشارہ مل جاتا تھا اور ہم آج بھی بھائی بہن ہیں۔ یاد آ رہی ہے مجھے اُن دنوں کی جب میری کامران سے دوستی ہو گئی تھی، لوگ اُس کے بارے میں سوچتے کم تھے اور بولتے زیادہ تھے۔ اُن دنوں امن و امان کو قائم و دائم رکھنے، ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی خاطر ہر ممکن کوشش کیا کرتے تھے۔ مندر میں پوجا پاٹھ اور گھنٹیاں بجانے والوں کو اذان کی آواز سن کر سکون پانے کی عادت پڑ گئی تھی جبکہ پانچ وقت نماز پڑھنے والے عابدوں کو مندروں سے آ رہی آوازوں میں شور نہیں سنائی دیا کرتا تھا۔ جبھی تو ان دنوں فرقہ پرستی یا سیاست کے بدلتے رُخ طلبہ کی توجہ کے موضوعات نہیں ہوا کرتے تھے۔ دلچسپی کے موضوعات ذاتی توجہ کے اِرد گرد گھوما کرتے تھے۔

کامران میری توجہ کا مرکز اس لیے بن گیا تھا کیونکہ جب بھی میں اسکول جایا کرتا تھا وہ مجھے، میرے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر ایک فوجی کی طرح سیلیوٹ (Salute) کیا کرتا تھا جبکہ میں اس کی تلوار کٹ مونچھیں دیکھ کر اپنی ہنسی کو روک نہیں پاتا تھا، وہ اپنی عمر چالیس سال بتایا کرتا تھا لیکن وہ مجھے اپنے سے عمر میں آٹھ دس برس بڑا نظر آتا تھا۔ وہ روز حجامت کر کے گھر سے نکل پڑتا تھا۔ ملٹری وردی پہنا کرتا تھا اور اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں پر ایک ملٹری ٹوپی پہنتا تھا۔ سردیوں میں ملٹری کی بنیان اور ملٹری کا اوور کوٹ (Over Coat) پہنا کرتا تھا۔ بارش میں یا برف باری میں نظر نہیں آیا کرتا ورنہ وہ روز سڑک اور کوچے کے درمیان کھڑی عمارت کے ساتھ ایک مخصوص جگہ بنا کر آتے جاتے لوگوں اور محلے والوں کے جوتوں کی مرمّت کیا کرتا تھا۔ نہایت واجب داموں پر! دو گھنٹے وہاں کام کر کے وہ اپنی دوسری مخصوص جگہ پر کام کیا کرتا تھا۔ بول چال میں سلیقہ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ اُس کو شک کی نظروں سے دیکھ کر پاکستانی جاسوس سمجھ کر پیار بھی کرتے تھے جبکہ کچھ لوگ انھیں کُرید میں اپنی نفرت کا احساس دلا کر ڈرایا بھی کرتے تھے اور مفت میں کام بھی کروا لیتے تھے۔ یہ ساری باتیں وہ مجھے خود بتایا کرتا تھا اور یہ احساس دلایا کرتا تھا کہ کشمیر میں اگر کوئی مسلمان ہندوستان کو اپنا ملک سمجھتا ہے یا کوئی ہندو پاکستان کو گالیاں نہ دے تو اُس کو شک کے چھوٹے یا بڑے دائرے میں رکھا جاتا ہے۔

کامران نیتا جی سبھاش چندر کی آزاد ہند فوج میں ایک جانباز سپاہی تھا اور ایک پیر کٹ

جانے کی وجہ سے انڈین آرمی سے سبکدوش ہو کر آیا تھا۔ وہ ایک خوددار انسان ہونے کی وجہ سے خود اپنے گزارے کے لیے کام کرتا ہے ان دنوں ہندو اور مسلمان ایک روح دو جسم والے دو دوست بھی ایک دوسرے کے گھر میں کھانا نہیں کھایا کرتے تھے لیکن ایک دن جب میں کڑاکے کی سردی میں اُس کو اپنے پیتل کے لوٹے میں چائے دینے گیا تھا تو ایک پھرتیلے سپاہی کی طرح وہ اپنے بیگ سے لوٹا نکال کر چائے پی گیا تھا۔ پانچ وقت نماز پڑھنے والے کا دعویٰ کرنے والا ایسا کرسکتا ہے؟ یہ سوال مجھ سے میرے گھر والوں نے کیا تھا! جب ہم نے اپنی زمین بیچ کر مکان خرید لیا تب کامران سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ نئے محلے میں جا کر پہلے ہی دن میرے برف پر چلنے کے شوق نے صبح سویرے ایک عورت کو اپنی دلچسپی کا منظر دکھا دیا تھا۔

ایک پری چہرہ، شاداب جسم والی عورت سردی سے ٹھٹھر رہی تھی اور وہ برف پر بیٹھ کر کانپ رہے ایک ہاتھ سے اپنے اُلجھے بالوں کو کھرچ رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے برف پر پھینکا ہوا جھوٹا کھانا ٹھٹھر رہے دانتوں کی رُکاوٹ کے باوجود اپنے منہ میں ٹھونس رہی تھی تھی۔ محلے والوں کی نظریں اس جوان پُرکشش، نیم عریاں سینے پر رُک تو جایا کرتی تھیں مگر ایک بے شکل خوف سے لرز کر خود ہی نظریں ہٹا کر اپنے کام کاج پر جاتے رہتے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہوا کرتے تھے جو گرمیوں میں صبح سویرے جھانک جھانک کر عورتوں کو نہاتے ہوئے دیکھنے کو اپنا محبوب مشغلہ سمجھا کرتے تھے مگر میں جب بھی اس عورت کے چہرے اور بدن کو دیکھا کرتا تھا میں اپنی تصوراتی دنیا میں کبھی اس کو قلوپطرا، کبھی مونا لیزا کی شکل میں دیکھا کرتا تھا جبکہ محلے والوں کی نظر میں وہ ایک زاہدہ ہے، عارفہ ہے جو لل دید کی طرح اپنے شوہر کے ساتھ لپٹ کر رہنے کی بجائے سڑکوں پر رہتی ہے اور جانوروں کی طرح یا پرندوں کی طرح انسانوں کا جھوٹا اور پھینکا ہوا کھانا کھا کر لوگوں کو رزق کی قدر کر کے رزّاق کو یاد کرنے کا پیغام دیتی ہے۔ شوہر اکبر ہانجی راتوں رات ایک ٹھیکیدار کے ملازم سے خود ہی کشتیوں میں راشن لے جانے والا ٹھیکیدار بن گیا تھا اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر کے کپڑے کی ٹوپی اُتار پھینک کر قراقلی ٹوپی پہننے لگا تھا۔ اُس کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ بے شک شبِ عروسی کو بھی وہ اپنے شوہر کے سینے سے لپٹ گئی تھی مگر اس نیک پر دین و خدا دوست عورت کی وجہ سے اس کی تاج پوشی ہوئی تھی۔

اس کا نام نوری تھا مگر میں اس کو حوری کہا کرتا تھا کیونکہ وہ ایک میلی کچیلی حور ہی تو تھی۔ شروع شروع میں جو بھی ہمارے کوچے کے ساتھ گزرنے والی نالی کے اِرد گرد بیٹھی نوری کو شیطان کی ہم

نفس یا کسی راکھشس کی بیٹی کہا کرتے تھے، وہی کہہ رہے تھے کہ سونے کو پھولوں میں رکھ دو یا گندگی کے ڈھیر میں رکھ دو وہ سونا ہی رہتا ہے۔ خدا نے خوشبو اور بدبو کا فرق ہم جیسے عام لوگوں کے لیے رکھا ہے۔ نوری گھنٹوں ٹکٹکی لگائے آسمان میں گھورتی رہتی تھی۔ وہ آسمان کو اس طرح گھورتی رہتی گویا بے زبان زمین آسمان کو دیکھ رہی ہو! لوگ کہتے تھے کہ وہ عبادت کرتی ہے اور اُس کے اس عمل میں خلل ڈالنے والوں کو بلکہ چھونے والے کو برقی جھٹکے لگ جاتے ہیں۔ میں نے پھسلنے کا بہانہ کر کے اُس کو چھو لیا تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تب مجھے شک ہوا تھا کہ نوری ایک گونگی، دماغی طور پر کمزور، حالات کی شکار ایک مظلوم عورت ہے۔

پھر وہ جب غائب ہوئی تو کسی نے اُس کو تلاش کرنے کا ذکر نہیں کیا اور نہ کسی نے فکر کا اشارہ دیا۔ چند روز بعد نوری جب گلی میں پھر دکھائی تب اُس کی کیفیت مختلف تھی، وہ بار بار اُلٹیاں کر کے ایک مُرغی کی طرح اپنی ہی اُلٹیوں میں سے دانے نکال کر منہ میں ڈال رہی تھی اور کئی مہینوں تک گلی سے گزرنے والے اپنی اُلٹی کو روکنے کی خاطر نوری کو دور ہی سے دیکھ کر اپنی نظریں پھیر کر گزر جایا کرتے تھے بلکہ بعد میں بھی کسی نے اُس کے پھول رہے پیٹ کو نہیں دیکھا۔ شاید اس لیے کہ وہ کچھ نہ کچھ چھپا کر بیٹھا کرتی تھی۔ نوری نے سڑک پر ایک بچے کو جنم دیا تو لوگ اُس پر ترس کھانے کی بجائے اس واقعے کو قدرت کا کرشمہ سمجھتے رہے۔ اکبر چونکہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر کے ایک خوبصورت ڈونگے (کشمیر کی ایک خاص قسم کی بڑی کشتی جو مکان نما ہوتی ہے) میں رہنے لگا تھا اور اپنا رسوخ بڑھا کر ایک سیاسی پارٹی میں شامل ہو کر اُن دنوں الیکشن لڑ رہا تھا، فوراً یہ کہہ بیٹھا کہ نوری روز اس کے ساتھ رہتی ہے اور اُس خوشی میں اُس نے نوری کے بال کٹوا دیے تھے اور اچھے کپڑے بھی پہنوا دیے تھے۔ مگر نوری چند دنوں بعد وہی معمول کی میلی کچیلی بقول محلّے والوں کے، ایک زاہدہ ہی رہی، میں نے ایک بزرگ سے پوچھا تھا کہ اکبر ایسی عورت کو کیسے برداشت کرتا ہے تو اس نے میری نادانی کو نظر انداز کر کے یہ بتایا تھا کہ جیسے خلیفہ ہارون رشید اپنے بڑے بھائی بہلول کو جو ایک مستانہ تھا، اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا کرتا تھا۔ یہ بات اکبر ہانجی کے حق میں گئی اور وہ الیکشن جیت گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنے بیٹے کو بھی کرشماتی بچہ سمجھ کر اُس کی ناز برداریاں اٹھاتا رہا۔ مگر جب بھی ہم کالج میں نوری کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا رہتا تھا کہ کوئی شیطان زرخیز زمین میں بیج ڈال گیا ہے، اکبر کی لاپروائی اور محلے والوں کی غفلت کا فائدہ اُٹھا کر یا پھر ان کی عقیدت کی آڑ میں!

مجھے یاد آرہی ہے اُن دنوں کی جب سیاسی اختلافات اور مذہبی مجبوریوں کے باوجود ہندوستان کو پسند کرنے والے اور ناپسند کرنے والے تکرار کو جنگ میں بدلنے سے پہلے ایک دوسرے کو غیر نہیں سمجھا کرتے تھے۔ پھر اُجالوں کو گرہن نے دبوچ ڈالا اور تاریکیوں میں امن ڈوب گیا۔ کشتی کو چھلنی کر دیا جائے تو کنارے کے قریب ہو کر بھی وہ ڈوب جاتی ہے۔ کچھ ڈوب جاتے ہیں کچھ بہہ جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں وہ بچھڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ میں سرکاری طور پر اپنے ہی وطن کے حالات کا جائزہ لینے آیا ہوں اس لیے دل مچل رہا ہے اور پچپن سال کی عمر میں، میں اپنے شہر کی گلی کوچوں میں ایک بچے، لڑکے اور جوان کی طرح برف کی چادر پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ کر گھومنا چاہتا ہوں۔

ایئر پورٹ پر مجھے لینے والا سرکاری افسر میرا واقف تو نہیں تھا مگر کار کا ڈرائیور میرا بچپن اور لڑکپن کا دوست ہے اس لیے میں اُس کے ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے کو بس یہی بتاتے رہے کہ یاد آرہی ہے اُس دن کی، اُس شخص کی۔ میں نے جب حوری یعنی نوری کے بارے میں پوچھا تو یہ جان کر دُکھ ہوا کہ ماں کو اس کے بیٹے نے اپنے شوہر کے عالی شان ہاؤس بوٹ میں مہمانوں کے سامنے قالین پر الٹی کرنے اور پھر معمول کے مطابق ایک پرندے کی طرح دانے اپنے منہ میں ڈالنے کی سزا کے طور پر اس کو دھکا دے کر جھیل میں ڈبو دیا تھا اور کہا یہ گیا کہ وہ زندگی میں پہلی بار مسکرا کر جھیل میں ایک پھول کی طرح کود گئی۔

اس سے پہلے کہ میں کامران کے بارے میں پوچھتا، میرے دوست نے خود ہی کہا کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ مشکل چل پھر سکتا ہے مگر پھر بھی اپنا ڈبہ لے کر کہیں نہ کہیں کام کرتا ہے۔ وہی پھٹا پرانا کوٹ پہن کر۔ سر پر ملٹری ٹوپی، روز حجامت کرتا ہے۔ بوٹیں بھی سفید ہو گئی ہیں اور وہ تلوار کٹ مونچھیں بھی سفید ہیں۔ ایک آواز سن کر کار روک کر مجھے میرے دوست غنی نے ایک گھر میں چھپا دیا۔ وہاں موجود لوگوں کی گفتگو سن کر یہ جان پایا کہ کوئی 'حاکم' نام کا غیر قانونی کارکردگیوں کے لیے گھیرا گیا تھا۔ وہ تو بھاگ گیا اور جو مر گیا ہے خدا جانے وہ شہید ہے یا ایک غدّار!

میں نے اپنا Handycam برف سے ڈھکے پیڑ، کھیت، گاؤں اور سڑکوں کے حسین مناظر کو بطور یادیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کار میں بیٹھنے سے پہلے ہی نکالا تھا۔ اَدھ کھلی کھڑکی سے جب میں نے Zoom کر کے پہلے لہو سے رنگے ہوئے برف کو دیکھا، پھر پالش کے ڈبّے، پالش کرنے والے برش اور ایک کھلے ڈبّے کے ساتھ سڑک پر بکھرے سامان جو مرمت کرنے والے

ایک موچی کا سامان تھا۔ آخر میں میں نے ایک شناسا چہرہ دیکھا، وہ کامران کا چہرہ تھا۔

''یہ کامران ہے! آزاد ہند فوج کا ایک سپاہی!'' میں نے غنی سے کہا۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں کہا: ''آس پاس حاکم کے لوگ ہیں'' میرا منہ یوں بند ہو گیا کہ رات بھر مجھے نوری کی یاد آتی رہی۔ کامران کی یاد آتی رہی۔ سوچتا رہا کہ کیا نوری کے جسم سے جھیل کا پانی منجمد ہو گیا ہو گا؟ کیا آزادی کے علمبردار کامران کے خون سے برف کا رنگ لال ہو گیا ہو گا۔

رات کروٹیں بدل کر گزار تو دی لیکن صبح سویرے میں نے غنی سے پوچھا کہ یہ حاکم کون ہے تو یہ جان کر سکتے میں آ گیا کہ حاکم اکبر ہانجی کا نقلی بیٹا اور نوری کا بیٹا ہے جس نے اپنے آپ کو خود ہی حاکم کا لقب دے لیا ہے۔

کاش میں اُس کے اصلی باپ کا نام جان سکتا!

○○

شرم

ایسا پہلی بار ہوا تھا جب ایرا کے والدین، اس نئے شہر کے نئے گھر میں اس کی جنم دن کی پارٹی کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور وہ بھی جیسے دَبے دَبے انداز میں نوحہ خوانی کر رہے ہوں۔

ہوا یوں تھا کہ ڈاکیہ نے مبارک باد کے پیغامات کے ساتھ ایک خط بھی دیا تھا جو ایرا کے چھوٹے بھائی نے نہ صرف کھولا تھا بلکہ پڑھ کر اپنے والد کو دیا تھا۔

خط ان کے آبائی شہر سے آیا تھا اور ان کے ایک دور کے رشتے دار نے لکھا تھا۔ خط میں ہمدردی کی چاشنی کے ساتھ اُس کڑوے سچ کا ذکر تھا جس کی وجہ سے ایرا کا باپ اپنا آبائی شہر چھوڑ کر اس شہر میں رہنے آیا تھا۔ اس لیے ایرا کے والدین بار بار خط پڑھ کر ہر بار یہی بڑبڑا رہے تھے کہ وہ تو ایک بھیانک حادثہ تھا، کہیں اب وہ ان کے بچوں کے لیے عمر بھر کا سانحہ نہ بن جائے!

ایرا کو پہلے غصہ آیا تھا خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس کا چھوٹا بھائی بھی پارٹی چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ پارٹی ختم ہوتے ہی جب ایرا نے اپنے والدین کو دیکھا تب وہ ایک گرم پانی کے چشمے کی طرح اُبلنے لگی مگر جونہی اس نے اپنے والد کے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے خط چھین کر پڑھا تو جم کر برف بن گئی۔ بالکل ویسے ہی جیسے سات سال پہلے وہ ایک اجنبی کا چہرہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی۔ برف پگھل کر یادوں کی تپش میں سما گئی تو اُس حادثے کے دُھندلے دُھندلے عکس اُبھر کر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ تب ایرا کی عمر تقریباً نو سال تھی۔ اُس روز اگر اُس کی اسکول کی بس چھوٹ نہ گئی ہوتی تو وہ کب کی اسکول جا چکی ہوتی۔

ماں اس کے چھوٹے بھائی کو اپنی نیک پڑوسن کے گھر چھوڑ آئی تھی کیونکہ وہ بیمار تھا اور وہ ایرا کو آٹو میں اسکول چھوڑنے کے لیے تیار کر رہی تھی جب اُس نے دوسری پڑوسن کی چیخ سُنی تھی۔ وہ بے چاری اپنے شرابی شوہر کے عتاب کا شکار ہو کر ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی اور ایرا کی ماں اس کو اپنے شوہر کی نازیبا گرفت سے چھڑانے کے لیے دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھی۔

ایرا بھی اس کے پیچھے بھاگ کر پہنچ گئی۔ تب جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اب وہ سمجھ رہی تھی۔ وہ بھی یادداشت کی مدھم روشنی میں!

ایرا کی ماں نے اس کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر گھر لوٹ جانے کی سخت تاکید کی تھی اور وہ خوف زدہ ہوکر اپنے گھر کے کھلے دروازے تک پہنچ بھی گئی تھی مگر ایک اجنبی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر خوف زدہ اس لڑکی نے بھی مسکرا کر کہا تھا۔ ''میرے پاپا سے ملنے آئے ہو تو وہ ملیں گے نہیں۔ وہ تو دفتر گئے ہیں! ماں بھی گھر میں نہیں ہے، منا بھی نہیں!''

اجنبی یہ سن کر نہ صرف مسکرایا تھا بلکہ ایک گڑیا ایرا کے ہاتھ میں تھما کر بہت ہی پیار سے اس کو گود میں اُٹھا کر یہ کہہ کر کہ وہ اس کی ماں کا انتظار کرلے گا، اُسے گھر کے اندر لے گیا تھا۔ ایرا کو یہ اچھا لگا تھا اور اُس کے دماغ میں ڈر کی بھیانک شکل، جو اس نے اپنے پڑوس میں دیکھی تھی وہ مٹ گئی تھی۔ تب ایرا کھلکھلا کر ہنس کر بولی تھی ''آپ میرے پاپا کی طرح مسکراتے ہو۔''

لیکن اگلے ہی لمحے ایرا اجنبی کی خوف ناک شکل دیکھ کر چلائی تو تھی مگر اس کی ماں تب لوٹی تھی جب اجنبی ایرا کو بے ہوشی کی حالت میں لہولہان کر کے چلا گیا تھا۔ ایرا کے سامنے چند مناظر کے عکس آتے رہے اور کیا کچھ ہوا ہوگا وہ سمجھ کر اُس کی روح کانپ رہی تھی۔ گویا سات سال پہلے کا درد رفتہ رفتہ کرب کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ اس حادثے کے بعد جب ایرا کو ہوش آیا تھا تب وہ اسپتال میں ایک لوہے کے پلنگ پر ایک لال کمبل اوڑھ کر لیٹی تھی۔ کئی دنوں تک شناسا و غیر شناسا لوگ اس کو پیار کے علاوہ تحائف دیتے رہے۔ اور وہ جب اپنی ماں سے پوچھا کرتی تھی کہ ڈاکٹروں کے علاوہ پولیس والے اور انجانے لوگ کیوں اُس سے ملنے کے لیے آتے ہیں تب بے بس ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کو ایک ہی جواب دیا کرتی تھی ''تمھارا نام ایرا ہے نا اس لیے۔ معلوم ہے ایرا سرسوتی بھگوتی کا ایک نام ہے۔ سرسوتی کی اُن پر کرپا ہو۔ اس لیے تو، معلوم ہے وہ سب تمھیں گھر میں بھی یاد کرتے رہتے ہیں۔ سرسوتی وندنا کا ریاض بھی کرتے ہیں۔ ماتا سرسوتی۔ شاردا۔'' اور یوں ماں بیٹی کو سلا دیتی تھی۔

ایک روز ایرا نے ماں سے پوچھا تھا کہ یہ Child Abuse کیا ہوتا ہے؟ تو گھبراہٹ پر مشکلاً قابو پا کر اس نے کہا تھا کہ Child کے معنی بچہ اور Abuse کے معنی گالی۔ مطلب بچوں کو گالیاں نہیں دینی چاہئیں۔ ایرا کو جب یہ بات یاد آئی تب اُس کو احساس ہوا کہ اُس کی ماں پر کیا گزر چکی ہوگی سات سال پہلے۔ ایک معصوم بچی کو جھوٹی تسلیاں دے کر۔ سوزِ نہاں سے راکھ ہوکر!

پھر ایرا جب دس سال کی تھی تب پولیس اُس راکھشس کو گرفتار کر کے اس کے سامنے شناخت کے لیے لائی تھی، وہ خوف زدہ ہو کر چیخ پڑی تھی اور وہ شاید کہہ دیتی کہ اُس نے کیا کیا تھا مگر ماں نے بیٹی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنے ہی نہیں دیا تھا۔ سولہ سال کی ایرا اُس حادثے سے جڑے ہوئے واقعات کو یاد کر کے سمجھ گئی تھی کہ کیوں اُس کے والدین پولیس والوں، میڈیا والوں اور ہمدردوں کو بھی دس سال کی ایرا سے سوالات کی بوچھار نہ کرنے کے لیے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ کیوں ایرا کا نام طرح طرح کے لوگوں کے زبان پر آتا رہتا تھا۔ ایرا کی ماں، ایرا کے پتاجی، ایرا کا محلّہ، ایرا کی بس، ایرا کا کیس۔ ایسا کیوں کہا جاتا تھا یہ گیارہ سال کی ایرا تو جان نہیں سکتی تھی لیکن آج وہ ہر واقعے کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ راکھشس کیوں اپنے غنڈوں سے اُس کے گھر فون کر کے دھمکیاں دیتا رہتا تھا، یہ سب وہ خط میں لکھی ہوئی سطور کے درمیان یعنی Between the Lines پڑھنے کی بجائے سمجھ گئی تھی اور بہت ہی ذہین ہونے کی وجہ سے جان گئی تھی کہ ایک حادثہ خاندان کے لیے ایک سانحہ بن گیا تھا تب اُس کے باپ نے اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں اپنے مَن پسند آبائی شہر سے ہجرت کی تھی۔

ایرا خوش تھی۔ نئی سہیلیاں، نئے حالات اور سازگار واقعات نے ان کو خوشیاں ہی خوشیاں دی تھیں۔ اور آج کی جنم دن کی پارٹی بھی ان خوشیوں کا حصّہ تھی مگر ایک خط نے گویا سورج پر گرہن لگا کر اُجالوں کو دبوچ ڈالا تھا۔ ایرا کو پہلی بار یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کے نام سے عدالت میں ایک کیس چل رہا تھا، اس کا فیصلہ سات سال کے بعد اس لیے ہوا تھا کیونکہ ملزم کو مجرم ثابت کرنے میں ایک سیاست داں کا اہم کردار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مجرم اس کے سیاسی حریف و ذاتی دشمن کا اکلوتا بیٹا ہے۔

نچلی عدالت نے مجرم کو سات سال کی قید کا فیصلہ سنایا ہے۔ ایرا اپنے چودہ سال کے چھوٹے بھائی کو یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ اُس کی بہن مظلوم ہے مگر بھائی کی نفرت بھری نگاہیں بہن کو مجرم سمجھ کر شرم سے جھک گئی تھیں۔ ایرا بھائی کی شکایت کرنے جب اپنے والدین کے کمرے میں داخل ہوئی تھی تب وہ چٹھی بار بار پڑھ کر اس بارے میں دونوں بڑبڑا رہے تھے اور ایک دوسرے کو بتا رہے تھے:

''سیاسی آدمی ہے ہائی کورٹ میں بری بھی ہو سکتا ہے۔''

''آج نہ سہی سال دو سال بعد سہی!''

''بے گناہ اور معصوم لوگوں کے جسموں کو لہولہان کرنے والے دہشت گردوں کے لیے نیا قانون ہوتا۔ مگر معصوم بچیوں کو مسل دینے والے Rapists کے لیے وہی پرانے قانون۔''

''ایسے خونخوار درندوں کو عمر قید کی سزا ملنی چاہیے۔''

''پھانسی کی سزا کیوں نہیں تاکہ عبرت ہو۔''

''ہماری بیٹی کو تو عمر قید کی سزا مل گئی ہے۔''

''ہمیں بھی! کیا ہم کسی سے نظریں ملا سکیں گے؟''

''ہمیں اپنے بچوں کو جھوٹ اور مصلحت کا سہارا لے کر اس سانحے کو عمر بھر کا المیہ نہ بنا دینے کا مشورہ دینا چاہیے۔''

''شاید اُس کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس شہر میں ایک ہی بلڈنگ میں رہنے والوں کو ایک دوسرے کا نام تک معلوم نہیں ہے۔ کیا ایرا صرف ہماری بیٹی کا نام ہے؟''

ایرا یہ سن کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جب اُس کے والدین اپنی لاڈلی بیٹی کو سمجھانے گئے تب دونوں چیخ پڑے۔ ایرا پنکھے کے ساتھ لٹک کر جھول رہی تھی۔ اُس کی بند مٹھی میں ایک چٹھی تھی جس میں ایرا نے فقط اتنا لکھا تھا کہ میں جھوٹ اور مصلحت کا سہارا لے کر عمر قید تو کاٹ سکتی ہوں لیکن اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے آنکھیں جھکا کر زندہ نہیں رہ سکتی ہوں۔

کاش ہم سب اس درندگی کے خلاف اعلانِ جنگ کر سکتے۔ شرم ہماری کمزوری بن جانے کی بجائے ظالم کی گردن پر ایک ایسا بھاری بوجھ بن جاتی جس سے اس کی گردن دنیا کے سامنے جھک کر کٹ جاتی! ایسا ہوگا نہیں اس لیے شرم سے میری ہی گردن جھک گئی ہے۔

یہ میرا اپنا مقدمہ تھا
میں ہی ملزم تھی
میں ہی وکیل تھی
میں ہی جج تھی
مگر قانون اس جہاں کا ہے!!
اگر بدلا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا!!

OO

جنون

عشق کی کوئی انتہا نہیں ہوتی ہے مگر چاہت کی انتہا جنون ہے۔ کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے، کیا صحیح ہے کیا غلط، یہ سب جنون نہ سوچنے دیتا ہے اور نہ سمجھنے دیتا ہے۔ ایک سہانا سفر کرنے کے بعد جب دو ہم سفروں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کی منزلیں جدا جدا ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے خوش آمدید کے لیے سجی سجائی محفل اُٹھ گئی ہے اور ویرانگی چھا گئی ہے۔ ایسا ہی کچھ تاثر چندن کمار کی خواب گاہ میں چھا گیا ہے۔ کل تک جہاں بہاریں رقص کر رہی تھیں آج تجسس دل و دماغ پر حاوی ہو کر ہر گھڑی تناؤ کے بوجھ کو بڑھا دیتا ہے۔

عاشق اور معشوقہ دونوں آمنے سامنے تو ہیں مگر تذبذب کا شکار ہو کر، وجہ یہ کہ عاشق کی نگاہیں معشوقہ کی آنکھوں پر جمی ہوئی تو ہیں مگر ان میں اپنائیت کا احساس دلانے والی چمک نہیں ہے۔ خواب گاہ معمول کی طرح آج بھی شبِ عروسی کے لیے سجی ہوئی ہے۔ معمول کی طرح آج بھی عطر کی مصنوعی خوشبو معشوقہ کے بدن کی مہک کے مقابلے میں پھیکی پڑ گئی ہے۔

ایسا نہیں کہ معشوقہ نے عاشق کو پیش قدمی سے روکے رکھا ہے بلکہ عاشق نے ہی اپنے قدموں کو تھام کر رکھا ہے۔ وہ اس لیے کہ آج پہلی بار معشوقہ نے عاشق کی نہ صرف فرمائش ٹھکرا دی تھی بلکہ پہلی بار اپنا سر ہلا کر 'ہاں' کی بجائے 'نہیں' کا تاثر دینے کی بجائے بول کر انکار کیا تھا۔ حالانکہ اِنکار کے باوجود اُس نے والہانہ انداز میں اپنی لپٹ چمٹ کا سلسلہ جاری رکھا تھا!

یہی تو اس کے ذہنی کھنچاؤ اور قلبی دباؤ کی شدت کی وجہ ہے کیونکہ تین مہینوں سے زیادہ کے سحر انگیز قرب کے دوران معشوقہ نے اپنے لبوں پر تبسم کی مہر لگا کر بھی ایسا نہیں کیا تھا جو آج وہ کر چکی ہے۔ وہ لمحہ بہت عذاب دہ تھا جب دن بھر ایک کشتی میں بیٹھ کر چند مسرت آمیز لمحات، جھیل میں گزار کر عاشق کی ایک آخری خواہش پوری نہ کرنے کا سیدھا جواب دیا تھا۔ معمول کی طرح آج بھی وہ وہی کردار بن گئی تھی جس کردار میں عاشق اُس کو دیکھنا چاہتا تھا۔

پھر گھر سے ہوٹل، ہوٹل سے جھیل، جھیل کا کنارہ اور پھر ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارہ سے دُور بہت دُور ایک خوبصورت جگہ۔ آس پاس کوئی نہیں پُر سکون خاموشی کو توڑ رہی چپو کی آواز۔ اور عاشق کے ذہن سے اُبھر رہے ہلکے ہلکے سُر! عاشق نے چپو چھوڑ کر معشوقہ کا ہاتھ تھام لیا تھا کشتی رفتہ رفتہ، بہت دھیمی رفتار سے، ایک ایسی جگہ رُک گئی تھی جہاں چاروں طرف کمل کے پھول تھے۔

عاشق نے معشوقہ کو کھلے بال رکھنے کی فرمائش کی تھی اور معشوقہ نے 'ہاں' میں سر ہلایا تھا۔ پھر عاشق کبھی معشوقہ کے بالوں اور کبھی کمل کے پھولوں کو اپنی انگلیوں سے چھیڑ کر یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ جل ترنگ کے تاروں کو چھیڑ کر کسی جُگل بندی کو جنم دے رہا تھا۔

معشوقہ عاشق کی کیفیت بھانپ کر مسکراتی رہی۔ ہنستی رہی، کبھی کبھی لپٹ کر قہقہے بھی لگاتی رہی۔ آخر جب عاشق کے دل کی بات زبان پر آ گئی تب اُس نے سوچا تھا کہ اُس کی ہم سفر فرمائش سن کر قہقہے لگاتے ہوئے 'ہاں' میں سر ہلا دے گی۔ مگر اس بار ویسا نہیں ہوا جیسا اُس نے سوچا تھا بلکہ جواب سن کر اُس کو یوں لگا تھا جیسے کسی نے اُس کو دھکا دے کر سر کے بل جھیل میں گرا دیا ہو اور وہ سانسیں لینے کی کوشش کرتے ہوئے پانی کی تہیں کاٹ کاٹ کر کمل کے پھولوں کی جڑوں کی طرف جا رہا ہو۔

پھر وہ جب تیزی سے کنارے کی طرف لوٹا تب بھی اُس کی معشوقہ سُر اور لے میں یوں ہنستی رہی گویا نغمۂ چاہت گا رہی تھی اور عاشق اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر حیران ہوتا رہا۔ حیران اس لیے کہ وہ چوٹ لگا کر ہنس کیوں رہی تھی۔ کیا وہ اپنے تصورات کے عکس سے پیار کر بیٹھا تھا؟ یا وہ خود ہی بنائے ہوئے اُن دائروں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو پانی کی سطح پر ایک پتھر پھینکنے سے پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کا تعاقب کرتے کرتے غائب ہو جاتے ہیں!

جیسے یہ سچ ہے کہ کپڑوں کو اُجلا پن دینے والی نیل جس زمین میں پیدا ہوتی ہے اُسی کو چار سال کے لیے بانجھ بنا دیتی ہے ویسے ہی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دماغ کی پیداوار جنون دماغ پر حاوی ہو کر نہ کسی خیال کو جنم لینے دیتا ہے اور نہ سوچ سمجھ کر اُبھرنے دیتا ہے یعنی لکیر کے فقیر! معشوقہ اپنے عاشق کی کیفیت بھانپ چکی تھی۔ وہ جانتی ہے کہ جب اُس سے کھلے بال رکھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے کی فرمائش ہوتی ہے تب عاشق اپنے آپ کو چھپ چھپ کر ایک پری چہرہ حسینہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے والا ایک اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اُس کا کروڑ پتی عاشق جب کاسٹیوم اور میک اپ پر ہزاروں روپے خرچ کر کے چند گھنٹوں کے لیے رتی بنا دیتا ہے تب وہ اپنے

آپ کو کامدیو سمجھتا ہے۔ جب معشوقہ انارکلی ہوتی ہے تب عاشق اپنے آپ کو شہزادہ سلیم سمجھتا ہے!
معشوقہ سب جان کر بھی عاشق کو اپنے بھرپور تعاون سے نوازتی رہی ہے بلکہ اپنی کاوشوں کو خلوص اور ایمانداری سے سینچ کر ـــ! اُس نے جس رنگ میں رنگ ڈالا وہ مسکرا کر قبول کرتی رہی یہ سوچ کر کہ ایک جنونی سے ایسی احمقانہ حرکتوں کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ دل ہی دل میں وہ ایک بے وقوف سرمایہ دار کی حالت پر ہنس کر کبھی کبھی اُس کو پاگل سمجھتی رہتی مگر آج عاشق کی حالت دیکھ کر وہ تجسس کا شکار ہوگئی۔

چندن کمار کا اصلی چہرہ وہ ہے جو اُس نے آج تک دیکھا تھا یا وہ چہرہ اصلی ہے جو وہ آج دیکھ رہی ہے؟ چندن نہ بے وقوف ہے، نہ احمق ہے اور نہ پاگل ہے! بلکہ وہ ایک کامیاب صنعت کار ہے جو کبھی کبھی نادانیاں کرتا رہتا ہے ہاں مگر وہ عقل کے کاروبار میں دل کو شریکِ کار نہیں سمجھتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ دل کے معاملات میں عقل کو دُور رکھتا ہے۔ اپنے دفتر میں، گھر سے باہر بلکہ گھر کے اندر بھی جزوی طور پر وہ ایک سنجیدہ آدمی ہے۔ جبکہ گھر کے اندر اُس کا ایک اور گھر ہے جہاں کسی کا دخل نہیں۔ وہاں ایک پرانے نوکر کے بغیر کوئی داخل نہیں ہوسکتا مگر وہ اپنے ساتھ اکثر چند فیشن ڈیزائنرس اور میک اپ کرنے والوں کو لے آتا ہے۔ اُس کے ہمراز نوکر کو اُس کی سیمابی کیفیت کے بارے میں پوری معلومات ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جب واقعات چندن جی کی منشا کے مطابق چلتے رہیں تب وہ خوشی کے آنسو بہا کر یہ احساس دلاتا ہے کہ جیسے بارش پھول پتّیوں کو دھو دیتی ہے ویسے ہی پانی نے اُس کی بوجھل آنکھوں کو تروتازہ کردیا ہے بصورتِ دیگر اُس کی آنکھیں وہ منظر دکھاتی ہیں جیسے سیلاب سے ایک چمن اُجڑ گیا ہو، آج بھی وہ جان گیا ہے کہ حالات نے غیر متوقع کروٹ بدل کر اُس کی آنکھوں میں آباد خوابوں کو ایک زلزلہ زدہ علاقے کی طرح ویران کردیا ہے۔

چندن اپنی جنونی کیفیت کے زیرِ اثر ایک مختلف شخص بن جاتا ہے۔ دراصل وہ عہدِ جوانی میں فلموں کی ایک پُرانی ہیروئن کو بغیر جانے پہچانے اور قریب سے دیکھے دل دے بیٹھتا تھا۔ کروڑپتی باپ اپنے اِکلوتے وارث کی خاطر چاند ستارے لانے کے بارے میں بھی سوچ سکتا تھا مگر وہ کیا کرسکتا تھا جب ہیروئن بیٹے سے عمر میں بیس سال بڑی تھی اور شادی شدہ تھی۔

اُس ہیروئن کی تصویر جنونی عاشق کے تصور میں یوں بیٹھ گئی تھی کہ وہ ہر متوقع دلہن میں وہی شکل وصورت تلاش کرتا رہا۔ اپنے من موافق لڑکی نہ ملنے کی وجہ سے وہ چالیس سال کی عمر پار

کرتے ہوئے بھی کنوارا رہ گیا۔

پھر ایک بدیشی سفر کے دوران اُس کو ایک ایئر ہوسٹس میں اُس ہیروئن کی جھلک نظر آئی تو اُس کی شادی دنیا بھر کے میڈیا کی سرخیاں بن گئی تھی۔ لڑکی نے نوکری چھوڑ دی اور شادی کے بندھن کو نہایت سنجیدگی سے لیتی رہی۔ مگر جنونی عاشق کو بیوی کی کم اور مختلف کردار نبھانے والی ایک معشوقہ کی زیادہ ضرورت تھی اس لیے جونہی فیشن ڈیزائنرز کا آنا جانا شروع ہوا وہ تنگ آ کر فقط تین مہینوں کے بعد طلاق لے کر ملک میں بھی کہیں نظر نہیں آئی تھی کیونکہ اُس کو اُس کی تصوراتی معشوقہ کا عکس بن کر رہنا منظور نہیں تھا جبکہ عاشق اپنی دیوانگی کا غلام تھا۔ پانچ سال بعد اُس کو یہ معشوقہ مل گئی تو اُس کو یوں لگا جیسے سردیوں میں بہار آئی ہے!

پچیس سال کی اس عورت کو اُس نے ایک پارک میں دیکھا تھا۔ اُس کی شکل وصورت ہو بہو اُس کی پسندیدہ ہیروئن جیسی تھی فرق یہ تھا کہ ایک اپنے رُوپ کے کارن لاکھوں لوگوں کے دلوں میں رہا کرتی تھی اور دوسری اپنے رُوپ کی وجہ سے سڑک چھاپ طوائف تھی! مگر اس چہرے کو ایک جنونی عاشق نے اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے وہ اُس کے لیے کیچڑ میں کھلا وہ پھول تھا جس کو چھوتے ہی اُس کی دبی خواہشات لاوے کی طرح پتھروں کا سینہ کاٹ کر باہر آ گئی تھیں۔ چندن اُس کو تب اپنے گھر لایا تھا جب وہ میلی کچیلی تھی۔ بال گندے اور اُلجھے ہوئے تھے۔ مگر دوسری بازاری عورتوں کی طرح نہ اُس نے شراب پی رکھی تھی اور نہ ہونٹوں سے پان کی پیک ٹپک رہی تھی۔ وہ باتیں بھی ایسی کرتی تھی جیسے ایک شائستہ سیلز گرلز کسی شوروم کے کاؤنٹر پر گاہک سے باتیں کر رہی ہو۔ چندن پہلی ملاقات کے بعد اُس کو ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں نہلا دُھلا کر، اچھے کپڑے پہنا کر، سجا دھجا کر اپنے گھر لایا تھا اور تب سے اب تک وہ اُس کے ساتھ ہی رہ رہی ہے۔ چندن صبح سویرے اپنا کام کاج دیکھنے جاتا رہا اور دوپہر کو گھر آ کر سارا وقت ساتھ گزارتا رہا۔ کبھی اس کو مغربی لباس پہناتا رہا، کبھی سودیشی لباس۔ کبھی علاقائی لباس پہنا کر، کبھی آدی واسیوں کی پوشاکیں پہنا کر نیم عریاں جسم کی نمائش کرتے ہوئے اور کبھی جدید ترین کپڑے پہنا کر مختلف کرداروں کا گیٹ اَپ دے کر۔ عاشق معشوقہ کو کبھی اِندر سبھا کی رقاصوں کا رنگ رُوپ دیتا رہا اور کبھی مس یونیورس بنا کر اپنے سامنے رکھ کر اُس کو بس دیکھتا رہا۔ آج وہ انار کلی بنائی گئی تھی کیونکہ عاشق اپنے جنون پر قابو پا کر معشوقہ کو بیوی بنا دینا چاہتا تھا، وہ بھی اس لیے کہ اپنے تصورات کی دُنیا کو حقیقت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اُس کی بیوی جو بھاگ جانے سے

پہلے ہچکچاہٹ سے کیا کرتی تھی وہ تعمیل حکم معشوقہ ہنسی خوشی کیا کرتی تھی۔

دراصل اپنی من پسند ہیروئن کی فلموں میں دیکھے ہوئے بے شمار کرداروں کے عکس دیکھ دیکھ کر عاشق کو اچانک رفتارِ وقت کا احساس ہوا تھا اور آج پہلی بار یہ محسوس کیا تھا کہ جنون ایک بے وزن بوجھ ہے جس کو اُٹھا کر راہی سفر جاری تو رکھ سکتا ہے مگر بے شکل منزل کو پا نہیں سکتا!

معشوقہ کا دوٹوک جواب سن کر وہ چونک کر حیرت زدہ ہو گیا تھا آخر شادی سے انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ وہ گھر لوٹ کر سوچتا رہا! پچاس سو روپے لے کر اپنے آپ کو رکشہ چلانے والوں یا ٹیکسی ڈرائیوروں جیسے گاہکوں کو سپرد کرنے والی عورت ایک کروڑ پتی کی بیوی بن جانے سے کیوں گریز کر رہی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک پینتالیس سالہ شخص کے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہتی ہو؟

شام ہوئی تو معشوقہ نے انارکلی کے کپڑے اُتار کر سوالیہ نگاہوں سے عاشق کو دیکھ کر یہ جاننا چاہا کہ اب وہ کون سے کپڑے پہن کر اس کے ساتھ چمٹ جائے!

عاشق نے ایک شادی کا جوڑا پہن لینے کا کہا اور پھر دلہن کو خود سجا کر اُس سے مخاطب ہوا۔

''اگر میں یہ تجویز تمھارے سامنے رکھوں کہ میرے ساتھ پلنگ پر سونے سے پہلے مجھ سے شادی کر لو تو کیا کر لو گی؟''

معشوقہ نے مسکراتے ہوئے 'نہیں' میں سر ہلا دیا۔

''اپنی تمام جائیداد تمھارے نام کر دوں تو؟''

معشوقہ نے پھر اپنی ضد پکڑ لی۔

''میں تمھارے سارے روپے نا دوں تو؟''

معشوقہ نے اس بار غصہ سے کہا۔

''تو میں سمجھ لوں گی کہ تم سے اچھے وہ سڑک چھاپ گاہک ہیں جو طے شدہ رقم ہاتھ میں دے کر میرے جسم کو ہاتھ لگاتے ہیں... مجھے گردے کے آپریشن کے لیے رقم جوڑنی ہے۔ تم بے ایمانی کر سکتے ہو۔ کاش یہ میں تین مہینے پہلے جان پاتی۔ خیر مجھے آزاد کر دو۔ صیاد؟ میرا ہم سفر، ہم نفس، ہم نوا میرا انتظار کر رہا ہے'' معشوقہ یوں چلانے لگی گویا کوئی اُس کے جسم کو خاردار تار سے باندھنے کی کوشش کر رہا ہو اور وہ اُسے روکنے کی کوشش کر رہی ہو! ''اگر میں آپریشن کروا دوں تو — ؟'' عاشق بول پڑا مگر اُس کی معشوقہ اپنی ضد پر قائم رہی۔

کرید کرید کر چندن کمار یہ جان گیا کہ اُس کی معشوقہ اپنے پتی کے ساتھ چھ مہینے پہلے گئی

برسوں سے سوکھے سے متاثر ایک دُور دراز گاؤں سے شہر آئی تھی روزگار کی تلاش میں، مگر شوہر کی بیماری نے ان کی کشمکش زندگی کی نہج بدل دی تھی! ایک جنونی عاشق ایک رحم دل کروڑ پتی پر حاوی ہو کر ایک فیصلہ کن، گرج دار آواز میں بول پڑا:

''میں سمجھا وہ تمھارا باپ ہے، چھوڑ دو اُس کو۔ وہ تمھارے جوان کندھوں پر ایک بوجھ ہے!'' عاشق اپنی معشوقہ کو تب دیکھتا ہی رہ گیا جب وہ شادی کا لباس اُتار کر اپنے کپڑے پہن کر بڑبڑاتی ہوئی کمرے کی جگمگاتی روشنی اور چندن کی مہک کو ٹھکرا کر باہر پھیلے اندھیروں میں داخل ہو گئی! ''ارے ناسمجھ! تم کیا جانو کہ شادی کا بندھن کیا ہوتا ہے! جس کی خاطر میں آگ کے دریا میں کود پڑی ہوں، اس کو چھوڑ دوں۔ ہرگز نہیں! ہاں اتنا بتا کر جا رہی ہوں کہ سونا تپ کر کندن بن جاتا ہے! اور چندن جل کر راکھ بن جاتا ہے! راکھ میں خوشبو نہیں ہوتی!!''

OO

گناہ

وشوا اگر اپنی خواہش کا اظہار معمول کی طرح مصلحتوں کے دائرے میں رہ کر کر دیتا تو وسوندھرا بھی معمول کی طرح اس کی فرمائش کو قبول کر لیتی یا انکار کر دیتی، یعنی شرما کر یا مسکرا کر۔ مگر اس بار اس نے اپنے دل کی بات بے باکی سے کہہ دی اور ایک ضدی بگڑے خواب کی طرح جواب بھی اپنی مرضی کے مطابق سننے کے لیے خود ہی وضاحت، وکالت بلکہ مفاہمت کے لیے یوں بولتا رہا جیسے ایک آبشار اپنے بہاؤ کی روانی میں اور شور پیدا کرنے میں اپنی رفتار کو قائم رکھنے میں کامیابی کے نعرے لگا رہا ہو۔ وسوندھرا کو وشوا کا ایک نیا رُوپ رنگ دیکھ کر جہاں حیرانی ہو رہی تھی وہیں اس کی باتیں بھی اس کو چونکا رہی تھیں۔ گویا اس کی کیفیت یوں تھی کہ کچھ کہا بھی نہ جائے اور چپ رہا بھی نہ جائے۔

وسوندھرا پر ایسی کیفیت اس لیے طاری نہیں ہوئی تھی کہ اس بار وہ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن کر نہیں آیا تھا بلکہ ایک باوقار سوٹ اور ٹائی میں سجا ہوا تھا۔ اس لیے بھی نہیں کہ وہ اپنے ساتھ اسکاچ وہسکی لایا تھا اور معمول کی طرح ایک ہی سانس میں دیسی شراب کا گلاس حلق سے اُتارنے کی بجائے وہ شاہانہ انداز میں چسکیاں لیتے ہوئے اُن دنوں کا ذکر کیا کرتا تھا جن دنوں وہ جھیل ڈل میں مہینوں ہاؤس بوٹ میں رہ کر اپنی بیوی، جو اُس کی معشوقہ بھی تھی، کے ساتھ اپنی شامیں گزارا کرتا تھا۔ بیوی رومانی غزلیں گایا کرتی تھی اور وہ شیواز ریگل (ایک اعلیٰ قسم کی شراب) کی چسکیاں لے کر زندگی کے مزے لیا کرتا تھا۔ اس لیے بھی نہیں کہ وہ شوخ نگاہوں سے وسوندھرا کو جوانی کی اُن حسین یادوں کو بیان کرنے کو تر و تازہ کر رہا تھا بلکہ وہ وسوندھرا سے بے شرم ہو کر وہ باتیں بھی کریدنا چاہتا تھا جو میاں بیوی نہ کسی کو بتاتے ہیں اور نہ کوئی اُن سے پوچھتا ہے۔

وشوا اور وسوندھرا کی داستانیں ملتی جلتی ہیں۔ دونوں کی عمریں چالیس کے آس پاس ہیں۔ حالانکہ دونوں کی اقتصادی حالت میں عرش اور فرش کے درمیان کا فاصلہ مگر دونوں میں اس لیے

جذباتی وابستگی ہے کہ کبھی دونوں اپنے آپ کو فقیر سمجھتے ہیں تو کبھی ایک خوشحال جوڑا سمجھ کر پچھلے چھ سات برسوں سے دو جسم ایک جان سمجھے ہوئے ہیں۔ وشوا جنگلات کا ٹھیکیدار ہے جو جنگل کے ہر سربفلک درختوں سے نکالے گئے ریٹزن کا مالک ہے۔ ہر درخت میں ایک چیر لگا کر اس کے نوکر درختوں سے خون کی بوندوں کی طرح نکلے رس یا گوند کو ڈبوں میں جمع کر کے بند کنستروں میں شہر بھیجتے ہیں۔ اس لیے گرمیوں میں وشوا فقط سیر سپاٹے کے لیے جاتا رہتا ہے ورنہ اس کے باپ دادا نے اس کو ایسا خزانہ دیا ہے جس کو ہمیشہ بھرا پُرا رکھنے کے لیے سرسبز درخت سوکھ جاتے ہیں۔

وسوندھرا کا شوہر اس کا لانگری ہوا کرتا تھا مگر جب وہ ایک ریچھ کی مضبوط گرفت میں دم توڑ گیا تب وشوا اپنے مکان میں رہتا تھا لیکن کھانا وسوندھرا کے گھر سے آیا کرتا تھا۔ پھر جب وشوا کی بیوی کو کینسر ہو گیا تو وہ علاج کے لیے امریکہ بھی گیا مگر اس کی ڈوب رہی نبض کو بچاتے بچاتے وشوا خود بھی رنج وغم کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ تب وشوا کی بیٹی کی عمر سولہ سال تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کی دیکھ بھال بلکہ اس کی ماں اور باپ دونوں کا پیار دینے کی خاطر دوسری شادی نہیں کی بلکہ اس نے کلب جانا بھی چھوڑ دیا اور یار دوستوں سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ یعنی اُس نے اپنی زندگی کو ایک لکیر بنا دیا جو دو نقطوں کو جوڑ کر کھینچی گئی تھی۔ وہ کبھی گیروا کپڑے پہن کر سادھوؤں، سنتوں کی طرح باتیں کرتا۔ وہ جنگلوں میں اپنے کام کاج کا معائنہ کرنے کے بجائے سکون کے لمحات تلاش کرنے جایا کرتا تھا۔

وشوا اور وسوندھرا کا ملن ایک اتفاق تھا۔ اُس کی جیپ خراب ہو گئی تھی اور تقریباً چھ کلومیٹر پیدل چل کر جب وہ اپنے مکان کے قریب پہنچا تب وسوندھرا نے اس کو اطلاع دی تھی کہ اس کے مکان کا چوکیدار، اپنی ماں کی موت کی خبر سنتے ہی دو دن پہلے اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔

ایک تو لمبا پہاڑی سفر پیدل طے کر کے وشوا بہت تھک گیا تھا اور پھر شام کروٹ لے رہی تھی اس لیے رات کو اکیلے جانا خطرناک ہو سکتا تھا، کیونکہ اندھیرے میں ریچھ کو ٹارچ کی روشنی میں دیکھا نہیں جا سکتا اور یوں موت کو دعوت دینے والی بات سمجھ کر وہ وسوندھرا کے کچے مکان میں رات گزارنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ بیوی کی موت کے بعد خود بھی موت کو گلے سے لگا لیتا اگر اس کی اپنی پیاری بیٹی کا خیال نہ آیا ہوتا۔ وسوندھرا نے وشوا کی خوب عزت افزائی کی اور اپنے اپنے رنج وغم کو ظاہر کرتے کرتے وہ رات بھر باتیں کرتے رہے۔ وسوندھرا اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں اور وشوا اپنی مرحوم بیوی کے بارے میں ذکر کرتے رہے۔ دونوں اپنی والہانہ

محبتوں کا ذکر کرتے کرتے جذبات کی رو میں بہہ کر احساسات اور محسوسات کے ایک دوسرے سے ٹکرانے پر شروع میں چونک پڑے تھے لیکن دونوں پر اپنائیت کا اثر اس قدر حاوی ہوا کہ وشوا کی تھکان دُور ہوگئی تھی اور وسوندھرا کی نیند اُڑ گئی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں اپنی ماں کا انتظار کر رہی وسوندھرا کی بیٹی آدھی رات تک ادھ کھلے دروازے سے جھانک جھانک کر دونوں کو کبھی روتے ہوئے اور کبھی ہنستے ہوئے باتیں کرتے ہوئے دیکھ دیکھ کر اوب گئی اور سوگئی۔

باتوں کا سلسلہ شاید آدھی رات کو ختم ہوا ہوگا اگر ماں نے بیٹی کو گہری نیند سوتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا۔ دراصل اس کو وشوا نے ہی بیٹی کے تذبذب اور وسوسوں کی قیاس آرائی کر کے بیٹی کے کمرے میں جانے کے لیے کہا تھا اس بات کا حوالہ دے کر کہ وہ خود جب تک اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُس کو کوئی لطیفہ یا کوئی دلچسپ طلسماتی کہانی نہیں سناتا وہ سو نہیں پاتی۔ گویا وشوا اور وسوندھرا کی حالت ایک جیسی تھی۔ دونوں کی بحث کا موضوع یا تو ان کے بچھڑ چکے شریکِ حیات تھے یا پھر ان کی بیٹیاں! وشوا کی بیٹی کی بیماری کا ذکر یا پھر وسوندھرا کی بیٹی کی شادی کی فکر۔ دوسری شادی کر لینے کے لیے دونوں ہم خیال تھے۔ یعنی سوتیلی ماں بن ماں کی بیٹی کا باپ بھی چھین لیتی ہے جبکہ سوتیلا باپ بھی بن باپ کے بیٹی کی ماں کو اپنی جائیداد سمجھ کر کبھی کبھی وحشیانہ سلوک کرتا ہے۔

اپنی بیٹیوں کے بارے میں دونوں ایک جیسے خدشات ظاہر کرتے ہوئے نظر آتے تھے، دونوں کانپ اُٹھتے تھے اور باتوں کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کرتے تھے جہاں وہ لرز کر چھوڑ دیتے تھے۔ کب اور کیوں ایک کمزور لمحے کا شکار ہو کر وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ پھر چمٹ گئے یہ شاید ان کو خود بھی معلوم نہ تھا۔ یہ نہ کوئی واقعہ تھا اور نہ کوئی حادثہ بلکہ یہ ایک صدمہ تھا جس کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر یہ سوچ رہے تھے کہ جب ان کی بیٹیاں اس المیہ کے بارے میں جان جائیں گی تو کیا ہم نوحہ خوانی کریں گے یا وہ مرثیہ پڑھیں گی۔ دونوں کو اپنے گنہگار ہونے کا شدت سے احساس تھا۔ خاص طور پر وشوا کو یہ خدشہ کرید رہا تھا کہ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد وہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو ایک بزرگ سمجھنے لگا تھا اور اپنی ہم عمر عورتوں کو بھی بیٹی سمجھنے لگا تھا یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنی زندگی کا رنگ ہی بدل دیا تھا بلکہ رُوپ بھی، وہ پانچ ستارہ ہوٹلوں کے ہیر ڈریسر (Hair Dresser) کی بجائے معمولی حجاموں سے بال کٹواتا تھا۔ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اپنی لاڈلی بیٹی کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ ایک باپ سے زیادہ ایک

سیانی دادی کی طرح۔ وسوندھرا کو بھی اس بات کا بہت دُکھ تھا کہ جس لاڈلی بیٹی کے لیے اس نے اپنی تمام خواہشیں ایک بیوہ کے آنچل میں چھپا کر رکھی تھیں وہ ہوا کے ایک جھونکے سے اُڑ کر اُس کی بیٹی کے سامنے گر چکا تھا۔ دونوں کو سوچتے سوچتے رات کے آخری پہر آنکھ لگ گئی تھی اس لیے جب آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ وشوا اور وسوندھرا دن بھر ایک دوسرے سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ نہیں پائے تھے۔

جیپ ٹھیک ہو جانے تک گاؤں میں رہنا ضروری تھا اس لیے وشوا کو چند دن وسوندھرا کے گھر میں ہی رہنا پڑا تھا۔ شرم وحیا کے لیے انسانوں نے مختلف سانچے تیار کیے ہیں مگر زندگی گزارنے کے لیے قدرت نے کچھ ایسے قانون بنائے ہیں جو کہیں بھی لکھے نہیں گئے ہیں مگر انسان خود ہی ملزم، خود ہی وکیل اور خود ہی منصف بن کر فیصلہ کرتا ہے۔ ویسا ہی فیصلہ وشوا اور وسوندھرا نے کیا تھا غالباً دونوں نے ایک دوسرے میں شریکِ حیات کی جھلک دیکھ لی تھی یا تصورات کی حسین دنیا میں ساتھ ساتھ چل کر محسوس کی تھی۔ اور دونوں اس خواب کو ٹوٹنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لیے شام نے جونہی کروٹ لی وسوندھرا اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر وشوا کے کمرے میں آبیٹھی اور اپنی بیٹی کو وشوا کی زبانی اُس کے مرحوم باپ کے دلچسپ قصّے سناتی رہی۔ کھانا کھا کر ماں بیٹی دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے تو وشوا سمجھ بیٹھا کہ وسوندھرا کے دل میں اس کے لیے نفرت نہیں بلکہ عزّت ہے۔ مگر آدھی رات کو جب وسوندھرا وشوا سے لپٹ گئی تب دونوں کو یہ احساس ہوا کہ دونوں ہم عمر ہم سفر بن کر ایک دشوار اور لمبا سفر طے کرنے کے لیے ایک دوسرے کو سہارا دیں تب تاریکی میں بھی چراغ جل اُٹھیں گے۔

پھر کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ وشوا مہینے میں ایک بار اپنے ملازموں کو تنخواہ دینے جایا کرتا تھا اور دو تین راتیں وسوندھرا کے گھر میں رہا کرتا تھا۔ گاؤں والوں کو دونوں کے اچھے کردار کے بارے میں معلومات تو تھیں پھر بھی جب کوئی وسوندھرا کو داشتہ کہہ دیتا تو گاؤں والے ایسی بے ہودہ باتوں کو نظر انداز کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ وشوا اور وسوندھرا ہر بار چند پُر کیف لمحات کے لیے چالیس سال کی عمر میں بھی کامدیو اور رتی کا رومانی رقص تو کیا کرتے مگر وشوا کی بیٹی کے علاج کے بارے میں یا پھر وسوندھرا کی بیٹی کی شادی کے بارے میں رات بھر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ پھر اچانک گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ وشوا اپنی بیٹی کے آپریشن کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے۔ وسوندھرا نے اس دوران اپنی بیٹی کے لیے ایک لڑکا تو دیکھ لیا تھا مگر لڑکے کی ضد تھی کہ وشوا اپنے رسوخ سے یا

رشوت دے کر اس کو فاریسٹ گارڈ دے۔ وسوندھرا وشوا کی بیٹی کی صحت کے بارے میں فکرمند تو تھی مگر اس کو اپنی بیٹی کے بارے میں زیادہ پریشانی تھی۔ اس لیے نہیں کہ شادی کا خرچ اٹھانے کے لیے روپے نہیں تھے بلکہ جب سے اس کے شوہر کی موت ہوئی تھی تب سے وشوا اپنے لانگری کی بیوہ کو اس کی تنخواہ دے رہا ہے بلکہ وشوا نے اس کے لیے جہیز بھی خرید رکھا ہے۔

اِدھر کئی دنوں سے برف باری ہو رہی تھی۔ وسوندھرا نے دن گن گن کر رکھ دیے تھے۔ پورے چار سو دس دن کے بعد جب اس نے وشوا کو دیکھا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ وشوا کا بدلا رُوپ دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اس کی بیٹی ٹھیک ہو گئی ہو گی۔ وہ معنی خیز نظروں سے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اُن لمحات کا انتظار کرتی رہی کہ کب وہ اپنی بیٹی کے ٹھیک ہونے کی خبر سنائے تاکہ اپنی بیٹی کی شادی کی بات چھیڑ کر خوشیوں کو دوبالا کر سکے۔ مگر اس بار وشوا اپنی عمر سے بیس سال چھوٹا لگ رہا تھا بلکہ وہ باتیں بھی ویسی کر رہا تھا جو وسوندھرا کو جھٹکے دے رہی تھیں وہ جو ہر بات کو اپنی بیٹی سے جوڑ کر باتیں کرنے کا عادی تھا اس بار اس کا ذکر تک نہیں کر رہا تھا۔

آخر شام نے کروٹ بدلی اور جب وسوندھرا دیسی شراب لے کر آئی اور وشوا اسکاچ وہسکی کی چسکیاں لیتے ہوئے یہ کہنے لگا کہ وہ اس بار ماضی کو بھول کر ان کو اپنے ساتھ لینے آیا ہے وسوندھرا سمجھ بیٹھی کہ بیٹی کے ٹھیک ہونے کے ساتھ اب ایک نئی زندگی کی شروعات دوسری شادی سے کرنا چاہتا ہے۔ وسوندھرا نے نہایت رومانی انداز میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہی کہ وہ وسوندھرا کے ساتھ شادی کر رہا ہے کیا، لیکن وشوا نے مسکرا کر کہا کہ وہ اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے، وسوندھرا کو یہ سن کر یوں لگا جیسے برف کی چادر اُوڑھ کر سو رہی زمین پر بلڈوزر (Bulldozer) برف کے ساتھ اس کو بھی چھیل رہا ہے۔

وسوندھرا نے جب وشوا سے اس کی بیٹی کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو وشوا ایک بچے کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے بولا کہ اس نے اپنی جان سے پیاری بیٹی کا امریکہ میں آپریشن کروالیا تھا۔ مگر اس کو بچا نہ سکا۔

وسوندھرا کو یوں لگا گویا اس کے گناہ کی سزا اُس کی بیٹی کو مل گئی ہو۔

OO

ایک انوکھی عدالت

ملزم کا جرم ثابت ہو گیا تھا اور وہ ملتجی نظروں سے عادل، جیوری کے ممبران، وکلا اور عدالت میں موجود لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مگر ان میں کوئی بھی اس کو نہ دیکھ رہا تھا اور نہ سن سکتا تھا! وجہ یہ کہ ان سب کی آنکھوں پر پٹی ہے جبکہ اس کے منہ پر ایک پٹی باندھ دی گئی ہے۔

چونکہ کوئی اس کو دیکھ نہیں پاتا ہے وہ عادل کے فیصلے کی ہاں میں ہاں ملائے جانے کے پُر جوش شور کی آڑ میں کھسک کر بھاگ گیا ہوتا مگر پاؤں میں ڈالی گئیں زنجیریں اس کو مشکلاً کھڑا رہنے کی رعایت دے رہی تھیں!

یوں تو ہر عدالت میں ایک ہاتھ میں انصاف کی ترازو لیے ایک بے جان مجسمے کی آنکھوں پر پٹی نظر آتی ہے مگر یہ ایک انوکھی عدالت تھی جہاں نرالے طریقے سے ہر مقدمے کی کارروائی ہوتی رہتی ہے۔ یعنی عادل جرم کی تفصیلات دے کر جرم کو ثابت کرتا ہے اور پھر مجرم کو سزا دینے سے پہلے عدالت میں موجود بھی لوگوں سے پوچھتا ہے۔ ملزم مجرم ہے نا؟ اور دستور کے مطابق عادل کے سوال یا سوالات کا جواب 'ہاں، ہاں' یا پھر 'نہیں نہیں' میں دینا ہوتا ہے۔ آج بھی عادل نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

''ملزم رات کو چھریاں تیز کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور وہ خود بتا چکا ہے کہ اُس کا کرفیو کی وجہ سے سحر کے وقت گھر سے نکل کر کام کو سرانجام دے کر صبح سویرے اپنے گھر لوٹنے کا ارادہ تھا تا کہ محلّے والے تو کیا پڑوسی بھی یہ نہیں جان پائیں کہ وہ ایک گناہ اور ایک جرم کر کے آیا ہے! اس لیے ملزم مجرم ہے یا نہیں۔ ہاں یا نہیں میں جواب دیجیے''۔ 'ہاں ہاں' کی گونج سے ایوان میں صوتی ووٹنگ سے ایک قرارداد پاس ہونا ہی تھا مگر ایک چیخ کے ساتھ 'نہیں، نہیں' کے شور نے اس کو دبوچ لیا۔ یہ دردناک آواز نسوانی تھی!

گویا عدالت میں زندگی نے وقت کو چونکا دیا تھا! یہ انوکھی عدالت مہاراجا وِکرما دتیہ کی

عدالت نہیں ہے جہاں عادل کا الہام ہی خدا کا فیصلہ ہوا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ صدیوں بعد بھی اُس جگہ جہاں ان کا تخت ہوا کرتا تھا وہاں اگر کوئی ناسمجھ بھی بیٹھ کر کسی پیچیدہ مقدمے کا فیصلہ سنایا کرتا تھا وہ صحیح ہوا کرتا تھا۔ یہ انوکھی عدالت نہ تو نوشیرواں کی عدالت ہے اور نہ مغل بادشاہ کی وہ عدالت ہے جہاں زنجیر کھینچ کر عدلِ جہانگیری سے انصاف مل سکتا ہے۔ نہ مغل اعظم کی انصاف کی ترازو ایک انگوٹھی کے وزن (بوجھ کہا جائے تو بہتر ہے) سے ہل کر ایک اصول پرست شہنشاہ کو اپنے ہی فیصلے پر نظرثانی کرنے پر مجبور کرسکتی تھی۔

اس انوکھی عدالت کی نہ تو کوئی ہسٹری ہے اور نہ کوئی جغرافیہ! نہ تو کوئی مستقل جج ہوتا ہے اور نہ رجسٹرڈ وکلا ہوتے ہیں۔ اگر ہوں بھی تو وہ نہ جرح کرتے ہیں اور نہ اپیل کرتے ہیں۔ نہ تو گواہوں کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ثبوتوں کی نمائش یا ان پر کوئی بحث ہوتی ہے۔

دراصل یہ انوکھی عدالت دوسرے جہاں کی عدالت بھی نہیں ہے جہاں نیکی اور بدی کا فیصلہ آسمان پر بیٹھے دونوں جہاں کا مالک سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر عذاب کرنے والوں کو سزا اور ثواب کے کام کرنے والوں کو جزا دیتا رہتا ہے

اس انوکھی عدالت کا عادل ایک پارٹی کا رُکنِ اعلیٰ ہوتا ہے اور یہ عدالت تب ہی وجود میں آتی ہے جب فسادات ہو رہے ہوں۔ اور غداروں اور دوسری قوم یا ذات کے قاتلوں کو جنگی قیدیوں کی طرح دبوچ تو لیا جاتا ہے مگر دستور کے مطابق ان کے زخموں پر مرہم لگانے کی بجائے ان پر فوری طور پر مقدمہ چلا کر سزائے موت دینے کی خاطر! وہ بھی اس لیے کہ سند رہے یا پھر عبرت ہو۔ پھر مجرم کی آنکھوں پر کالے رنگ کی پٹی لگانے کی بجائے گلے میں پھندہ ڈالا جاتا ہے اور یہ عبرت ناک منظر اپنی ایک ہی رنگ کی پٹیاں اُتار کر دیکھ لیتے ہیں۔ بے چارہ ملزم اپنے الزام کے بارے میں بے خبر ہے مگر پُراسرار ماحول کو دیکھ کر وہ اپنے انجام سے باخبر ہے۔ ارد گرد چہروں کے جنگل میں اس کی ملتجی نگاہیں اگر کسی ایک کی نظروں سے ٹکرا جاتیں تو شاید وہ آنسوؤں سے اپنی روداد سنا دیتا مگر ہر چہرہ نمائش میں رکھے ہوئے مجسمے کی طرح تھا۔ ہاں مگر ایک عورت کی آنکھوں پر بندھی پٹی کے نچلے حصے کو تر ہوتے دیکھ کر اس کو یوں لگ رہا تھا کہ چہروں کے جنگل میں یہ چہرہ کسی ہمدرد کی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ اس لیے اس کی نگاہیں اسی عورت پر جمی ہوئی تھیں اور وہ بار بار عورت کو اپنی بیوی سمجھتا رہا۔ مگر اس کی خالی گود دیکھ کر اس کو زبردست غصہ بھی آتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر کہ کہیں ایک ماہ کی بچی کو فسادیوں نے مار تو نہیں ڈالا ہوگا؟ یا پھر اس کی بیوی نے بچی کو اس کے

دشمنوں کے سپرد کر کے اپنے شوہر کی زندگی کا سودا تو نہیں کیا ہوگا! بچّی کا خیال آتے ہی گزر چکی رات کا وہ واقعہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا اور وہ لرز اُٹھا۔

ہوا یوں تھا کہ وہ اور اس کی بیوی اپنے گھر میں سوئے پڑے تھے۔ آدھی رات کو کسی نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دروازے کھولا تو ایک عورت نے ایک نونہال کو گود میں دکھا کر ان سے پناہ مانگی مگر اس سے پہلے کہ میاں بیوی اس کو گھر کے اندر لے آتے عورت نے اس کا تعاقب کرنے والے فسادیوں کے قریب آنے کی آہٹ سن لی تھی۔

عورت اپنے کیچڑ سے لت پت پلو سے بچّی کے کپڑوں کو گندا کر کے اس کو بیوی کی گود میں ڈال کر اندھیرے میں غائب ہوگئی تھی! وہ عورت کون تھی؟ کیا وہ سچ مچ کرفیو کی وجہ سے ڈاکٹرنی کا گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے انجانی گلیوں میں چلتے چلتے راستہ کھو کر، بھٹکتی ہوئی، فسادیوں کی گرفت سے مشکلاً شام سے آدھی رات تک گرتی سنبھلتی، بارش میں بھیگتی ہوئی اپنے بیمار بچّے کو گود میں اُٹھا کر بھاگتی رہی تھی۔

بچّہ بیمار تو تھا لیکن اس کی بیوی کو ڈر تھا کہ اگر صبح سویرے پڑوسیوں نے یہ پوچھا کہ تم تو حاملہ تھی نہیں پھر یہ بچّہ کس کا ہے تو کیا کہا جا سکتا ہے؟ مگر اس سے پہلے کہ وہ جھوٹ کو سچ بنانے کی خاطر کوئی بہانہ تراشتے عورت کا تعاقب کرنے والے دستک دے کر گھر کے اندر چلے آئے تھے اور میاں بیوی کی باتوں پر یقین کر کے کہ وہ بچہ ان کا اپنا بچّہ ہے وہ فوراً چلے گئے تھے یہ سوچ کر کہ عورت دُور نہ چلی جائے!

ان کے جانے کے بعد جب میاں بیوی یہ جان گئے کہ مہمان بچہ نہیں ایک بچی ہے تب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔ پھر بچّی کے اوپر لحاف ڈالنے کی خاطر جب بیوی نے سرہانے کے نیچے سو سو کے دو نوٹ دیکھے تب وہ چونک پڑی! وجہ یہ کہ جب ان کی دکان کرفیو اور فسادات کی وجہ سے چار دن سے بند ہے تب یہ روپے کہاں سے آ گئے؟ بیوی کے تجسّس کو دیکھ کر شوہر ہنس کے بولا تھا۔

''یہ تو پیشگی ہے! کام ہو جانے کے بعد چار سو روپے مل جائیں گے۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنی چھریاں تیز کر رہا تھا جب چند فسادی کمرے میں روشنی دیکھ کر ایک طوفان کی طرح گھروندے میں داخل ہو گئے تھے اور چھریوں کی تیز دھار دیکھ کر، خرافات بکتے ہوئے اس کو گھسیٹ کر لے گئے تھے۔

شوہر نے جب پیشگی دینے والے کا نام اور پتہ بتا دیا اور التجا کی کہ وہ اپنے وعدے کو پورا کر کے اپنے ماتھے پر بے ایمانی کا داغ نہیں لگانا چاہتا ہے، تب نقاب پوش افراد کا شک یقین میں

بدل گیا اور گالیاں دیتے ہوئے یہ کہتے رہے کہ چالاک شکاری اب گولیاں نہیں چلانا چاہتا ہے۔ ہمارے آدمی کا گلا کاٹ کر بے آواز شکار کرنا چاہتا ہے! ہم بھی تمھیں بے آواز موت دے کر شور کریں گے کہ ہمارے دشمن نے ہمارے ایک معصوم ساتھی کو وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیا۔

اس لیے وہ عدالت کے کمرے میں داخل ہوا تھا تب وہ یہ نہ جانتا تھا کہ اس کو اسی کی چھری سے ایک بکرے کی طرح ذبح کر دیں گے۔ مگر عورت نے جب آنکھوں سے پٹی ہٹا کر ایک 'نہیں' کہا تو عادل نے ڈراؤنی آواز میں کہا۔

''ملزم مجرم ہے! چھریاں تیز کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ یہ لوگ ہمیں بکرا بولتے ہیں۔ یعنی شکار کو بکرا کہہ کر فخر سے کہتے ہیں کہ آج دس بکرے کاٹ دیے۔ بولو! ملزم مجرم ہے یا نہیں'' ایک بار پھر 'مجرم ہے'، 'مجرم ہے' کی آواز گونج اُٹھی۔ عادل نے فیصلہ سنا دیا۔ ''قتل کر دو غدار کو۔ جو اپنی قوم سے دغابازی کرے وہ آستین کا سانپ ہے، اس کو مار ڈالنا ثواب کا کام ہے۔''

ملزم جس عورت کو اپنی بیوی سمجھ رہا تھا وہی عورت آدھی رات کو اس کی بیوی کی گود میں اپنی بچی ڈال گئی تھی۔ ملزم تذبذب میں پڑ کر عورت کو ملتجی نظروں سے دیکھتا رہا۔ عورت چلّانے لگی تو عادل کو 'ابّا' کہہ کر بولتی رہی اور اس کی آواز پہچان کر پہلے عادل نے اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی اور پھر ایک ایک کر کے سبھی نے آنکھوں پر لگی پٹی ہٹا دی۔

عورت بولتی رہی: ''یہ شکاری نہیں ابّا! شکاری ہوتا تو خود گھر میں آئی ایک بے سہارا عورت کو دبوچ لیتا، اس کی بیمار بچی کو اپنے سینے سے لگا کر ماں کو اندھیرے میں چھپ کر اپنی عزت و آبرو بچانے کا موقع نہ دیتا۔ ماں جہاں بھی چھپ جایا کرتی تھی غنڈے بچے کے رونے کی آواز سن کر اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ صبح جب ماں اپنی بیٹی کو لینے گئی تھی تب اس فرشتے کی بیوی نے اس کی داستان سنائی...

''ابّا! یہ شخص ایک غریب قصائی ہے اور وہ شخص جس کے گھر وہ سحر کے وقت اپنی تیز چھریاں لے کر جا رہا تھا وہ اپنے طویل عرصے سے بیمار بیٹے کی صحت یابی کی خاطر کسی درویش کے مشورے پر ایک کالے بکرے کی قربانی دے رہا تھا...

''وہ شخص بھی غصّے سے اُبل کر شاید اس فرشتے کو جان سے مار ڈالتا۔ یہ سب میں اس لیے جانتی ہوں کہ وہ عورت آپ کی بیٹی ہے ابّا! اور جو لوگ میرا پیچھا کر رہے تھے وہ یہاں اس انوکھی عدالت میں موجود ہیں...

''وہ تو ہمارے اپنے تھے۔ بلکہ آپ کے داماد کے اِرد گرد آگے پیچھے بیٹھے رہتے ہیں اکثر۔ آگ آپ نے لگادی اور وہ اپنے ہاتھ سینک رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر عورت نے ملزم کے منہ سے ٹیپ ہٹا کر اس سے ہم کلام ہو کر کہا: ''ہم ملزم بھی نہیں ہیں تو مجرم کیسے ہو سکتے ہیں۔''

پھر دونوں نے ان لوگوں کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا: ''مجرم یہ ہیں! یہ دونوں ہمارے ہم مذہب ہیں۔'' اچانک عدالت میں موجود سبھی مرد اور عورتیں کھڑے ہو کر چلانے لگے: ''تو یہ ہیں قوم کے اصلی دشمن؟''

''ایسے مجرم مذہب کو بدنام کرتے ہیں۔''

''ایسے مجرموں کو کیا ہماری انوکھی عدالت کو سزا دینی چاہیے؟

''ہاں!'' عادل بھی غصّے اور نفرت کے ملے جلے تاثرات سے چلاّنے لگا تو پھر 'ہاں! ہاں!' کی آواز گونجتی رہی!

○○

ایک اور ایجاد

میں کہاں تھا یہ مجھے یاد ہے!

ہمالیہ پربت کی ایک اونچی چوٹی پر بے آواز سرد ہواؤں نے میری انگلیوں میں لرزش پیدا کر کے مجھ سے میرے اعتقاد کی لاٹھی چھین لی تھی اور میں تذبذب اور تجسس کا شکار ہو کر اُس لمحے کا انتظار کر رہا تھا جب میرا ہم سفر اپنی پُر اسرار وڈراونی خاموشی توڑ کر مجھے یہ بتا دے گا کہ اس کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک کیوں نظر آ رہی ہے جبکہ میری نظر دُھندلانے لگی تھی۔

ہم دونوں ایک دُشوار پہاڑی پر سفر طے کر رہے تھے۔ میں اعتقاد کے بھروسے پر چل رہا تھا حالانکہ قدم قدم پر میری پھولتی ہوئی سانسیں میرے پھیپھڑوں کو گرید کر میری چھاتی کو دو پھاڑ کر دینے کی صدائیں سنا رہی تھیں مگر میں پھر بھی اُس سر بفلک برفیلی چوٹی کی طرف جا رہا تھا جہاں مجھے بھگوان شنکر کے درشن کرنے کی اُمید تھی۔ میں اُس سے اپنی بیٹی آشا، جو میری زندگی ہے، بلکہ اس صدی کی اُمید بھی ہے، کے لیے اَمر ہو جانے کے واسطے آبِ حیات حاصل کرنے نہیں جا رہا تھا بلکہ حیات کے لیے آب کی چند بوندیں مانگنے جا رہا تھا تاکہ آشا کے سوکھے ہونٹوں کو تَر کر سکتا!

میری آشا ایک ایسے اُجڑے دیار میں آخری سانسیں لے رہی ہے جہاں کا قطرہ قطرہ آب یزیدوں نے پی لیا ہے یا پھر کوئی راکھشس یہاں کی سب سے بڑی اور گہری جھیل کا پانی چوس گیا ہے۔ اس جھیل کے صاف وشفاف پانی میں شیش ناگ پر براجمان بھگوان وشنو کی نابھی سے ایک خوبصورت کمل کا پھول نکلتا تھا اور وہ دنیا بنانے والے بھگوان برہما کا آسَن ہوا کرتا تھا! ہم جہاں رُک گئے تھے وہاں سے جب میں نے پلٹ کر دیکھا تھا تو یوں لگا تھا جیسے میں اور میرا ہم سفر آسمان سے زمین کو دیکھ رہے تھے۔ مگر اتنی بلندی پر آ کر بھی مجھے وہ چوٹی جس پر بھگوان شنکر مجھے درشن دے سکتے تھے، چاند سے بھی دُور نظر آ رہی تھی۔ میرے ہم سفر نے جب خاموشی توڑ کر مجھے شوشنکر کے درشن کیے بغیر اپنے دامن میں جمع کیے ہوئے چند منجمد آب کے ٹکڑے دکھا دیے تھے تو میں نے سوچا

تھا کہ یہ موتی جیسے ٹکڑے اگر میں اپنے ہم سفر سے چھین کر لے جاؤں اور بھگوان سے ایک بادلوں کا اُڑن کھٹولہ مانگ کر اپنی بیٹی آشا کے پاس چلا جاؤں تو اس کے ہونٹوں پر آب رکھ دوں تو مٹی مٹی کے ساتھ، ہَوا ہوا کے ساتھ، آگ آگ کے ساتھ اور آب آب کے ساتھ مل کر پھر زندگی کو ہرا بھرا کردے گی۔ مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کر پاتا پھر ویسی ہی ڈراؤنی خاموشی چھا گئی۔ وہ خاموشی جو کسی آنے والے طوفان کی اطلاع نہیں دے رہی تھی بلکہ کسی بھیانک طوفان کے گزرنے کے بعد جیسی چھائی خاموشی بھی نہیں تھی۔ قہرِ آدم کے بعد ہیروشما اور ناگاساکی میں چھائی خاموشی جیسی بھی نہیں تھی۔ سومالیہ میں قحط کے بعد چھائی خاموشی جیسی بھی نہیں تھی۔ وہ خاموشی مجھے جہاں بہرے پن کا احساس دلا رہی تھی وہیں اپنے اِرد گرد ہو رہی سنسنی خیز کارکردگی اپنی بھرائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ اس وقت میں کہاں ہوں اور اپنی آشا سے کتنا دُور آچکا ہوں۔

نظر دُھندلا تو گئی ہے مگر میرا ہم سفر بھی یہاں موجود ہے۔ یہ دیکھ رہا ہوں! میری طرح آکسیجن ماسک (Mask) لگا کر وہ کیا کر رہا ہے میں جان نہیں پاتا ہوں!

یہ کون سی جگہ ہے، کوئی تو بتادو دنیا والو؟

یہ جگہ کسی اسپتال کا آئی سی یو (I.C.U) ہے یا کسی تجرباتی لیباریٹری کا حصّہ ہے؟

میں زمین پر ہوں، پاتال میں ہوں یا خلا میں ہوں؟ کچھ تو بتادو ہم نسلو! کم از کم یہ تو بتادو میرے ہم عصرو! کہ مجھے یہاں کون لایا ہے؟ مجھے چرا کر لایا گیا ہے! اِغوا کرلیا گیا ہے! یا میں بھی کسی خاقان کی فتوحات کا حصہ ہوں؟ میرے ہم سفر! تم جب بھی خاموشی توڑ دیا کرتے تھے کچھ نہ کچھ بتا کر مجھے نہ صرف چونکا دیا کرتے تھے بلکہ اپنے اعتماد اور عقل سے حاصل کیے گئے چمتکاروں اور ایجادوں کے بارے میں کبھی ہنسایا کرتے تھے کبھی ڈرایا کرتے تھے اور کبھی رُلایا کرتے تھے۔ اس بار خاموشی توڑ کر بس اتنا بتائے کہ جب پہاڑوں پر بادل نہ تھے، نہ آسمان میں بادلوں کے ٹکڑے آوارہ گردی کرتے ہوئے نظر آرہے تھے، نہ دور سے کوئی بارش یا برف کا طوفان آیا تھا، نہ اونچی چوٹیوں سے برف کے تودے کھسک کر ہمارے اردگرد گرے تھے، نہ سرد ہواؤں میں نمی تھی۔ پھر وہ پانی کی بوندیں کہاں سے آئی تھیں جن کو منجمد ہوتے ہی تم سمیٹ لیا کرتے تھے؟ کیا وہ میرے پربھو کا ایک معجزہ تھا یا پھر کسی ساحر کا سحر؟ کہیں وہ تمھاری ایجاد کا ثبوت تو نہیں تھا؟

کاش کوئی میرے کسی ایک سوال کا جواب دے پاتا!

کوئی جواب دے بھی تو شاید میں بہرہ ہو گیا ہوں!

نہیں نہیں، میرے اعتقاد کے مطابق انسان مر کر بھی تب تک سب سن لیتا ہے جب تک جسم مٹی کے ساتھ نہیں مل جاتا ہے۔ تبھی تو چتا کو آگ دکھانے سے پہلے مُردے کے کانوں کے پاس ایک مٹکا توڑ کر آتما کو جسم سے آزاد کیا جاتا ہے!

مگر میں تو زندہ ہوں جبھی تو رو رہا ہوں!

کہیں میں گونگا تو نہیں ہو گیا ہوں؟

دھرتی ماں کی طرح! جو بارود سے چھلنی ہو کر بھی کچھ بولتی نہیں ہے۔ پیاسی ہو کر بھی آسمان پر بیٹھے خدا اور اس کے اَن گنت دیوی دیوتاؤں سے پانی نہیں مانگ سکتی۔ گونگی ہے نا؟ جبھی تو!

لیکن جب میں بول سکتا تھا یعنی میرا ہم سفر میری باتیں سن لیتا تھا تب میں نے دنیا بنانے والے سے اپنی آشا کے لیے نہ نئی زمین مانگی تھی نہ نیا آسمان مانگا تھا۔ میں نے اُس سے اپنی زندگی کے لیے دو بوند پانی مانگا تو تھا! مگر اس نے اپنی ہی کائنات پر ستم کرنے والے شیطان کو میرے دیار کی ایک متبرک جھیل کو برباد کرنے سے روک دیا ہوتا تو بات کچھ اور ہوتی!

میں نے ایک مقصد کی خاطر اپنے دوسرے مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنا سفر جھیل کی خشک تہہ پر چل کر شروع کیا تھا اور جھیل کی بدصورت خشک تہہ پر چلتے چلتے مجھے ایک بدیشی اجنبی مل گیا تھا!

میں نے اس کو جب یہ بتایا تھا کہ کبھی ہم سردیوں میں گہری جھیل کی جمی ہوئی تہہ پر کھیلا کرتے تھے تب وہ حیران ہونے کی بجائے مسکرا کر بول پڑا تھا۔ 'لوگ سمجھتے ہیں کہ پانی پر رشی منی ہی چل سکتے ہیں! بلکہ یہ بھی نہیں مانتے ہیں کہ پانی کو تلوار سے کاٹا جا سکتا ہے اور پانی بھی جم کر تیز تلوار کی طرح خون بھی بہا سکتا ہے'۔ اس کی دلچسپ باتیں سنتے سنتے ہم نے ہم سفر بن کر جھیل سے ہی اپنا سفر شروع کیا تھا۔ میں جھیل میں وہ جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں کمل کے پھول ہوا کرتے تھے۔ یہ سوچ کر کہ زمین کھو کر وہ متبرک کمل کا پھول نکال سکوں جس پر تین سروں والے بھگوان برہما بیٹھے ہوں گے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مل گئے تو مجھے خوشحالی کے بھگوان وشنو مل جائیں گے۔ وہ مل گئے تو بات ہی اور ہو گی۔

ان کے حکم سے بارش ہو گی، برف باری ہو گی، اولے پڑیں گے اور جھیل پھر بھر جائے گی! حیات کو آب ملے گا اور میری بیٹی آشا کے سوکھے ہونٹ تر و تازہ ہوتے ہی وہ جھومتی گاتی میرے سینے سے لگ جائے گی! وہ میرے دل کی دھڑکن بن جائے گی اور میں ٹِک ٹِک کر کے زندگی کے لمحات کو آگے لیتا جاؤں گا۔ موسم بدلتے رہیں گے، رنگ اور بو بدلتے رہیں گے اور ویسا ہی ہوتا

رہے گا جیسا لاکھوں صدیوں سے ہوتا رہا ہے یعنی آشا زندگی ہے اور میں وقت ہوں!

آشا سے میں بہت پیار کرتا ہوں!

جنم جنم سے! اس لیے نہیں کہ وہ میری بیٹی ہے بلکہ وہ کبھی میری پڑدادی، پڑنانی، دادی، نانی ماں، موسی، پھوپھی، بہن اور بیٹی کے رُوپ میں جنم لیتی ہے۔ پھر مر جاتی ہے اور ہمارے عقیدے کے مطابق پھر جنم لیتی ہے۔ سوچ کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب کر ایک ہی بات سمجھ نہیں پا تا تھا۔ وہ یہ کہ کیا وقت تھم جائے گا اور زندگی فنا ہو جائے گی؟

دراصل میں اپنے اور اپنی آشا کے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا نا؟ میری کیفیت بھانپ کر میرا ہم سفر مجھے بار بار اپنائیت کا احساس دلا کر سمجھایا کرتا تھا اور وہ بھی مجھے ہم نسل، ہم عصر، ہم نفس، ہم نوا کے القاب سے نواز کر نہایت حلیمی سے کہتا رہتا تھا کہ اگر میں جوں توں اس چوٹی پر پہنچ پاؤں جہاں بھگوان شنکر براجمان ہیں اور یہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ پاؤں کہ انھوں نے اپنے بالوں سے نکل رہی پانی کی دھارا کو روک دیا ہے۔ تب کیا ہوگا؟

''ہوسکتا ہے کہ وہ تمھاری اُمید پر پانی پھیر دینے کی بجائے تمھیں تمھاری آخری سانس لے رہی بیٹی آشا کو پانی کی دو بوندیں دینے کی بجائے تمھیں امرت کا کُنڈ ہی دے دیں، مگر تم وہاں پہنچ کر زندہ رہو گے تب نا؟ جانتے ہو پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں پر آکسیجن نہیں ہوتی ہے! بھگوان کو نہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے نہ آکسیجن کی، بلکہ آب کی بھی نہیں! آب سے پیدا ہونے والی ضروریاتِ زندگی کی بھی نہیں! مگر تمھیں تو ضرورت ہے ان سب کی۔ ہے نا! مگر یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ خلد سے نکالے جانے کے بعد حضرت آدم نے صرف زمین پر آب دیکھ کر، زندگی کا ہرا بھرا چہرہ دیکھ کر ہی اس سیارے پر قدم رکھا ہوگا ورنہ اور بھی سیارے تھے زمین کے سوا۔ تھے نا؟ اگر اُس نے تب ریگستان کا شیطانی فریب یعنی سراب دیکھا ہوتا تو؟ تو بات اور ہوتی! ہوتی نا...

''اگر اُس نے تب پہاڑوں کو انسانی دماغ سے پیدا شدہ آنچ سے برف کی چادر اُتارتے ہوئے یا گلیشیروں کو پگھل کر بھاپ بنتے دیکھا ہوتا تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...

''اُس نے اگر موسم بہار میں خزاں آلودہ درختوں کی شاخیں دیکھی ہوتیں تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...

''اگر اُس نے موسم برسات میں سوکھے ندی نالے، دریا اور جھیل خشک ہوتے ہوئے دیکھ لیے ہوتے تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...

''اُس نے اگر کسانوں کو اپنے کھیتوں میں ہل چلا کر بیج بونے کی بجائے ان ہی کھیتوں میں فوجی جوانوں کو بارودی سرنگیں بچھاتے ہوئے دیکھا ہوتا تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...

''اگر آدم نے بحیثیت اشرف المخلوق روپہلی سمندر کی لہروں کو تیل کی تہہ کے نیچے دَب جاتے دیکھا ہوتا اور آبی جانداروں کو گھٹن سے مرتے ہوئے دیکھا ہوتا تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...

''ضرورت کو ایجاد کی ماں سمجھا جاتا ہے کیونکہ کھوج جب ضرورت پوری نہ کر سکے تب ایجاد کا بیج انسان کے دماغ میں داخل ہو جاتا ہے! گویا ماں کی کوکھ میں بیٹھا بچہ جب اندھیروں سے نکل کر روشنی دیکھ لیتا ہے تب ایک نئی ایجاد دنیا کو چونکا دیتی ہے! تم اعتقاد کی لاٹھی لے کر اُس چوٹی پر پہنچ نہیں پاؤ گے جبکہ میں ایک آکسیجن کا سلنڈر لے کر خلاؤں میں بھی جا سکتا ہوں اور پاتال میں بھی جا سکتا ہوں۔ اس لیے اپنی سوچ بدل کر سفر طے کر لو۔''

میرے ہم سفر کی باتوں کے اعتماد سے بار بار میرے اعتقاد میں لرزش پیدا ہوتی رہتی تھی مگر ہر بار ایک بات جو مجھے ہر طرف گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی اور سیدھے دل میں اُتر جایا کرتی تھی وہ یہ تھی کہ تمھارا ہم سفر مکّار ہے، عیّار ہے، اِس کا قول اس کے عمل سے جدا ہے۔ یہ تمھارے ساتھ اذیت ناک سفر کیوں طے کر رہا ہے؟ دراصل یہ آب کیسے ایجاد کر سکتا ہے؟ ایک حصّہ آکسیجن کے ساتھ دو حصّے ہائیڈروجن ملا کر؟ مگر اتنی مقدار میں وہ دونوں گیس کہاں سے لائے گا جو دریا بہنے لگے۔ یورینیم سے آگ پیدا ہوتی ہے، آب نہیں! یہ تمھیں گمراہ کر کے تمھیں پیچھے دھکیل کر خود بھگوان شنکر سے ملنے جا رہا ہے۔ ان سے پانی مانگنے جا رہا ہے!

میرے لیے یہ سفر ایک عقیدت کی یاترا تھی۔ بھگوان کے درشن کرنے کے بعد ان سے پانی طلب کرنے کی خاطر، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ شوشنکر بھولے ناتھ سچّے بھگتوں کی بھگتی سے خوش ہو کر ان کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں۔ مگر اپنے ہم سفر کے ارادے اور ہی تھے۔

شک تو مجھے خشک جھیل میں چلتے چلتے تب ہوا تھا جب وہ ان چشموں کو ڈھونڈ رہا تھا جو بقول اُس کے ہزاروں میل دور برفیلے پہاڑوں میں جذب ہوئے پانی کو زمین دوز راستوں سے شیطان کی نظریں چرا کر، سرحدوں کی پروا کیے بغیر اور معاہدوں کو نظر انداز کر کے ایک ملک کے پانی کو دوسرے ملک میں جھیلوں اور دریاؤں کو وجود میں لاتے ہیں۔ نہ تو مجھے کمل پھولوں کا سراغ ملا تھا اور نہ میرے ہم سفر کو کوئی چشمے ملے تھے۔

میں تب مایوس ہو کر اپنی یاترا پر چل پڑا تھا جبکہ وہ کچھ سوچ کر پانی کے وسائل کی تلاش

کرنے کی خاطر میرے ساتھ آیا تھا۔ ہم لوگ میرے دیار سے بہت دُور چلے گئے تھے۔ اور ہمارا ہر قدم ہم کو بلندیوں پر لے جا رہا تھا۔ میں عقیدت اور عقیدوں کی باتیں کرتا رہا جبکہ ایک کٹھن سفر کے دوران جب بھی اس کو مطمئن کرنے کی خاطر کچھ مناظر دکھا کر اپنا نقطۂ نگاہ سمجھانے کی کوشش کیا کرتا تب وہ یا تو زیرِ لب مسکرا دیتا تھا یا کہا کرتا تھا:

''میرے ہم نفس، میرے ہم نوا یہ بادل نہیں دُھواں ہے۔ جنگل میں آگ لگ جائے تو دن کے اُجالوں میں دُھواں نظر آتا ہے اور رات کی تاریکیوں میں دُور سے یا پاس سے آگ کی لالی نظر آتی ہے۔ کسی علاقے میں جنگ ہو رہی ہو تب بھی ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ سنو یہ ایک سلسلہ ہے جس کو توڑا جا سکتا ہے۔ سوچ رہا ہوں کیا یہ سلسلہ جوڑا بھی جا سکتا ہے؟'' وہ یہ کہہ کر بڑبڑانے لگا تھا۔ ''بحر سے بھاپ اُٹھتی ہے! بھاپ سے بادل بن جاتے ہیں! بادل، بارش، برف اور کبھی کبھی اولے بن کر برستے ہیں! اور پھر پانی کی لکیریں، ندی نالے بن جاتے ہیں! دریا اور جھیل بن جاتے ہیں! چشمے، کنویں۔ گہرے کنویں، آبیاری، آبپاشی، گلستان، بوستاں، چرندے پرندے، کیڑے مکوڑے اور اشرف المخلوق انسان۔ براعظم، ملک، امریکہ، انگلستان، عراق، افغانستان، بھارت، پاکستان۔''

اپنے ہم سفر کی باتیں سن کر بھی مجھے اپنے ہی دُکھوں کی باتیں یوں سنائی دے رہی تھیں گویا دل میں اُٹھی ہوک اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی۔

یہ جان کر کہ میرا ہم سفر دُور دیش سے آبِ حیات کی کھوج میں آیا ہوا الف لیلیٰ کی داستانوں کا کوئی کرشماتی کردار نہیں ہے بلکہ ایک سائنس داں ہے، میں نے اسی کی زبان میں اپنی روداد اس کو سنا کر یہ بتا دیا کہ ایک یونانی مفکر کی تحقیق کے مطابق دنیا بنانے والے نے دُنیا اگر جیومیٹری کی مدد سے بنادی ہے تو اس نے ہماری ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے الجبرا کے فارمولے بھی بنائے ہوتے!

دراصل مجھے اپنی بیٹی آشا کی یاد آ رہی تھی۔ آشا اس صدی کی اُمید بھی تو ہے؟ اسی کو دو بوند پانی پلانے کی خاطر میں ہمالیہ کے پہاڑوں پر یہ دُشوار سفر طے کرنا چاہتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ ایک معجزہ ہوگا۔ بھگوان شنکر اپنے بھگت کی بھگتی سے خوش ہو کر اپنے بالوں سے پانی نکال کر میری ایک ہی خواہش پوری کر دیں گے۔ میں جذبات کی رَو میں بہہ کر رو پڑا۔ اور آنسو یوں بہتے رہے جیسے میگھا کی اٹوٹ پھوار۔ سرد ہواؤں نے میرے آنسوؤں کو منجمد کر دیا تو میرا ہم سفر ویسے ہی

اُچھل پڑا جیسے بھگوان کے درشن کر لیے تھے۔

میرے ہم سفر نے بھگوان کو تو نہیں دیکھا تھا مگر پانی کے ایک منجمد ٹکڑے میں اُفق پر کھڑی چمکیلی سحر کی کرنوں کا عکس دیکھا تھا اور میں نے اس کی خوشی کے عکس اس کی آنکھوں میں دیکھ لیے تھے۔

اس نے ایک ایک کر کے جب بہت سارے موتی جیسے ٹکڑوں کو دیکھا تو حیران اس لیے ہوا کہ آکاش میں نہ تو بادل تھے اور نہ ہوا میں نمی تھی۔ آس پاس دیکھا تو نہ برف تھی نہ اولے تھے۔

پھر یہ پانی کی بوندیں کہاں سے آگئیں؟ کیا یہ بھگوان کا کیا ہوا کوئی اُپکار تھا! یا ایک معجزہ؟

میری کیفیت بھانپ کر میرا ہم سفر اس بار القاب کا استعمال کیے بغیر مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔

''آشا کی یاد آ رہی ہو گی؟ جبھی تو رو پڑے ہو؟ تم لوگ بات بات پر رو پڑتے ہو! جذبات کی رَو میں بہہ جاتے ہو! غم ہو یا خوشی، بس رو پڑتے ہو! کبھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اور کبھی مسرت کا اظہار کرنے کے لیے! کوئی پیدا ہو تو وہ روتا ہے اور کوئی مر جائے تو شدّت سے آنسو بہاتے ہو!''

میں نے جواباً جب اور شدّت کے ساتھ رونا شروع کیا تو وہ پھر بڑبڑاتا رہا۔

''دہقان بھی اپنی سوکھی کھیتی دیکھ کر آنسو بہاتا ہے اور بہاتا رہے گا۔ بھوکے ننگے، سردی سے ٹھٹھر رہے لوگ بھی روتے ہیں اور روتے رہیں گے! اس خطے میں آنسوؤں کی تجارت شروع ہو سکتی ہے! خرید و فروخت کا سلسلہ شروع ہو گا تو خون بیچنے والوں کی قطاریں نظر آئیں گی! بھوکا بچہ ماں سے کہہ دے گا کہ میری خوب پٹائی کر دو تا کہ میں آنسو بہا کر تاجر سے کھانا مانگ سکوں۔

ایک ارب لوگوں کے آنسو جمع کیے جائیں تو بوند بوند سے مل کر آب کا ذخیرہ بنا سکتے ہیں اور اس کا مالک میرا آقا ہو گا۔ اور پھر آقا ہی اپنی ایجاد کی حرارت سے تپش پیدا کرے گا، دھرتی پر موجود پانی کو چوس لے گا اور پھر پیاسوں کی پیاس بجھانے کے لیے اپنے غلاموں کو پانی دے گا۔

پھر زمین میں چھپے تیل کا مالک وہی ہو گا۔

ہوا کو زہر آلودہ بنا کر آکسیجن دینے والا مسیحا بھی وہی ہو گا۔ آشا، اس صدی کی اُمید کو زندہ رکھنے والا، تاثیرِ مسیحائی پہنچانے والا، آب کی بوندیں دینے والا شہنشاہوں کا شہنشاہ بھی میرا ہی آقا ہو گا!

''مگر یہ وہ ملک ہے جہاں سنگیت سمراٹ تان سین نے مغل اعظم کی خوشنودگی حاصل کرنے کے لیے دیپک راگ گا کر تاریکیوں کو اُجالوں میں بدل کر اپنے وجود کو جلا دیا ہوتا اگر اس کو دل و جان سے چاہنے والی تانی راگ میگھ ملہار گا کر بارش نہ برساتی! اگر آشا نے بھی وہی راگ چھیڑ کر بارش کے دیوتا اِندر کو خوش کر دیا تو جھیل پھر بھر جائے گی اور عبادت کرنے والے، پرستش کرنے

والوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اپنے اعتقاد سے تمھارا اعتماد چھین کر لے گئے تو کیا ہوگا؟“

یہ سن کر میں نے اپنے ہم سفر کے خیالات کے تسلسل کو توڑ کر کہا: ”ایک بار میری آشا کے سوکھے ہونٹ تر ہو جائیں اور خشک حلق سے آواز نکل پائے تو ماتا سرسوتی شاردا کی ،کرپا سے وہ ملہار گا لے گی۔“

میرا ہم سفر چونک پڑا اور بول پڑا۔

”نادان باپ! تم یہ بھول گئے ہو کہ یہ برف کے ٹکڑے تمھارے دیار کی تپش سے پگھل جائیں گے اور خالی ہاتھوں سے تم فقط اپنی بیٹی کی ارتھی اٹھا سکو گے! تم وقت ہو اور وہ زندگی...!

”تم ہرن کی طرح احمق ہو! کستوری کی مہک سونگھ سونگھ کر یہاں آئے ہو جبکہ کستوری تمھارے پیٹ میں ہے...“

”یہ پانی تمھاری آنکھوں سے بہہ رہا ہے اور سرد ہوائیں اس کو اولے بنا رہی ہیں۔“ یہ سن کر میں نے اپنے گالوں پر جم چکے اپنے ہی آنسو کے قطرے کو چھوا۔ میں نے پوچھا کہ ”میں اپنی آشا کو اپنے آنسو کیسے پلا سکوں گا۔ عقیدت کا جذبہ مجھے اپنے دیار سے بہت دور لا چکا ہے۔ اب تم ہی بتا دو کہ میں کیا کروں؟“

تب وہ پہلی بار فاتحانہ قہقہہ لگا کر بولا۔

”مجھے پہچان لے اے انسان! میں نے تیل کے کنوئیں دریافت کیے ہیں۔ اور ایٹم (Atom) ایجاد کیا ہے! اب ایک نئی ایجاد کرنے جا رہا ہوں۔ تم جیسے ضرورت مندوں کے لیے! آنسو تمھارے ہوں گے اور ان کو تمھاری آشا تک پہنچانے کا طریقہ میں ایجاد کروں گا۔“

یہ وہ آخری جملہ تھا جو میں نے سن لیا تھا۔ پھر خاموشی چھا گئی تھی اور میں اپنے ہم سفر کی مضبوط گرفت میں یہاں اُڑ کر آیا ہوں یا کسی تیز رفتار طیارے میں بیٹھ کر آیا ہوں مجھے معلوم نہیں کیونکہ اپنی اشک بار آنکھوں سے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بہت آنسو بہا چکا ہوں اور اب جب رُک رُک کر ایک ایک قطرہ بہہ کر جم جاتا ہے تو میرا ہم سفر ایک Fork (فورک) سے اُٹھا کر بوتلوں میں ڈال دیتا ہے۔

کیا یہی میرے ہم سفر سائنس داں کی نئی ایجاد ہے؟ کوئی تو مجھے بتا دے!

انسان نہیں، بھگوان نہیں۔ شیطان بھی تو نہیں بتا رہا ہے!

○○

سطور کے درمیان

چندر روپڑا تو چانکیہ پنڈت کو یوں لگا جیسے سطور ہی اُلجھ گئے ہوں اور ایسے حالات میں وہ سطور کے درمیان کچھ بھی پڑھ نہ پا رہا ہو! دراصل وہ بیتے ہوئے لمحات کو اُمر کر کے ظلم، ظالم اور مظلوم کی کسی نئی کہانی کو قلمبند نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ دوسروں کی کھینچی ہوئی لکیروں یا تحریر کردہ سطور کے درمیان پڑھ کر اپنے جائزے یا مشاہدے پر سوچتا رہتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط! کیا اچھا اور کیا بُرا! مگر اس بار جو اُس نے دیکھا، کیا وہ ایک سراب ہے؟ چندر کے چہرے پر کیا بناوٹی تاثرات تھے؟ اُس کی باتوں میں کیا مصنوعیت تھی؟ معصومیت نہیں تھی؟ ایسی ہی باتوں کے بارے میں سوچ سوچ کر اُس کو یوں لگ رہا ہے گویا اُس کی سمجھ ایک پہاڑ پر اچھل اُچھل کر گہرائیوں کی طرف جا رہے بے قابو پتھر جیسی کیفیت سے دوچار ہے۔ چانکیہ پنڈت ایک سرکاری افسرِ اعلیٰ ہے اور ایک ایسے راحت کیمپ کا نگراں ہے جو سنامی لہروں سے متاثر ہوئے لوگوں کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے کھول رکھا ہے۔

چانکیہ کا اصلی نام کچھ اور ہے۔ یہ نام اُس کو دانشوروں نے احتراماً اور کچھ لوگوں نے طنزاً دیا ہے کیونکہ بقول ان کے افسرِ اعلیٰ دیکھی سنی باتوں پر کم توجہ دیتا ہے اور اپنے جائزوں پر دوسروں کی توجہ طلب کرنا چاہتا ہے۔ وہ امدادی پروگراموں کی مخالفت تو نہیں کرتا مگر یہ ضرور کہتا رہتا ہے کہ جو آگ برسا کر زمین کو جلا رہے ہیں وہی پھر راگ ملہار گا کر دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ برف کو پگھلا کر سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ سمندر کو ایٹمی توانائی سے اُبال کر بھاپ پیدا کرتے ہیں۔ بھاپ کو آسمان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ آسمان بوجھ اُٹھا نہیں پاتا اس لیے بادلوں کو برف اور بے وقت کی بارش کی شکل میں زمین کو لوٹا دیتا ہے۔ سیلاب آ جاتے ہیں تب وہی لوگ راگ دیپک گا کر اپنی گرم جوشی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ ایسی باتیں سنا سنا کر وہ دنیا والوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے اور یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ بس اور نہیں۔ اور نہیں۔ نہ قہر آدم اور نہ ایسے راحت کیمپ! نہ جنگ نہ بارود۔ نہ ایٹمی تجربے نہ زلزلے۔ نہ طوفان نہ بادِ صرصر اور نہ سمندر کی اونچی

لہروں کی پیش قدمی اور نہ آب کا زمین پر یلغار!

وہ سنامی کی لہروں کے شکار، اکھڑے اُجڑے لوگوں کو ان کے ہی سانحوں کا حوالہ دے کر متحد کرنا چاہتا ہے۔ پھر ان لوگوں کے خلاف مورچہ کھول دینا چاہتا ہے جو قہرِ خدا کی آڑ میں قہرِ آدم کو عیاں نہیں ہونے دیتے۔

چانکیہ نے اس بار بھی مر چکے لوگوں کا حوالہ دے کر سنامی لہروں سے دور بھاگ کر اپنی زندگی کو بچانے والوں سے اور ان کو جن کو سنامی لہروں کے سانحات نے خوف زدہ کر دیا ہے، یہ پیغام دینا چاہا تھا کہ بھوکوں کے کھیتوں کو بچا سکو تو بچالو! فیکٹریوں کو بچا سکو تو بچالو! گھرندوں کو بچا سکو تو بچالو، گاؤں بچالو، بستیوں کو بچالو، شہر بچالو، جنگلات بچالو، زمین، سمندر، پہاڑ، آب اور ہوا کو بچالو—!

اس بار بھی کسی نے اس کو سنجیدگی سے نہیں لیا ہے۔ کوئی ظلم یا ظالم کے بارے میں چانکیہ کی بات سن لینے کی بجائے مظلوم انسانوں کے دردناک انجام پر آنسو بہانے کو ترجیح دے رہے تھے۔ آج بھی جو مل چکا ہے یا جو بھی ملتا ہے وہ نوحہ خوانی میں شریک ہو جانے کے لیے نت نئے پروگراموں کی تفصیلیں دیتا رہتا ہے۔ دس افراد کے خاندان میں زندہ ایک بچے کو گود لینے کے لیے کئی تنظیمیں آگے آرہی ہیں۔ امدادی کرکٹ میچ کھیلے جا رہے ہیں، گانے بجانے کے امدادی پروگرام کیے جا رہے ہیں۔ اور یہ سب سن کر چانکیہ حیران تھا کہ کاش کوئی ایک اُس کے پیچھے کھڑا ہو جاتا تاکہ وہ کوشش کرتا کہ وہ ایک کارواں بنا سکے۔ چندر کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر چانکیہ کو لگا تھا جیسے صدیوں پہلے چانکیہ کو چندر گپت مل گیا ہو۔ ''میرا نام چندر ہے۔ مجھ سے دوستی کرو گے؟''

چندر کی آنکھوں میں اُمید کی چمک تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ آواز میں اعتماد کے ساتھ تازگی تھی۔ وہ کیمپ میں ایسا پہلا مظلوم تھا جو نہ آنسو بہا رہا تھا اور نہ خدا کو کوس رہا تھا بلکہ اپنی کشمکشِ زندگی کی روداد بھی نہیں سنا رہا تھا۔ یعنی وہ سب سے الگ تھا۔ چانکیہ اُس روز گئی رات تک اس سے باتیں کرتے کرتے یہ جان گیا تھا کہ چندر ذہین ہے، بہادر ہے، اور سب سے اہم یہ کہ وہ دھارمک کہانیوں کے حوالے دے کر باتیں کیا کرتا تھا اور طرزِ بیان ایسا کہ چانکیہ کو بار بار یہ احساس ہو جایا کرتا تھا کہ چندر کے اندر کوئی دیوتا یا اوتار بول رہا ہے۔ یعنی جب چانکیہ سے ایک سرکاری ملازم نے طنزاً یہ پوچھا کہ وہ کیا یہ چاہتے ہیں کہ آج کا سائنس داں بارش میں بچاؤ کے لیے آسمان جتنی چھتری بنائے اور بم نہیں؟ تب چندر نے بے ساختہ ہنس کر کہا تھا ''کیا بے وقوفوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ یومین (You man) کیا کوئی آسمان کو ناپ سکتا ہے؟ نونن - ناٹ ایون

ہنومان پون پُتر (No None. Not even Hanuman. Pawan Putra) ہاں بھگوان کرشن اگر چاہیں تو وہ انگلی پر پہاڑ اُٹھا کر اپنوں کو بارش سے بچا سکتے ہیں! کیوں کیا ہوا؟ ارے بابا آسمان کو ناپا نہیں جاسکتا۔ زمین کو تولا نہیں جاسکتا اور سمندر کو باندھا نہیں جاسکتا۔''

پھر جب سرکاری افسر نے طنزاً چندر سے پوچھا کہ اگر تم نے یہ پڑھ کر جانا ہے تو یہ بھی پڑھ لیا ہوگا کہ سمندر کا پانی اچھل کر زمین پر کیوں آ گیا۔ تب چندر نے سنجیدگی سے کہا تھا:

''دیوتاؤں اور راکھشسوں کے ٹکراؤ سے سمندر کا منتھن ہو رہا ہے۔ جب سمندر سے زہر اور امرت کے دو مٹکے نکلیں گے تب بھگوان شنکر آ کر زہر خود پی کر دیوتاؤں کو بچالیں گے۔ اس کے بعد دیوتا امرت پی کر امر ہو جائیں گے۔''

چندر ہنستا رہا اور چانکیہ کو اپنے پیچھے کھڑا رہنے والا اشرف المخلوق مل گیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ ایک مدّت کے بعد سہی، اس نے سطور کے درمیان ایک مسیحا کو دیکھا تھا۔ دو دن چندر کیمپ کے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا رہا۔ کسی حد تک وہ نوحہ خوانی بند کرانے میں کامیاب بھی ہوا تھا لیکن آج وہ جب رو پڑا تو چانکیہ کو یوں لگا جیسے چندر نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں جو آنسوؤں کی ایک جھیل چھپا کر رکھ چھوڑی تھی وہ ٹوٹ کر کیمپ والوں کو شدید طور پر متاثر کر گئی ہے۔

چندر اُس پائلٹ کے ساتھ چمٹ گیا ہے جو اس کو اپنے ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر اس کے اُجڑے دیار سے اُٹھا کر کیمپ میں لایا تھا۔ چانکیہ نے آہ بھر کر پائلٹ سے یہ جانکاری حاصل کی کہ چندر کے والدین اور چھوٹی بہن کسی رشتے دار کے گھر گئے تھے جب سنامی لہریں اس عمارت کی دوسری منزل کو چھو گئی تھیں۔ چندر تیسری منزل میں بیٹھا اپنے کمرے میں ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہا تھا۔ بجلی اگر کٹ نہیں گئی ہوتی تو وہ اپنے فلیٹ سے باہر نہیں آیا ہوتا اور اگر نیچے جانے والی سیڑھیوں پر پانی نہ ہوتا تو وہ چھت پر نہ گیا ہوتا۔ اگر پائلٹ خود ذاتی دلچسپی لے کر اُس کو وہاں سے اُٹھا کر کیمپ میں نہ لایا ہوتا تو وہ تنہائیوں سے گھبرا کر شاید مر گیا ہوتا۔ پائلٹ نے چانکیہ کو بتایا کہ چندر اس کو سُپر مین سمجھ بیٹھا تھا اور اس کو یقین تھا کہ وہ اس کے والدین اور چھوٹی بہن کو اپنے ساتھ لے آئے گا۔ لیکن پائلٹ کیونکہ کسی کو بھی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا اس لیے چندر رو پڑا تھا۔

چانکیہ کو خود پر اس لیے غصہ آ رہا تھا کیونکہ سطور کے درمیان دیکھتے وقت وہ یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ چندر دس سال کا لڑکا ہے!

OO

دو سِروں والی لڑکی

ملک کے بٹوارے سے کچھ روز پہلے اُس نے اپنی لیبار یٹری (Laboratory) میں ایک دو سروں والے سانپ کو گھستے ہوئے دیکھا تھا، اس سے پہلے کہ وہ کسی کو سارے احاطے میں نہ گھسنے کی ہدایات دے پاتا اور سانپ کو پکڑ والیتا یا کچل ڈالنے کی سعی کرتا فرقہ وارانہ فسادات میں اس کے خاندان کے سبھی افراد قتل کر دیے گئے اور اس کو اپنی جان بچانے کی خاطر اپنی جنم بھومی کو چھوڑنا پڑا تھا۔ ایک رفیوجی کیمپ میں اس کو پناہ تو ملی تھی مگر اپنوں کے بچھڑ جانے کا غم اس کے دل کو ایک خاردار تار کی طرح تڑپا رہا تھا مگر دماغ میں فقط اُس کو اپنی لیبارٹری میں رکھی اپنی نامکمل ریسرچ رپورٹ کے اوراق دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اُبھر کر اُس کی سوچ میں انتشار پیدا کر رہے تھے وجہ یہ تھی کہ دوسری جنگِ عظیم کے آخری مرحلے میں ہیروشما اور ناگاساکی میں ایٹم بم گرا کر جہاں ہزاروں لوگوں کو راکھ بنا ڈالا تھا وہاں لاکھوں کو جان لیوا لاعلاج بیماریوں کا شکار بنا ڈالا تھا۔ تب اس اعلیٰ تعلیم یافتہ باٹونیسٹ نے سوچا تھا کہ ہمالیہ ودیگر پہاڑوں میں کچھ ایسی شفایاب بوٹیاں خودبخود اُگ جاتی ہیں جن سے وہ کینسر کو قابلِ علاج بنانے کے لیے ایک دوائی بنانے کی سعی کر سکتا ہے۔ شاید حالات نے ایسے واقعات پیدا کیے تھے کہ ایک سائنس داں ایک بیراگی بن گیا اور پھر بھی وہ روز دن بھر اپنی سادھنا کرنے سے پہلے اپنے نئے آشرم کے اِردگرد گھنے جنگلوں میں اُس بوٹی کی تلاش کیا کرتا تھا جس کی شناخت کرنے میں اُس کی دل کی عمیق گہرائیوں سے اُبھر کر کی گئی تپیا نے اُس کی تیسری آنکھ کھول دی تھی۔

اُس روز یعنی آج سے تقریباً سولہ سال پہلے اُس کو علی الصبح پرندوں کی چہچہاہٹ اور ہوا کے جھونکوں سے ہل رہے پتوں کی جل ترنگ کی جیسی آوازوں کو دو بچوں کے رونے کی آواز نے چیر کر بابا کو چونکا دیا تھا۔ دو جنگلی خونخوار جانور شکار بیک وقت دیکھ کر آپس میں لڑ رہے تھے اور بابا کے

سامنے مڑ گئے۔ بابا نے پتے ہٹا کر جب نوزائیدہ بچے کو دیکھا تو چونک پڑے تھے کیونکہ اُن کا جسم ایک تھا مگر دھڑ کے ساتھ دو گردنوں پر دو سر! بچے کو گود میں اُٹھا کر دماغ میں کئی سوال اُبھر کر آئے تھے۔ خدشات کی لال بتی دکھا کر، اندیشے کی پیلی بتی دکھا کر اور دل میں ایک ہوک اُٹھ جانے کے ساتھ اُس کو ہری بتی نظر آئی تھی۔ یہ دوسروں والا سانپ نہیں ہے۔ آدم کی اولاد ہے۔ غالباً بچی کو شیطانی قوت کی علامت سمجھ کر بچی کو جنگل میں چھوڑنے والے بچی کے والدین ہوں گے۔

بابا نے بچی کو پالا پوسا تھا لیکن بار بار وہ لڑکی کے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتا تھا کیونکہ وہ یہ جان چکا ہے کہ جیسے ایک درخت کے تنے سے دو شاخیں نکل آتی ہیں ایک جسم کے دو سَر اگر یہ بھی دنیا بنانے والے کا کوئی کھیل ہے تو دونوں چہروں کو ہم شکل بنا کر کھوپڑیوں میں ایک جیسے دماغ کیوں نہیں دیے ہیں۔ ایک کے دماغ میں انگار ہے اور دوسرے کے دماغ میں برف! اب دل بے چارہ کس کی بات مانے؟ اس لیے وہ لڑکی کو سامنے بٹھا کر دھارمک کتھائیں، حکایتیں سنا کر دونوں کی ایک جیسی سوچ سمجھ بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا تھا لیکن وہ اپنی تیسری آنکھ سے ایم آر آئی (M.R.I) جیسا جائزہ لے کر یہ جان چکا تھا کہ اس کا ہر تجربہ ناکامیاب ثابت ہو رہا ہے اس لیے اپنے بچاؤ کی ترکیب کو فریب ہوتے ہوئے بھی عمل میں لا چکا تھا۔ دونوں کے بہت لمبے بالوں کی مدد سے وہ ایک چہرے کو چھپایا کرتا تھا خاص طور پر تب جب دونوں کو آشرم سے باہر جا کر گھومنے پھرنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ بابا ایک دماغ کو اپنی روحانی قوت سے سلا دیا کرتا تھا اور وہ چہرہ بالوں سے یوں ڈھکا رہتا رہا کہ جیسے کالے بادلوں سے چاند چھپ جایا کرتا ہے۔ بابا اپنے اس کامیاب تجربے سے خوش تھا۔ چہرہ الگ تو زبان بھی الگ تھی اس لیے ایک کو تیکھے کھانے پسند تھے تو دوسری زبان کو مٹھاس پسند تھی۔

ایک منہ سے عقل کے کاروبار میں دل کو نظر انداز کر کے خیالات اور خواہشات کو ظاہر کرنے والی آواز میں گرج ہوا کرتی تھی جبکہ دوسرے منہ سے دل کے معاملات میں اپنے ہم شکل چہرے میں ایک نیوکلیر (Nuclair) قوت جیسی پیداوار کا دخل نہیں ہوا کرتا تھا۔ اوّل تو وہ اپنے پالنہار کی سمجھی ہوئی اقوال زرّیں کی ترجمانی پسند کیا کرتی تھی یا پھر امن کی باتیں کیا کرتی تھی اس کے دماغ میں عمر بڑھنے کے احساسات اور جنسی محسوسات دل میں اُتھل پتھل مچاتے جن سے وہ گریز کرتی تھی جبکہ لڑکی کا دوسرا چہرہ پانی میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ کر یا اپنے سینے کے اُبھار کو دیکھ کر اپنے

دل میں ہلچل مچادیا کرتی تھی۔

دل تو ایک ہی تھا بے چارہ کیا کر سکتا تھا۔ بے چارے کی حالت اُس مریض جیسی ہوا کرتی تھی جس کا سر تپتی ہوئی ریت میں دھنس گیا ہو اور پاؤں برف میں ٹھٹھر رہے ہوں اور بابا دل کی کیفیت بھانپ لیا کرتا تھا اور اپنے آپ کو اتنا ہی بے بس محسوس کیا کرتا تھا جتنا وہ کینسر کے علاج کے لیے مطلوبہ جڑی بوٹی کو کھوجنے میں اپنے آپ کو لاچار سمجھا کرتا تھا۔ پھر اکثر انسانی فطرت کے بدلتے رنگ دیکھ کر وہ گویا ایک معمے کے حل کے لیے سمادھی میں جا کر دنیا بنانے والے کے اس پرانے کھیل کا انجام سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور جب لڑکی سولہ سال کی ہوگئی تب ایک دن جنگل کا ٹھیکیدار جو ایک سیاست داں بھی ہے اور محکمۂ جنگلات کا منسٹر بھی، زبردست بارش کی وجہ سے بابا کی کٹیا میں داخل ہوا۔

بابا معمول کی طرح آس پاس ہو رہے حالات اور واقعات سے بے خبر ہو کر سمادھی میں مشغول تھا اور لڑکی بارش میں بھیگنے کا لطف اُٹھا کر اپنے ایک چہرے کو بالوں سے ڈھک کر رکھ نہیں پائی تھی اس لیے منسٹر ان کے کمرے میں آنے سے ڈر گیا۔

خوفزدہ ہو کر وہ بھاگ کر اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا ہوتا اگر لڑکی نے خود ایک خطرناک مخلوق ہونے کی بجائے انسان ہونے کا یقین نہ دلایا ہوتا۔ منسٹر شاطر تو تھا مگر ذہین بھی۔ یہ سوچ کر کہ اگر دو جڑواں بچوں کے جسم کے حصے جڑے ہو سکتے ہیں، کھوپڑیاں جڑی ہو سکتی ہیں، سینے جڑے ہو سکتے ہیں، ٹانگیں جڑی ہو سکتی ہیں تب ممکن ہے کہ دو سِروں والی لڑکی سچ بول رہی ہو؟

شاطر منسٹر خطروں سے کھیل کر ایک لکڑہارے کا بیٹا ہونے کے باوجود اپنی کامیابی کی سیڑھیاں بنانے کا ماہر ہے اس لیے کوئی اور ہوتا تو اس نرالی مخلوق کی باتوں کو ایک چڑیل کا فریب سمجھ کر بھاگ گیا ہوتا مگر اُس نے لڑکی کے دونوں ہاتھوں کو چھو لیا تھا اور پھر ہمت کر کے ایک کنواری لڑکی کے سینے کے ابھار کو چھو لیا تھا تب دونوں چہروں پر خوشی کی لالی اُبھر کر آئی تھی۔

کہتے ہیں ایک دہشت گرد کو راکھ کے نیچے چھپ کر بیٹھا ادھ جلا انگارہ نظر آتا ہے ایک سنار کو ریت میں سونے کا ذرّہ نظر آتا ہے اور ایک منجھے ہوئے سیاست داں کو الیکشن کے دوران کارآمد چہرے ہجوم میں بھی نظر آتے ہیں اس لیے وہ بابا کی سمادھی بھنگ کیے بغیر اپنے ساتھ لے کر لڑکی کو ایک نمائش کی شے بنا کر لے گیا اور اپنے الیکشن کے جلسوں اور جلوسوں میں اپنے ساتھ اس کی

نمائش کرتا رہا۔ اپنے حق میں گرم مزاج کے دماغ میں ایسے مکالمے ڈال دیے جن کو اشارہ ملتے ہی یوں بولا کرتی گویا ایک ٹیپ ریکارڈر بٹن دباتے ہی بولتا ہے۔ عام لوگ گویا اس کی زبان سے نکلے ہر لفظ کو خدا کی آواز سمجھ کر شاطر لیڈر کے نعرے لگا کر اس کی کامیابی کا یقین دلا کر، ہر جلسے بلکہ ہر جلوس کو کامیاب بناتے تھے۔ پڑھے لکھے لوگ لڑکی کو دلچسپ نگاہوں سے دیکھتے رہتے تھے جبکہ اَن پڑھ لوگ لڑکی کو ایک دیوی کا درجہ دے کر دُور دُور سے جوق در جوق درشن کے لیے آجایا کرتے تھے۔ گرم افواہ یہ تھی کہ اس دور میں بھی مہارشی وشوامتر جیسے فرشتے دنیا میں موجود ہیں جو اپنی روحانی قوت سے مشینی انسان یعنی روبوٹ کی بجائے گوشت پوست کے انسان بنا سکتے ہیں۔ ایک خاص طبقہ رشی کی تپسیا سے پائی گئی قوت کو اپنے عقیدوں پر فخر کر کے کتھاؤں میں ایک اور کتھا کر بھاگوت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ بھوکے لوگ یہ دعائیں کرتے رہتے تھے کہ کاش یہ عظیم رشی دو، سَروں کے لیے ایک جسم رکھ کر کھانے کی ضرورتیں آدھی کرنے کی بجائے بارش یا برف کی طرح اناج آسمان سے گرا دینے کی سعی کرتا، دہشت گردی کے شکار ہوئے خاندان چاہتے تھے کہ کاش دو، سَروں والی دیوی کو نہانے کی بجائے ہم سے چھینے گئے ہمارے اپنے خاندان کے بجھے ہوئے چراغوں کو پھر سے روشن کر دے۔ وہ لیڈر کو ووٹ کے بدلے رشی کی کٹیا کا پتا جاننا چاہتے تھے۔ پھر اچانک الیکشن سے چند روز پہلے میٹھی زبان والے نے رشی کا پتہ بتا دیا تو جلسے سے لوگ بھاگ گئے۔

لیڈر بوکھلا گیا کیونکہ ایک سپہ سالار اپنی فوج کو میدانِ جنگ چھوڑ کر امن کے متلاشی بن کر دیکھ نہیں سکتا۔ اس لیے وہ تلوار لے کر نرم دماغ والے سَر کو دھڑ سے الگ کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات گرم دماغ میں گئی تو پہلی بار اُس نے مشترکہ دل سے اُٹھی ایک ہوک محسوس کی۔ دل نے دونوں دماغوں کو یہ اطلاع دی کہ ایک گردن کاٹنے سے مشترکہ جسم سے سارا خون نکل جائے گا اور روح جسم کو چھوڑ جائے گی۔ گرم دماغ نے لیڈر کو تب روکا جب وہ گردن پر تلوار رکھ چکا تھا اور خون کی ایک لکیر جسم کو دو حصوں میں بانٹ گئی تھی گویا بٹوارے کے بعد زمین پر خون کی ایک لکیر نے ایک ملک کے دو ٹکڑے بنا ڈالے تھے۔ پہلی بار دل کی بات مان کر لڑکی لیڈر کو رشی کے پاس لے گئی تھی یہ کہہ کر کہ وہ شاید لیڈر کی مشکل آسان کر دے۔

دراصل گرم دماغ دل کی ڈوب رہی دھڑکنوں کو محسوس کر کے نرم دماغ کی صحبت کو نہ تو اپنے رنگ میں رنگ دینا چاہتی تھی اور نہ وہ اپنی نفرت کو محبت میں بدلنا چاہتی تھی، وہ زندہ رہنا چاہتی تھی

کیونکہ جب لیڈر اس کے ساتھ لپٹ جایا کرتا ہے تب اس کو زندہ رہنے کی لذت کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

رشی کی تپسیا اگر بھنگ نہ کر دی ہوتی تو وہ شاید روحانی قوت سے دو سروں والی لڑکی کو ایک ہی سر، ایک ہی جسم، ایک ہی دماغ اور ایک ہی دل والی لڑکی بنا دینے کی ایک کوشش کر دیتا مگر لیڈر نے مکاری کا سہارا لے کر، لڑکی کا واسطہ دے کر ایک تپوسی کو عرش سے فرش پر گرا دیا اور اُس نے جب گر کر پھر سے اُٹھنے کی کوشش کی تب اُس نے لیڈر کو نہیں دیکھا البتہ زمین پر لیڈر کے جوتوں کے ساتھ دو سروں والی لڑکی کا بے جان جسم تھا۔ ایک گردن پر زخم تھا اور خون کی ایک لکیر جسم پر جم گئی تھی۔

لیڈر اپنی جیت کے لیے کسی اور عجوبے یا شوشے کی تلاش میں چل پڑا اور رشی اپنے آپ کو کوس رہا تھا وہ اس لیے کہ سولہ سال کی پرورش کے بعد بھی وہ ایک لڑکی کو قہرِ آدم سے نہ بچا سکا اور نہ کینسر کے علاج کے لیے کوئی مطلب کی جڑی بوٹی تلاش کر پایا۔

ایٹم بم کے ہولناک قہر، ملک کے بٹوارے کے دوران قتلِ عام، بڑی طاقتوں کا چھوٹے ممالک پر دباؤ، ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ، دوسری کے بعد تیسری، چوتھی اور ساتھ شانہ بشانہ چل رہی ایک سرد جنگ!

رشی کے سامنے زمین پر پڑی دو، سروں والی لڑکی کی لاش ہے۔ گویا ۱۹۴۷ء کے وقت کا ہندوستان کا نقشہ اور اس کے بٹوارہ کرنے والے دو دماغ۔ رشی بے ساختہ رو پڑا، مگر قدموں کی آہٹ سن کر وہ چونک پڑا۔

لیڈر چند آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر رشی سے بلک بلک کر روتے ہوئے یہ التجا کرنے لگا کہ وہ اپنے سارے علاقے کے لوگوں کو اپنی پیاری دو، سروں والی دیوی ماتا کے درشن کروانا چاہتا ہے تا کہ وہ جان پائیں کہ میرے دشمنوں نے کس بے دردی نے کس بے دردی سے اس کا گلا کاٹ ڈالا ہے۔

لیڈر یہ کہہ کر رو پڑا مگر رشی غصّے سے بھڑک اٹھا۔ گویا لاش دکھا کر دوٹوں کا بٹوارہ۔ لیڈر نے رشی کی کیفیت بھانپ کر اس کو دھکا دے کر گہری کھائی میں پھینک دیا۔ لاش کو کھلی گاڑی میں رکھ کر لیڈر کی پارٹی کے جھنڈے سے ڈھانپ کر ایک لمبا ماتمی جلوس نکالا گیا اور سرگوشیوں میں یہ بات ہر ایک شخص تک پہنچائی گئی کہ حملے کے فوراً بعد لڑکی کو اسپتال اس لیے نہیں لے جایا گیا کیونکہ لڑکی نے خود رشی کے پاس لے جانے کی ضد کی تھی مگر بابا لہولہان لڑکی کو دیکھ کر غم زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ

تذبذب میں تھا کہ وہ کیسے ایک مسیحا بن کر اس دو سروں والی لڑکی کے بود اور نابود کی داستان کا حوالہ دے کر ایک ہی انسان کے اندر نیکی اور بدی کو سمجھنے کے لیے اگر دُنیا بنانے والے نے دماغ دیا ہے تو اپنے قول کی عمل کو محسوس کرنے کے لیے دل بھی دیا ہے۔ دل اور دماغ کے درمیان بولنے کے لیے منہ میں زبان رکھ دی ہے اس لیے وہ زندہ رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا مگر شیطان کی بنائی ہوئی کہانی بہت گہری تھی لیڈر الیکشن جیت کر منسٹر بھی بن گیا۔

رِشی بابا نہ قہرِ خدا سے لڑ پایا اور نہ قہرِ آدم کو ٹکر دے سکا۔ لیڈر کے خلاف بغاوت کرنے والے جب گہری کھائی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے رِشی بابا کی ہڈیاں بھی خونخوار وحشی درندے چبا گئے تھے۔ اور یہ منظر دن کو بے زبان آفتاب اور رات کو مہتاب نے تو دیکھا تھا مگر ان گواہوں کے بیان نہ سُنے جا سکتے ہیں اور نہ لکھے جا سکتے ہیں۔

OO

گرداب

دن کے اُجالے میں جو دو چہرے ڈراؤنے نظر آرہے تھے وہ گئی رات اسٹریٹ لائٹ میں نہ صرف نرالے نظر آرہے ہیں بلکہ معصوم اور مظلوم نظر آرہے ہیں! آخر کیوں؟ یہ سوال اور اس کے کئی جوابات تھانے دار کو بار بار چونکا دیتے ہیں۔ کچھ تو ان کی حالت دیکھ کر اور کچھ ان کی موسم کی طرح بدلتی کیفیت بھانپ کر! دن بھر وہ حوالات میں رہ کر کبھی زخمی بلّیوں کی طرح جھپٹ کر، ایک دوسرے کے بال نوچ کر، دونوں ہاتھوں سے ایک دوسرے کے چہرے کھرچ کر لہولہان کر دیتی تھیں اور اس سے پہلے کہ کوئی لاک اَپ کا آہنی دروازہ کھول کر اندر جایا کرتا تھا، دونوں ڈرامائی انداز میں ایک دوسرے سے الگ ہو کر دو کونوں میں دُبک کر بیٹھی ہوئی ایک دوسرے کو اپنی ندامت کا احساس دلا کر پہلے سسکتی رہتی تھیں اور پھر کھسک کھسک کر چلتی ہوئی جونہی کاندھے سے کاندھا ملاتی تھیں تب ایک دوسرے سے لپٹ کر یوں رو پڑتی تھیں گویا دونوں نوحہ خوانی کر رہی تھیں۔ پھر ایک لمحے کی خاموشی کو توڑ کر سرگوشیانہ لہجے میں مسکراتی ہوئی باتوں کا سلسلہ شروع ہو جایا کرتا تھا جو رفتہ رفتہ تکرار کی شکل اختیار کر کے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑ جانے پر رُکا کرتا تھا کیونکہ دونوں بار بار اپنے بچوں کی خوبیوں اور ان کے اونچے گھرانوں کی چمک دمک کا ذکر کر کے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی آڑ میں میدانِ جنگ میں اُتر جایا کرتی تھیں۔ اس لیے تھانے کے لوگ ان کی جھڑپوں کو ان کی مکاری و عیّاری سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دونوں سوانگ رچا کر رہائی کا راستہ بنا رہی ہیں۔ مگر تھانے دار کے دماغ میں کئی سوالات اُبھر کر جوابات مانگ رہے تھے۔ مثلاً اگر یہ دونوں کم عمر عورتیں اچھے گھروں سے تعلق رکھتی ہیں اور بچوں کو گھر میں چھوڑ آئی ہیں تو کوئی نہ کوئی فکرمند ان کا حال پوچھنے یا گمشدگی کی اطلاع دینے تو آیا ہوتا؟ تھانے دار کے سامنے ہی جب ایک سپاہی دونوں کو تھانے میں لایا تھا تب دونوں عورتیں ایک دوسرے کو خونخوار درندوں کی طرح دیکھ رہی تھیں مگر لاک اَپ کا آہنی دروازہ بند ہوا تھا تب دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر رو پڑی

تھیں اور چند لمحات کے بعد گویا اچانک بادل ٹکرا کر پھٹ گئے تھے۔ ایک خاموش ندی میں پانی گر کر کبھی ندی کا ایک کنارہ کٹتا رہتا تو کبھی دوسرا کٹتا رہتا تھا مگر تب بھی دونوں کی کیفیت ایک دوسرے کے چہرے سے خون بہتے دیکھ کر بدل گئی تھی۔ گویا کسی پہاڑی نالے میں آچکا سیلاب کا پانی بہہ چکا تھا اور کٹے ہوئے کنارے ایک دوسرے کو دیکھ کر سکتے میں آ گئے تھے۔ دونوں عورتیں خود ہی ایک دوسرے کے بال یا گال چھوڑ کر لاک اَپ کے دو کونوں میں بیٹھ کر گویا اقبالِ جرم کر کے ایک لمبے وقفے کے لیے خاموشی اختیار کر لیتیں اور ایک دوسرے کو اشاروں میں اپنی شرمندگی کا احساس دلاتی رہتی تھیں۔ تھانے دار خوش تھا کہ آگ خود بخود بجھ گئی مگر جب دونوں کھسک کر سرگوشیانہ انداز میں مسکرا کر باتیں کرتے کرتے ایک بار پھر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑی تھیں تب تھانے دار نے سوچا تھا کہ راکھ کے نیچے دبے کچھ انگاروں نے دہک پیدا کر دی ہے! اس لیے وہ حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا کیونکہ ایک بار پھر دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کے چہرے سے خون کے دھبے اپنے پلّو سے صاف کر کے اور اُلجھے بالوں کو سلجھا کر ایک دوسرے کے چہروں کے ڈراؤنے عکس مٹا دیے تھے۔ اس لیے یا تو دونوں عورتیں ذہنی طور پر بیمار ہیں یا پھر دونوں بدکار پیشہ ور مجرم عورتیں ہیں اس لیے تھانے دار سمجھ گیا تھا کہ یہ وقفہ کالے بادلوں کو چیرتی ہوئی کرنیں ہیں! اس لیے دونوں کی ذہنی کیفیت یا پھر اُن کے ارادوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی خاطر اُس نے اپنی کُرسی لاک اپ کے قریب رکھوا دی تھی اور اپنی آنکھوں پر ٹوپی رکھ کر یوں ظاہر کیا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے ایسا اس لیے کیا تھا کیونکہ دونوں عورتوں کے سلسلے وار ڈراموں سے اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اور سوالات اُبھر کر آنے لگے تھے۔

خدشات بھی اور اندیشے بھی ایک فرض شناس و ایماندار پولیس افسر کا تعاقب کر رہے تھے! کہیں یہ دونوں پیشہ کرنے والی عورتیں تو نہیں ہیں؟ دونوں بچوں کے بارے میں لڑ پڑتی ہیں۔ اگر یہ دونوں مائیں ہیں تو بچوں کو گھر کیوں چھوڑ آئی ہیں؟ اور گھر والے اپنے بچوں کی ماں کے بارے میں فکر مند کیوں نہیں ہیں؟ اس کے علاوہ یہ بھی فکر اس کو کھائے جا رہی تھی کہ عورتیں جوان ہیں، خوبصورت ہیں اور ایک دوسرے کے کپڑے تار تار کرنے کی وجہ سے کہیں کسی نے ان کو اپنے ہوس کا شکار بنا دیا تو ایک نئی داستانِ تفتیش شروع ہو جائے؟ یہ دونوں پاگل پن کا ڈرامہ تو نہیں کر رہی ہیں؟ کہیں ان کا کسی گروہ سے تعلق ہوا تو! بچوں کو اِغوا کرنے والے گروہ! تھانے دار کی یہ اسکیم

کامیاب تو ہوئی تھی لیکن اس حدتک کہ دونوں کے درمیان ہو رہی جنگ کی وجہ کیا ہے وہ دونوں کی گفتگو سن کر جان پایا تھا! اور یہ بھی جان پایا تھا کہ دونوں تین ماہ سے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی بہانے ایک دوسرے سے ملتی رہی تھیں اور کل بھی وہ طے شدہ پروگرام کے تحت اپنے اپنے بے بی کو کارٹس (Carts) میں بٹھا کر ان کو سیر کراتے کراتے ایک پارک میں ملی تھیں اور شروع شروع میں بچوں کے بارے میں خوشگوار باتیں کرتی رہی تھیں مگر اچانک ایک عورت بول پڑی تھی۔

''تمھارے منّا کو میں نے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا! دیکھو تو میری منّی اس وقت بھی مسکرا رہی ہے!''

''مسکراہٹیں دیکھ کر تمھارا چہرہ سوجھ کیوں گیا؟'' دوسری طنزاً بول پڑی تھی:

''ہاں تمھاری منّی رکھا ہے، بلکہ جب وہ بڑی ہو کر پوچھے گی۔ کرشن کیوں گورا، میں کیوں کالی تو۔ کیا کہو گی؟ مرچیں لگ گئی نا؟''

''مجھے نہیں، تمھیں لگ گئی ہیں آنکھوں میں! منّی کے گلے میں یہ موتی کا دانہ! سمجھ لو یہ ہے چندرما کا ٹکڑا۔ جو تمھیں نظر نہیں آتا ہے!''

''چندرما کا ٹکڑا کیا کرے گا۔ جب چندرما خود سورج سے روشنی مانگتا ہے! سن رہی ہو چاندنی پر اترانے والی!''

''تم اپنے منّا کو سورج سمجھتی ہو؟''

''جو ہے، سو ہے۔ دیکھو تو میرے منّا کا ماتھا۔ ایسا ماتھا چکرورتی مہاراجوں کا ہوتا ہے۔''

''میری منّی چکرورتی مہاراجا کی بیٹی جیسی ہے۔ اُس کے کھلونے بدیش سے منگوائے جاتے ہیں، بلکہ کپڑے بھی۔''

''میرا منّا امریکی چاکلیٹ کھاتا ہے، سمجھی تم؟''

''میری منّی اپنے چاکلیٹ پھینک دیتی ہے تو محلّے کے بچے اُٹھا کر کھا لیتے ہیں۔''

''بہت غرور ہے اپنی منّی پر؟''

''کیوں نا ہو۔ بڑے گھر کی بیٹی جو ہے۔ ہنس ہوتی تو کھانے کے لیے موتی ملتے!''

''بہت غرور ہے اپنے گھر والوں پر۔''

''کیوں نا ہو۔ ہمارے پاس چار موٹریں ہیں!''

''ہمارے پاس چھ کاریں ہیں۔ ساتویں تب آئے گی جب منّا اسکول جائے گا۔''

یہ جملے تھانے دار نے ان عورتوں کی زبانی سن لیے جب دونوں کی گفتگو کا حوالہ دے کر ایک دوسرے پر جنگ ٹھونس کر بار بار کہتے ہوئے اپنی ہلکی پھلکی سرگوشیانہ گفتگو کو خود ہی کاٹ کر چلا چلا کر کہتی جا رہی تھیں اور پھر ان ہی جملوں کو بارود بنا کر ایک دوسرے پر پھینک رہی تھیں۔

''ایسا کہا نا تم نے؟''

''کیوں میری منّی کو کالی کہا۔ دیکھ، دیکھ۔ منّی کا رنگ گندمی ہے۔''

''گوری نہیں ہے نا؟''

''نہیں ہے! تو کیا ہوا؟ کہتے ہیں لیلیٰ بھی گوری نہیں تھی۔ رنگ دیکھنا اور بات ہے، خوبصورتی دیکھنا اور بات ہے۔ بندر کے چہرے کے بال اگر اُسترے سے صاف کیے جائیں تو گورا انگریز ہی نظر آئے گا۔''

''میں تو ہنسی روکنا بھی چاہوں تو روک نہیں پاتی۔''

''کس بات پر ہنسی آ رہی ہے تمھیں؟''

''بلّی کو شیرنی کوئی کہے تو ہنسی روک نہیں پاتی ہوں۔''

''تو کیا سفید چوہا اپنی مونچھیں دکھا کر شیر بن جائے گا؟''

''چپ! اپنی منّی کے لیے کسی ریچھ کی تلاش کر لو تا کہ کالی کو کالا ملے!''

''ریچھ سفید رنگ کے بھی ہوتے ہیں! میں ڈھونڈ لوں تمھاری دلہن؟''

پھر کل کی طرح وہ آج دو دو ہاتھ کرنے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے بال نوچنے لگی تھیں۔ گویا ایک ڈرامے کے منظر کا حوالہ دے کر وہ منظر لاک اپ میں رہ کر بھی شدت کے جذبات کے ساتھ ادا بھی ہو چکے تھے۔ دراصل کل کا جھگڑا ایک ادھوری کہانی بن کر رہ گئی تھی کیونکہ دونوں بچے رو پڑے تھے اور دونوں عورتیں اپنے دل و دماغ میں اپنے جذبات، احساسات اور انتقامی جذبات لے کر آج صبح سویرے میدانِ جنگ میں وعدے کے مطابق ویسے ہی ملی تھیں جیسے رستم اور سہراب آخری لڑائی لڑنے آئے تھے۔

میدانِ جنگ بازار تھا جہاں دونوں رٹے ہوئے جملے چلا چلا کر ایک دوسرے کے بال کھینچتے رہے۔ منہ نوچتے رہے۔ چیخ چیخ کر لہولہان کر رہے تھے۔ فقط یہ ثابت کرنے کی خاطر کہ کس کے گھر والے بہتر ہیں اور کس کے گھر والے کمتر بلکہ بدتر۔

ٹریفک جام ہو گیا تھا اس لیے دونوں کو گرفتار کر کے تھانے لایا گیا تھا۔ تھانے دار چونکہ ان

کی سرگوشیانہ باتیں نہیں سن پایا تھا اس لیے وہ دونوں کے ایک دوسرے سے اچانک اُمڈ رہے پیار محبت، جذبۂ ہمدردی کی وجہ نہیں جان پایا تھا۔

چونکہ دونوں عورتیں اپنے گھر والوں کے بارے میں نہ تو کوئی اطلاع دیتی ہیں اور نہ اپنے گھر کا ایڈریس یا فون نمبر، اس لیے وہ نہ تو عورتوں کو جانے دینے کی اجازت کے حق میں ہے اور نہ وہ چاہتا ہے کہ دونوں عورتیں رات لاک اپ میں گزار دیں کیونکہ وہ جب اپنے اِرد گرد لوگوں کو بھی دونوں کے نیم عریاں پستانوں کو بھوکے بھیڑیوں کی طرح دیکھتے ہوئے دیکھتا ہے تب وہ خدشات کی دلدل میں دھنس جاتا ہے۔

کسی اور پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود ہی دونوں کو اپنائیت کا احساس دلا کر ان کے گھروں کا پتا جانتے ہی وہ گئی رات دونوں کو اپنے اپنے گھروں کی پھاٹکوں کے سامنے چھوڑ کر جلدی سے چل پڑا تھا تاکہ دونوں کے گھر والوں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ حوالات میں بند تھیں۔

اتفاقاً دونوں کے گھر ایک ہی کالونی میں تھے اور پاس پاس تھے۔ ایک عورت کو چھوڑ کر وہ جب دوسری کو چھوڑ کر واپس لوٹا تھا تب پہلی عورت سسک سسک کر چوکیدار سے پھاٹک کے باہر بتا رہی تھی ''کیا ایسے ہوتے ہیں گھر والے؟ یہ بھی نہ پوچھا کہ تم کو دن بھر کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا! یہ بھی نہیں پوچھا کہ کچھ کھایا پیا! مجھے منّی سے بھی نہ ملنے دیا! کیسے گھر والے ہیں یہ؟ دھکے دے کر نکال دیا مجھے! کیوں؟ کیوں؟''

چوکیدار نے خاموشی سے دروازہ بند کرتے ہوئے نہایت حلیمی سے کہا۔ ''بیٹی! بغیر اجازت کوئی دن بھر باہر رہے اور اطلاع دیے بغیر گئی رات گھر لوٹے تو اپنے گھر والے بھی ناراض ہو جاتے ہیں۔ ہاں، مالک اور مالکن کی یہ بات میرے دل میں بھی چھید کر گئی کہ انھوں نے تمھاری اس حالت کو تمھاری بدکاری کا نام کیوں دیا؟ یہ کیوں کہہ دیا کہ فنا نہیں ہو سکتی تو دفع ہو جاؤ! یہ کیوں کہا کہ تم منّی کو اِغوا کروا سکتی ہو!''

تھانے دار یہ سن کر جب پہلی عورت کو اپنی جیب میں بٹھا کر واپس دوسری عورت کا حال پتا کرنے گیا تو وہ راستے میں مل گئی۔ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے!

تھانے دار نے پوچھ تاچھ کی تو یہ جانکاری بھی حاصل ہوئی کہ اپنے بچوں پر رونے والی یہ جڑواں بہنیں بچپن سے ہی ضدی لاڈلی بیٹیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خاطر پہلے خوب لڑتی رہتی ہیں اور پھر ایک نرالے انداز میں ایک دوسرے سے والہانہ پیار کرتی ہیں اس بار بھی وہ اپنی

عادت اور عیب کی غلام بن کر، غیروں کو اپنے ساتھ جوڑ کر ایک دوسرے سے اس قدر ایک کھیل میں اُلجھا کر اپنے آپ کو ہی کھلونوں کی طرح توڑ دیا تھا!

یہ سوچ کر وہ ان کے ماں باپ سے یہ ضرور پوچھے گا کہ انھوں نے اُس عیب کو کیوں نہیں مار ڈالا جو اُن زہریلے کیڑوں کو جنم دیتے ہیں جو سر اُٹھا کر ڈنک مارتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر کے لیے تکلیف دے کر بعد میں خوشی دیتے ہیں۔ نشہ آور انجکشنوں کی طرح! جب اُس نے والدین کے بارے میں پوچھا تو یہ جان کر سکتے میں آ گیا کہ ایک کھاتے پیتے گھر زمین دار کی بیٹیاں اپنے والدین کی موت کے بعد گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ شہر میں کام کرنے آئی ہیں کیونکہ سیلاب سے ان کے کھیت اکھڑ گئے ہیں اور ان کا گاؤں اُجڑ گیا ہے۔ یہ جان کر ایک حساس اور فرض شناس پولیس افسر یوں محسوس کرتا رہا جیسے وہ ایک ایسا ملاح ہے جو بے بس مسافروں کو دریا پار اُتارنا چاہتا ہے مگر اُس کی کشتی گرداب کی طرف جا رہی ہے!!

○○

ضرورت

ضرورت ہی ہر ایجاد کی ماں ہے! وہ دونوں یہ جانتے ہیں کہ یہ بابو جی کا تکیۂ کلام ہے اور اس کے بعد وہ خود پر گزرے ہوئے واقعات سناتے رہتے ہیں۔ وہ بھی ایک لمبی تمہید باندھ کر اور ڈرامائی انداز میں، بالکل ویسے ہی جیسے وہ ہزاروں تو نہیں سیکڑوں بار پہلے ہی سناتے آئے ہیں۔

وہ دونوں بھی بابو جی کے قصّے کہانیاں اتنی بار سن چکے ہیں کہ ان کو یہ بھی یاد ہے کہ بابو جی کہاں ایک وقفہ دیں گے، کہاں جذبات کی رَو میں بہہ جائیں گے، کہاں اپنی باتوں کے تسلسل کو توڑ کر مسکرائیں گے اور پھر اپنی ایجاد کی گئی ترکیب کے بارے میں بتا کر ایک فاتحانہ قہقہہ لگا کر اخبار پڑھ لیں گے۔ مگر آج ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ اپنے تکیۂ کلام کے بعد انھوں نے معمول کے خلاف اخبار کی خبر پڑھ کر سنا دی تھی گویا ریڈیو پر اعلانِ جنگ سنایا جا رہا تھا۔

گھر کے باقی افراد کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے جبکہ وہ دونوں نہ صرف چونک پڑے تھے بلکہ خوفزدہ ہو کر قالین کی بجائے کمرے کے ایک کونے میں دُبک کر بیٹھے بیٹھے اپنے بارے میں باتیں کرتے رہے اور اپنی ڈوبی جا رہی سانسوں کو تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ کیا آج کل ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہر ایجاد خود غرضی کے مقصد سے کی جاتی ہے۔ یہ دونوں اس گھر کے پالتو کتّے ہیں جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے گھر کے لوگوں کے لاڈلے ہیں۔

یہ گھر عجیب ہے مگر اُس کو عجائب گھر اس لیے نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہاں کے عجوبے ایک ہی جگہ رکھے گئے بے جان مجسمے نہیں ہیں بلکہ ایک عالی شان مکان میں رہنے والے ایک خاندان کے اٹوٹ جز ہیں۔

بابو جی کی عمر اَسّی سال سے زیادہ ہی ہوگی مگر وہ چست اور تندرست ہیں وہ اس لیے کہ ضرورت کے مطابق کھاتے پیتے ہیں اور روز ورزش کرتے ہیں۔ صبح سویرے سیر کرتے ہیں۔ جب ہیروشما اور ناگاساکی پر ایٹم بم نے پہلی بار دھرتی پر زندگی کو لال دھول اوڑھا کر فنا کر دیا تھا تب

وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ اُس وقت ایک جملہ زبان پر آیا تھا۔ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور وہ کئی دنوں تک سوچتا رہا تھا کہ کیا کوئی ایٹم بم کا توڑ ایجاد کر سکے گا۔ یعنی جیسے راکشسوں کے اگنی بان کو دیوتاؤں کا ورشا بان ناکارہ بنا دیتا ہے کچھ ایسا کیا جائے تا کہ آسمان سے آگ برسے مگر زمین اُس کا حال یوں کردے جیسے دہکتے ہوئے انگاروں کا حال پانی میں گر کر ہوتا ہے۔

وہ ایک سائنس داں بن کر خود ہی ایسی ایجاد کرنے کا خواہش مند تھا مگر ایک غریب کلرک بن گیا تھا۔ اگر اپنے افسر اعلا کی اپاہج بیٹی سے شادی نہیں کرتا تو شاید فریب کی دھول سے مرجھا گئی آنکھوں سے وہ اچھی زندگی کے خواب بھی نہیں دیکھ پاتا۔ضرورت نے اس کو اس راستے کو قبول کر کے ایک حسین منزل تک پہنچا دیا تھا۔محکمۂ جنگلات کے کنسرویٹر (Conservator) کا ذہین داماد ایک سائنس داں تو نہیں بن سکا تھا مگر ایک بہت بڑی فیکٹری کا مالک بننے میں کامیاب ہو گیا۔لیکن ترقی کی منزلیں تیز گامی سے پا کر بھی اس شخص کی یادداشت کے خزانے میں تیس سال کی عمر تک گزاری اپنی زندگی کی تلخیاں محفوظ ہیں اور شاید اُن یادوں کو تروتازہ رکھنے کی خاطر وہ روز کوئی نہ کوئی گزرا واقعہ یوں سناتا رہتا ہے گویا ایک ریکارڈ شدہ ٹیپ (Tape) بج رہا ہو۔اس کے علاوہ وہ خود کو ایک سائنس داں مان کر ضرورت کو ماں کا درجہ دے کر ایک ایسی ایجاد کو جنم دے کر انسان دشمن مہلک ایجادات کا توڑ پیدا کرنے کی خواہش کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ ہوتا بھی کیسے؟ وہ اپنی اس خواہش کو بھی تروتازہ رکھنے کی خاطر ایک تو اخباروں کا مطالعہ کرتا رہتا ہے اور پھر سائنس سے تعلق رکھنے والے جرائد و کتابوں کو یوں دل لگا کر پڑھتا ہے گویا اپنی ایجاد کو آخری شکل دے کر فوری طور پر تجربہ کرنا چاہتا ہو۔

اُس کا بیٹا اور اُس کی بہو فیکٹری میں اپنی مصروفیت کا حوالہ دے کر بابو جی کی باتوں کے سلسلے کو اُن کا تکیۂ کلام یعنی 'ضرورت ہی ایجاد کی ماں ہے' سن کر کاٹ دیتے ہیں! بابو جی کے دونوں پوتے ایم ایس سی کرنے کے باوجود اپنے دادا کی خواہش کو اپنی منزل بنانے کی بجائے اپنے باپ کی تجارت کو فروغ دینے کی خاطر امریکہ میں مینجمنٹ (Management) کورس کرنے گئے ہیں۔ بڑا پوتا فلموں میں کام کرنا چاہتا ہے اس لیے جب بھی وہ گھر میں ہوتا ہے تب وہ اپنے دادا کی کئی بار سنی ہوئی باتیں سننے کی بجائے اپنی دادی کی زبانی اساطیری کتھائیں سنتا رہتا ہے یا پھر جن پریوں کی طلسمی کہانیاں سنتا رہتا ہے۔لیکن بابو جی اور اُن کی اپاہج بیوی کی کھٹی میٹھی باتیں ایک تو قالین پر بیٹھے گھر کے دو پالتو کتے سن لیتے ہیں یا پھر گھر کے نوکر مگر وہ بھی کبھی کبھار جب ان کو بابو جی کے حکم کی

تعمیل کر کے کام کا بہانہ بنا کر کھسکنے کا موقع نہیں مل پاتا ہے۔ گویا وہ بھی اس گھر کے عجوبے ہیں۔

گھر میں ایک اور عجوبہ ہے۔ ڈرائنگ روم میں ایک عالی شان قندیل کی طرح لٹک رہے ایک بے حد خوبصورت پنجرے میں رکھا ہوا ایک طوطا جو تب سے بولنے لگا ہے جب سے اُس نے مرچی کھالی ہے۔ مگر وہ اپنے دل کی بات اپنی زبان پر نہیں لا سکتا ہے، وجہ یہ کہ وہ انسان کی باتیں کہاں سمجھ پاتا ہے وہ تو رَٹے ہوئے جملے بولتا ہے۔ خاص طور پر بابو جی کے جملے، کیونکہ وہ جو بھی بولتے رہتے ہیں رَٹے ہوئے مکالمے جیسے ہی تو ہوتے ہیں!

جب بھی کوئی رشتے دار، محلے دار، واقف کار، صنعت کار مہمان اور سیاست داں بلکہ فیکٹری میں کام کرنے والا کاریگر سبزی والا، دودھ والا، دھوبی گھر میں داخل ہوتا ہے تب طوطا اپنے پَر پھڑ پھڑاتے ہوئے بول پڑتا ہے:

''نمسکار! آفتوں کا دور چل رہا ہے۔ لو خود اخبار پڑھ لو! کیا آپ میری مدد کریں گے؟

میں اگر سائنس داں ہوتا تو کائنات کو عذابِ شدید سے بچانے کی خاطر ثواب کا کام کرتا!

کوشش تو کی تھی میں نے! گاؤں سے دس کلومیٹر پیدل چل کر اسکول جایا کرتا! ایک گھر میں نوکری کرتے ہوئے شہر میں بھی چار کلومیٹر پیدل چل کر کالج جایا کرتا تھا۔ مگر منزل بہت دُور تھی اور میرے قدم چھوٹے تھے!''

سننے والا شاید طوطے کی باتیں سمجھ نہیں پاتے تھے مگر جب بابو جی بھی یہی باتیں سنایا کرتے تھے تب کچھ لوگ ان کو دیوانہ سمجھ کر ایک بوڑھے رئیس پر ترس کھایا کرتے تھے اور کچھ لوگ ان کی باتوں کو حالاتِ حاضرہ کا عکس سمجھ کر چند لمحات کے لیے سوچ کے سمندر کی عمیق گہرائی میں ڈبکیاں لگاتے رہتے تھے۔

یہ تو اس گھر میں روز ہوتا رہتا ہے اور کُتے یہ باتیں روز سننے کے عادی ہو چکے تھے۔ اور نہ حیران ہوتے تھے نہ پریشان! دراصل وہ عام کتے نہیں ہیں۔ اس لیے جو انھوں نے آج سنا ہے وہ کچھ خاص ہے!! نہایت اعلیٰ نسل کے خوبصورت کتے جو ایک ہی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر ایک کا رنگ کالا ہے اور دوسرے کا رنگ سفید۔ دونوں کی خوبی یہ ہے کہ دونوں جانوروں، پرندوں اور انسانوں کی زبان سمجھ تو لیتے ہیں مگر مرچیاں کھا کر بھی بول نہیں سکتے! جبھی تو وہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ مگر نہ بھونک اور نہ اونگھ کر بلکہ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک جھانک کر گفتگو کر رہے ہیں!

صبح سویرے جب بابوجی سیر کرنے گئے تھے تب چھٹی کا پورا پورا فائدہ لے کر بابوجی کے پوتے دونوں کتوں کو گود میں اٹھا اپنی دادی سے ایک کتھا سن رہے تھے۔ دادی اپنے مخصوص انداز میں سنا رہی تھی: ''ایک راجا تھا، اس کے پاس دنیا کی ہر نسل کے گھوڑے تھے۔ بہت ہی خوبصورت، کچھ چھوٹے قد کے، کچھ لمبے قد کے۔ راجا کے شوق کی دیکھا دیکھی اُس کی پرجا نے بھی گھوڑے پالے تھے۔ یوں یہ گھوڑوں کا نگر تھا۔ دُور دُور سے گھوڑوں کے تاجر اس نگر میں گھوڑے بیچنے آیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہاں کے لوگ گھوڑے خریدتے تو تھے مگر بیچتے نہیں تھے۔

''دُور ایک پہاڑی علاقے میں ایک ڈائن رہتی تھی اور اُس کی من پسند غذا صرف گھوڑے کا خون تھا۔ پھر ایک دن جب اُس نے اس نگر کے بارے میں سنا تب وہ خوبصورت لڑکی کے رُوپ میں راجا سے پیار کرنے لگی۔ راجا نے اُس کو اپنی پٹ رانی بنا دیا۔ پھر وہ روز رات کو ایک شیرنی کا رُوپ بدل کر پہلے نگر کے سارے گھوڑوں کا خون پی گئی اور پھر راجا کے تمام گھوڑوں کا خون پی گئی۔''

کہانی ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ بابوجی کے بیٹے نے اپنی ماں کو ٹوک کر کہا تھا:

''اماں یہ کیسی کہانیاں سنا رہی ہو اپنے پوتوں کو؟''

بابوجی کو کل سے سائبیریا سے ہمارے ملک میں آئی ہوئی مرغابیوں کا غم ستا رہا ہے! ہر سال وہ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ہمارے ملک میں آجاتی ہیں اور ہر سال شکاری اُن پر گولیاں چلاتے ہیں۔ یہ سب جان کر بھی وہ کیوں آجاتی ہیں۔ موت کے منہ میں!''

وہ کچھ اور بھی کہتا مگر بابوجی نے اندر آتے ہی ٹوک کر کہا۔ ''ضرورت ہی تو ایجاد کی ماں ہے۔ کوئی تو ایسی ایجاد کر لیتا جس سے برف سے ڈھکے علاقوں میں گرم ہَوا کی لہریں پہنچا کر ہجرت کرنے والے پرندوں کو روکا جا سکتا!''

اس سے پہلے کہ وہ تمہید باندھ کر اپنی بات جاری رکھتے ان کی بیوی نے ایک قہقہہ لگا کر کہا:

''کچے آم پکے ہو جاتے ہیں مگر آپ کی بات ختم نہیں ہوتی ہے اس لیے اچھا کیا جو چل پڑے۔''

اس بار بابوجی نے غصے سے چلا چلا کر اپنی بات پوری کرنے کی بجائے آہیں بھرتے ہوئے کہا: ''آج کے اخبار میں گزرے کل کی وہ خبر ہے جو آنے والے کل کی ایک دردناک تصویر دکھا رہی ہے اور ایک خطرناک حادثے کی اطلاع دے رہی ہے! مجھے قیامت کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔''

وہ بہت کچھ کہتے رہے مگر دونوں کتے یہ جان گئے کہ بابوجی اخبار میں چھپی اس خبر سے برہم

ہو گئے ہیں کہ ایک پچاس فٹ لمبے اور دس فٹ موٹے اجگر کو صرف کالے رنگ کے کتے اچھے لگتے ہیں اور ان کو کھا کر دن بدن موٹا اور لمبا ہوتا جا رہا ہے۔

بابو جی یہ چاہتے تھے کہ کتوں کو بچایا جائے اور ضرورت ہے کہ اجگر کو مار دیا جائے تا کہ وہ اتنا بڑا نہ ہو جائے کہ کسی برِّ اعظم کو نگل جائے! ان کو یہ خدشہ تھا کہ جیسے تجربات کے لیے بندروں کو اسمگلنگ کیا جا رہا ہے ویسے ہی مسیحائی کا دعویٰ کرنے والے آزاد دنیا کے کتوں پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں گے۔ بابو جی بوکھلا کر یہ بات چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ تیل کے کنوؤں پر نظریں رکھ کر جنگ کرنے والے بازاری کتوں کے بعد انسان کے سب سے وفادار پالتو کتوں کو بھی چھین کر لے جائیں گے۔ دونوں کتے بابو جی کی باتیں سن کر خوفزدہ ہو کر صوفے سے اُتر کر قالین پر بیٹھ گئے یہ سوچ کر کہ خبر سن کر بابو جی کا کاروباری بیٹا حملے سے بچنے کے لیے ان کا سودا طے نہ کر دے اس لیے وہ کھسک کر کہیں چھپ جانے کی کوشش کرنا چاہتے تھے وہ بھی بابو جی کے تکیۂ کلام یعنی ضرورت ہی ایجاد کی ماں ہے سن کر!

اس بار یہ جملہ اُنھوں نے طوطے کی زبان میں سن لیا تھا! اور وہ عادتاً یہ جملہ بار بار بولتا جا رہا تھا اور ہر بار دونوں کتے یوں خوفزدہ ہو رہے تھے گویا ان کو پکڑنے کے لیے کوئی ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ ''سنا ہے اجگر اپنے شکار کو نگل جاتا ہے۔'' سفید رنگ کے کتے نے دبی آواز میں پوچھا تو کالے رنگ کے کتے نے آہ بھر کر کہا ''ہاں! بابو جی نے کچھ ایسا ہی کہا تھا۔ مگر تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ بھائی! تمھارا رنگ سفید جو ہے! کاش کوئی ضرورت کے مطابق میرے کالے بالوں کو سفید کر دیتا تو شاید میں بھی بچ جاتا!!''

سفید رنگ کا کتا رو پڑا اور پھر سسک سسک کر بول پڑا۔ ''ایٹم بم رنگ دیکھ کر شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے کیا؟ اور اگر اجگر کی خوراک پوری کرنے کی خاطر تاجروں کو کالے رنگ کے کتوں کی قلت ہو گی تب وہ اپنی غرض کی خاطر میرے سفید بالوں کو رنگ کر کالا بنا دیں گے!''

پھر دونوں کتے ایک دوسرے کی آنسوؤں سے بھری بھری آنکھوں میں اپنے انجام کے عکس دیکھتے رہے!

OO

رنگ

یہ کل رات کی بات تھی۔ تب ہال میں رنگ جگمگا رہے تھے اور خوشبو بکھیر رہے تھے! ایسا پہلی بار ہوا تھا جب ایک کامیاب فیشن شو کے رسمی اختتام کے بعد اچانک شو پھر سے شروع ہوا تھا۔ یعنی جب جگمگاتی رنگ برنگی روشنیوں میں فیشن شو میں حصہ لینے والی مشہور و معروف ماڈل لڑکیاں مختلف جانے پہچانے فیشن ڈیزائنرز کی تخلیق کی گئیں پوشاکیں پہن کر اسٹیج پر الوداعی تقریب میں ہاتھ ہلا ہلا کر مسکراہٹیں بکھیر رہی تھیں تب اچانک ہال کے کسی کونے میں بیٹھا ایک بے نام شخص اپنی ماڈل کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوا تھا! ناظرین کے احتجاج سے پہلے شو کرانے والے شاید اس بیہودہ دراندازی کو سختی سے روک دیتے مگر ایک سحر انگیز جسم پر ایک حیرت انگیز پوشاک دیکھ کر یوں لگ رہا تھا گویا کسی مصوّر کی غیر فانی تصویر کینوس چھوڑ کر اسٹیج پر خود چلی آئی تھی! اور جو شخص اس کو انگلی پکڑ کر لایا تھا وہ خود اپنے تراشے ہوئے بُت کو دیکھ کر سوچ رہا ہو کہ کیا اُس کا یہ مجسمہ انارکلی کی طرح کسی شہزادے کے تیر چلانے کے بعد اپنے دل کی بات کر سکے گا؟ بلکہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ایک تخلیق کار کی آرزو پوری ہوگی یا اُس کی آرزو اِس بار بھی حسرت میں بدل جائے گی؟ لیکن اِس بار ویسا ہی ہوا تھا جیسا اُس نے سوچا تھا۔ لڑکی کو دیکھ کر اسٹیج پر موجود تمام ماڈل لڑکیاں خود ہی پیچھے ہٹ کر ستاروں کی طرح چاند کو دیکھ رہی تھیں جبکہ ناظرین کی نگاہیں خالق اور تخلیق پر جمی ہوئی تھیں اور یوں دونوں شو پر چھا گئے تھے بلکہ جج حضرات کی خاص توجہ کا مرکز بھی بن گئے تھے۔ ایک مہمانِ خصوصی نے بلا جھجک جب یہ کہہ دیا کہ جیسا ستار کی مدد سے پنڈت روی شنکر نے برسوں پہلے مشرق کو مغرب سے ملا دیا تھا ویسے اِس قابلِ فخر آدمی نے آج مغرب کو مشرق سے ملا دیا ہے اور وہ بھی پوشاک کی مدد سے!

یہ جملہ سن کر گویا ایک دروازہ کھل گیا اور قصیدے ہال میں داخل ہو کر اُس کے احساسات کا

تعاقب کرتے رہے اور سوالات کی بوچھار کرتے رہے۔ جواب نہ ملنے پر اُس کی بے رُخی کو ایک کامیاب انسان کی ادا سمجھ کر خود ہی سوال کرتے رہے اور خود ہی جواب دیتے ہوئے اُس کے قریب سے گزر کر اُس کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے رہے!

کبھی خوابوں کی باتیں، کبھی تصورات کی باتیں، کبھی الہام کی باتیں، کبھی تقدیر کی باتیں، کبھی تدبیر کی باتیں اور کبھی اُکسانے کی خاطر اتفاق کی باتیں، یعنی کبھی فنکار کے بارے میں باتیں اور کبھی شاہکار کے بارے میں باتیں! جبکہ وہ خود اپنا سایہ ڈھونڈ رہا تھا جو اُس کو جگمگاتی روشنیوں میں کیسے مل جاتا؟

پچھلے دس سال سے وہ اپنے سائے سے بہت پیار کرنے لگا ہے نا؟ اس لیے! جبھی تو وہ نہ چڑھتے سورج کو دیکھنا چاہتا ہے اور نہ ڈوبتے آفتاب کو دیکھنے کا عادی ہے۔ ہاں اگر اپنی پیٹھ سورج کی طرف کر کے وہ ہر صبح اور شام ہونے سے پہلے اپنا لمبا سایہ دیکھ کر اپنے شکستہ دل کو تسلیاں دیا کرتا تھا یہ سوچ کر کہ میں بھی قد آور ہوں۔ اور پھر سوچتا رہتا تھا کہ اگر خواب دبی خواہشات کا عکس ہوتے ہیں تو کیا تعبیر تصورات کی پرچھائیاں ہوتی ہیں؟ اور اگر خواب الہام کی عکاسی کرتے ہیں تو میں جب اپنے جوانی میں ہی سفید بالوں کو خواب میں کالے ہوتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں تو میری زندگی میں بہار کیوں نہیں آتی ہے؟ ایسی باتیں وہ اس لیے سوچتا رہتا ہے کیونکہ اُس نے ٹالسٹائی کی کہانی میں پڑھ لیا ہے کہ ایک بیوی نے خواب میں اپنے شوہر کے کالے بالوں کو سفید ہوتے ہوئے دیکھ کر، خواب کو الہام سمجھ کر سفر پر جانے سے روکا تھا۔ مگر چونکہ وہ خواب کو ایک منظر سمجھتا تھا جو بند پلکوں میں کبھی ہنساتا ہے، کبھی رُلاتا ہے اور کبھی ڈراتا ہے، وہ سفر پر نکل پڑتا ہے۔ پھر ایک جھوٹے قتل کیس کا مجرم بن کر سزا کاٹتا ہے۔

آج اپنی شہرت دیکھ کر تذبذب میں ہے کہ کیا اُس کو سچ مچ کامیابی کا الہام مل چکا تھا؟ یا اُس کو اس کے تصور نے ایک شاہکار پیش کرنے کا موقع بخش دیا ہے؟ کیا اُس کی پیشکش واقعی ایک شاہکار ہے؟ اُس کا دن سوچتے سوچتے گزر چکا ہے اور یہ آج شام کی بات ہے! آرٹ، کلچر اور فیشن کو بھی فنونِ لطیفہ کا ایک قابلِ قدر جز سمجھنے والے تحقیق کاروں، تنقید نگاروں، آرٹ کے قدردانوں، جانے مانے میڈیا کے نمائندوں اور معاشرے کی شان بڑھانے والوں نے اُس کے اعزاز میں ایک عالی شان استقبالیہ کا اہتمام کیا ہے اس لیے مہمانِ خصوصی ہونے کی وجہ سے ہر نگاہ

اور ہر کیمرے کی آنکھ اُس کے چہرے پر مرکوز ہے۔ میڈیا والے اُس سے سوالات پوچھتے ہیں تو بے تکے جواب دے کر اُن کو چونکا دیتا ہے۔

ایک صحافی نے جب اُس سے کچھ اپنے بارے میں کہنے کی گزارش کی تو وہ بولتا رہا گویا ایک نیم خالی ٹیوب سے دبا دبا کر تھوڑا تھوڑا ٹوتھ پیسٹ نکال رہا ہو:

میرے والدین نے جو نام مجھے دیا تھا اُس کے لفظی معنی 'طاقتور' ہیں لیکن چونکہ میں جسمانی طور پر کمزور ہوں اس لیے میں نے اپنے آپ کو اس بھاری بوجھ سے الگ کر دیا۔ بھوک نے میرا اپنا بوجھ بھی ہلکا کر دیا تو میں ایک شاخ سے الگ ہوئے پتے کی طرح اُڑتا اس شہر میں پہنچا۔ قسمت دیکھنے والے طوطے نے فال نکالا تو اُس کی تحریر پڑھ کر میں اتنا جان گیا کہ ایک دن میں اپنے ایک سحر انگیز شاہکار سے دنیا کو چونکا دوں گا۔ تب میں نے 'ساحر' نام اپنا لیا۔ ساحر شاید اپنے بارے میں ایسی نجی باتیں چھپا لیتا مگر دس سال ایک نامور سینماٹوگرافر کے اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے وہ یہ جانتا ہے کہ ایک کامیاب انسان اگر یہ کہہ دے کہ اُس نے اپنی ماں کی ساڑی ایک کباڑی کو فقط ایک فلم دیکھنے کے ٹکٹ کے عوض بیچ ڈالی تھی تب پریس والے ایک عیب کو جنون کا نام دے دیتے ہیں جبکہ ایک غریب اپنی بیوی کے علاج کے لیے اپنی کمبل بیچ ڈالے تو اس کو چور کہہ کر پولیس کے حوالے کیا جاتا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ زندگی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو ساحر نے مرحوم چارلی چیپلن کا حوالہ دے کر کہا کہ اگر ایک برف کا ٹکڑا اشرار تاً ایک امیر عورت کے کپڑوں میں ڈالا جائے تو ایک کامیڈی جنم لیتی ہے۔ مگر یہی عمل کسی غریب عورت کے ساتھ کیا جائے تو ٹریجڈی کی نمائش ہوا کرتی ہے۔ اور یہی زندگی کے دو رنگ ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ساحر کا سحر محفل پر یوں سوار ہو گیا کہ سوالات کرنے والے یہ بھول گئے کہ وہ ایک ڈریس ڈیزائنر کے استقبالیہ میں شرکت کرنے آئے ہیں۔

مختلف سماجی، سیاسی، ثقافتی موضوعات کے بارے میں پوچھے گئے سوالات کے بے تکے جوابات سن کر بھی ساحر کے لفظ لفظ اور ہر جملے کو اپنی کہانیوں کو سنسنی خیز بنانے کی خاطر کوامر کرتے رہے۔ ساحر ایک دانشور ہے! ساحر ایک فلسفی ہے! ساحر ایک اشرف المخلوق ہے!

یہ تاثرات پُر کیف ہوا کے جھونکوں کی طرح ہال میں گھومتے رہے۔ نامور ڈریس ڈیزائنرز اور اُن کے ساتھ آئی ہوئی ماڈل لڑکیاں زرق برق پوشاکیں پہنے ہوئے اپنی مخصوص ادائیں دکھا

دکھا کر بھی حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام ہوگئیں تو وہ بطور احتجاج جانے ہی والی تھیں جب ایک سرگوشی نے ہوا کے جھونکوں کو گویا روک دیا۔ ماحول میں اچانک ایک تبدیلی رونما ہوئی اور ساحر سے اُس کے اِرد گرد کے لوگوں نے سخت لہجے میں اُس کی ماڈل لڑکی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنا شروع کر دیا۔

کچھ لوگ گویا گہری نیند سے جاگ کر بڑبڑانے لگے۔ ارے یہ میڈیا والے نہ ہوں تو اصلی بات نقلی باتوں کے تودوں کے نیچے دب کر رہ جائے گی! کمال ہے۔ جس ڈریس اور ماڈل گرل کی وجہ سے ایک گمنام مصور راتوں رات اتنی شہرت اور عزت ہم لوگوں سے حاصل کر چکا ہے وہ آج کہیں نظر نہیں آرہی ہے؟ کیوں؟ کیوں؟ کہیں وہی اصلی تخلیق کار تو نہیں ہے؟ کمال ہے؟ کسی کے ناول کو اپنا بتا کر انعامات و اعزازات حاصل کرتے تو سنا ہے، کیا ہمارے فیلڈ میں بھی ایسے شاطر لوگ گھس آئے ہیں؟

ارے جادوگر تماشہ دکھا گیا اور ہم سمجھ بیٹھے کہ ہمارے سامنے حقیقت ہے!

یہ کوئی نیا گو گیا پاشا تو نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو کہتا کیوں نہیں؟ تب شاید ساری دنیا میں مشہور ہو جاتی؟ کیوں نا پوچھ لیا جائے ساحر سے کہ تمھاری ماڈل کہاں ہے؟ لیکن وہ سیدھے سوالات کے اُلٹے جوابات دیتا رہتا ہے۔ ستاروں کے بارے میں پوچھو تو جواب پہاڑوں کے حوالے سے دے کر ہم سب کو لاجواب کر دیتا ہے۔ پھر بھی پوچھ ہی لیا جائے تو بہتر!

اس سے پہلے کہ دانشور دانشمندی سے ساحر سے سوالات کرتے چند بے باک ٹی وی رپورٹروں نے ساحر کو اپنی ماڈل کے بارے میں کھل کر باتیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ چند روز پہلے ساحر ایک سڑک چھاپ ڈھابے پر کھانا کھا رہا تھا جب اُس نے سڑک کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھی عورت کو اپنے بچے کو دودھ پلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایسے منظر وہ روز کہیں نہ کہیں دیکھا کرتا تھا مگر اِس بار یہ منظر قابلِ دلچسپی اس لیے بنا تھا کیونکہ عورت ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا کاٹ کر پہلے ڈھابے کی طرف دیکھ کر یوں ظاہر کرتی تھی گویا دل کے پتیلے میں روٹی کے ٹکڑے کو ڈال کر مزے لے لے کر کھا رہی ہو!

یہ منظر ڈھابے کا بوڑھا مالک بھی ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا تھا۔ ساحر سمجھ گیا تھا کہ بوڑھا عورت کے نیم عریاں پستانوں کو دیکھ رہا ہوگا، لیکن بات کچھ اور تھی۔ بوڑھا سڑک پار کر کے عورت کے سامنے

کھڑا ہو کر جانے کیا کہہ رہا تھا جس کو سن کر عورت قہقہے لگاتی جا رہی تھی۔ اچانک جب بوڑھا جوان عورت سے جھگڑنے لگا تب ساحر بھی سڑک پار کر کے بوڑھے اور بے حد خوبصورت عورت کے درمیان کھڑے ہو کر دونوں کی باتیں سن کر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ جھگڑا اس بات پر ہو رہا تھا کہ بوڑھا عورت سے دال کے پیسے مانگ رہا تھا اور عورت جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی کھول کر جھوٹ موٹ بوڑھے کے ہاتھ میں پیسے تھما کر کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی اور یوں بوڑھا بار بار بھڑک کر اب غصے سے چلانے لگا تھا۔ جواباً عورت یہ کہہ رہی تھی کہ جیسی میں نے تمھاری دال کھائی ہے ویسے ہی پیسے دے رہی ہوں۔ عورت اس کے بعد گھبرا گئی تھی اس لیے ساحر اُس کو اس اینٹ کے بھٹے پر لے گیا تھا جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ کام کرتی تھی۔

مشکلاً اٹھارہ سال کی یہ خوبصورت عورت اپنے ایک ماہ کے بچے کو پولیو ڈراپس پلانے کی خاطر اسپتال لے گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عورت کی نگاہیں مرد کے ارادوں کو بھانپ لیتی ہیں اس لیے دو اجنبی دو دوست بن گئے تھے۔

اُس رات ساحر سو نہیں پایا تھا۔ بار بار اس عورت کا چہرہ اُس کے سامنے آ جایا کرتا تھا۔ اُس کا پریوں جیسا بدن، اُلجھے ہوئے بال جو آج کل کے فیشن کے حساب سے سلجھے ہوئے بلکہ کسی نامور ہیئر ڈریسر کے سجائے ہوئے نظر آ رہے تھے، وہ مسکراتی تھی تو دانت موتیوں کی طرح چمک اٹھتے تھے جبکہ اُس کے گالوں پر ایک سیب کی طرح لالی اُبھر آیا کرتی تھی اور پھر وہ شرماتی تو اُس کا چہرہ ایک مکمل طور پر لال رنگ کے سیب کی مانند نظر آیا کرتا تھا۔ اُس کے جسم سے گیلی مٹی کی خوشبو آتی تھی۔ اُس نے بے ڈھنگے کپڑے پہن رکھے تھے مگر ایک مصوّر کی نظر میں وہ ایک بے نظیر کولاج کی طرح نظر آ رہی تھی۔ ایک مردانہ مگر بہت بڑے سائز کی قیمتی رنگین قمیص جس میں کئی چھید تھے اور ایک بازو ہی نہیں تھا، قمیص میں ایک بھی بٹن نہیں تھا اس لیے جب وہ اپنے بچے کو سینے سے الگ کرتی تھی تب اُس کے بے قابو پستان دیکھنے والوں پر گویا بجلی گرا دیتے تھے! اپنی بے حد خوبصورت ٹانگوں کو اُس نے ایک چھوٹے سائز کی پھٹی پرانی اسکرٹ سے چھپانے کی کوشش تو کی تھی مگر اُس کے لمبے قد کی وجہ سے وہ اُن دریچوں، کھلی کھڑکیوں اور کھلے درازوں سے اُس کے جسم کی خوبصورتی جھانک کر دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

ساحر نے اتنا کہہ دیا تو ہوا کا رُخ پھر بدل کر یہ سرگوشیاں اپنے ساتھ لیتا گیا کہ ساحر نے

کسی جیتی جاگتی مورت سے متاثر ہو کر اپنی تخلیق کی صورت بنا دی ہے یا پھر اُس کے تصورات کی پرچھائیں جیتی جاگتی تصویر بن کر ناظرین کے سامنے آئی ہے!

ایک دانشور نے بہ آواز بلند کہا کہ ساحر نے جو بھی کہا اُس نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ لوگوں کو تحریروں میں تصویریں اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہیں جبکہ مجھے اس جادوگر کی تقریر میں ایک پُرکشش تصویر نظر آ رہی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کل ساحر کی ماڈل کو دیکھا تھا یا نہیں مگر آج اُس کو سن کر دیکھ رہا ہوں آنکھیں بند کر کے! مگر ساحر نے جب وہیں سے اپنا کلام جاری رکھا جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا، ہوا کے رُخ بدلنے کی وجہ سے! اُس نے کہا کہ وہ کئی دنوں سے فیشن شو دیکھ کر بوکھلا گیا تھا اور وہ جو کچھ کیمرے کی آنکھ سے دیکھتا رہا تھا وہ دکھاوٹ کے لیے ایک بناوٹ ہے۔ نمائش کے لیے سجاوٹ ہے۔ اور فن کے تاجروں کی خوشحالی کی آہٹ ہے! تب وہ اُس عورت کو اپنے ساتھ یہ کہہ کر لایا تھا کہ وہ اُس کے بچے کے لیے بہت سارے نئے کپڑے لائے گا، امیروں کے بچوں کے پھینکے ہوئے پرانے کپڑے نہیں! وہ فوراً مان گئی اور ساحر اُس کو اسٹیج پر لے گیا تھا۔ جب اُس کے حریف ماڈل کو پھر استقبالیہ تقریب میں لانے کی ضد پر اڑے رہے تب ساحر چند لمحات کے لیے ہال میں موجود لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر وہ جب لوٹ کر آیا تو اُس کے ساتھ ایک بچہ گود میں لیے ایک ماں تھی!

ناظرین نے عورت کی آمد کو نظر انداز کر کے ساحر سے اُس کی ماڈل کے بارے میں تلخی اور طنز کے ملے جلے تاثرات سے پوچھ تاچھ کی تو وہ بوکھلا کر بول پڑا کہ سونے کے سکّے ڈھونڈنے والوں کو اگر سیپ میں اپنا من پسند اور بکاؤ موتی دیکھنا ہے تو دیکھ لو! یہ کہہ کر ساحر نے جب ایک ماں کے سینے کے ساتھ لپٹ کر سو رہے بچّے کو الگ کر دیا تو وہ ایک بے حد خوبصورت لڑکی اُسی لباس میں نظر آئی جیسے ناظرین نے اُس کو کل رات اسٹیج کی جگمگاتی روشنی میں دیکھا تھا یعنی لال رنگ کی ایک بڑے سائز کی قمیص، جس کا ایک بازو نہیں ہے جس میں کئی چھید ہیں، جس کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں اور قمیص کے نیچے بریزری نہ ہونے کی وجہ سے دو پھڑپھڑاتے ہوئے سفید کبوتر باہر آ کر شکاریوں کی توجہ کا مرکز بن گئے تو قدردان اور قدرتی خوبصورتی پر مہربان ہونے والے ڈریس ڈیزائنرز قریب آ کر اپنے اپنے نقطۂ نگاہ اور اپنی تخلیقی زاویوں سے ایک سحر انگیز ماڈل کو دیکھتے رہے اور عورت گھبرا کر اپنے نیم عریاں جسم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کی کوشش کرتی رہی تو

ناظرین ان حرکتوں کو ماڈل کی ادائیں سمجھ کر مسکراتے رہے! حالانکہ عورت کے جسم سے کچی مٹی کی بو آرہی تھی لیکن اُس کے گرد عورتوں نے جو عطر لگادی تھی اس سے چار سو خوشبو نے قریب کھڑے نامور لوگوں کو بھی ناک بند کر کے دُور دُور جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ساحر کو پیچھے دھکیل کر مشہور و معروف ڈریس ڈیزائنر خود اِس ماڈل گرل سے انگریزی، ہندی اُردو اور تمام علاقائی زبانوں میں پوچھ رہے تھے کہ ہمارے ساتھ کام کرلو تو منہ مانگی رقم دینے کے علاوہ بین الاقوامی شہرت دلادیں گے۔ ہال میں موجود کئی ماڈل لڑکیوں کے منہ لٹک گئے تو وہ ایک ہی جگہ یوں کھڑی تھیں گویا حملے کی تیار کرنے لگی تھیں! اچانک ایک بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز نے گویا سائرن بجادیا!

عورت اپنے گرد مداحوں کی محیط توڑ کر ساحر کو ڈھونڈ کر اپنے بچے کو سینے سے لگا کر لرزرہی آواز میں بول پڑی:

''بھیا! میرے بچے کو نہ اچھے کپڑوں کی ضرورت ہے اور نہ کھلونوں کی! اِس کو بھوک لگی ہے میں اِس کو دودھ پلادوں۔'' یہ کہہ کر وہ جب ایک کونے میں بچے کو دودھ پلانے لگی تب وہ ساحر سے ناراض ہو کر کہتی رہی: ''یہ سب جو مجھ سے پوچھ رہے تھے میں سمجھ تو رہی تھی، مگر مجھ سے یہ نہ پوچھا گیا کہ کیا وہ میرے شوہر، میرے دیور اور میرے ساس سُسر کو بھی کام دیں گے؟ بھیا! آپ نے اِن لوگوں کو بتادیا ہے نا کہ ہم وہ بدبخت زمیندار ہیں جو خشک سالی کی وجہ سے اب اینٹیں بناتے ہیں۔ ٹھیکیدار کی مرضی کے بغیر ایک دن باہر جاتے ہیں تو اپنے کسی کو گروی رکھ کر! میں نے اپنے شوہر کو'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی یا ساحر کچھ اور سنتا ایک خوبصورت ماڈل نے اپنائیت کی آڑ میں اپنی چالاکی سے یہ بات جان کر یہ بات پھیلادی کہ ایک عام غریب لڑکی کے کپڑوں کو ایک فریبی نے اپنی انوکھی تخلیق بتا کر فیشن کی دُنیا کو داغدار بنادیا ہے۔ ماڈلز کو رُسوا کردیا ہے اور فیشن ڈیزائنرز کو تخلیق کار کی بجائے لوگوں کو بے وقوف بنانے والے جعل ساز ثابت کردیا ہے۔ کریٹیوٹی (Creativity) کو کویکری (Quackry) ثابت کردیا ہے ایک ناکامیاب اور گمنام نام نہاد تخلیق کار نے! اور ہم واقعی بے وقوف بن گئے ہیں۔ ایک بے نام کو نام دے کر! عزت دے کر، شہرت دے کر!

اِس گرم ہَوا سے حریفوں کے غصّے کا اُبال جب ساحر پر گرا تو اُس نے چارلی چیپلن کی بات دُہرائی۔ اگر برف کا ایک ٹکڑا کسی امیر عورت کی قیمتی قمیص میں شرارت سے ڈالا جائے تو کامیڈی

اور غریب عورت کی قمیص میں ڈالا جائے تو ٹریجڈی ہو جاتی ہے۔

دیکھنے والوں میں کچھ کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں! اور کچھ اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پاتے ہیں! ایک ماڈل اسٹیج پر عریانیت کا مظاہرہ کرتی ہے تو اُس کی پوشاک کو معاشرہ فخر سے قبول کرتا ہے۔ اور جب ایک غریب عورت کو تن ڈھانپنے کے لیے حسبِ ضرورت کپڑا نہیں ملتا ہے تو وہ نمائش کی تصویر بن جانے کی بجائے بدبختی کی تصویر بن کر رہ جاتی ہے اور یوں مصنوعی رنگ اصلی رنگوں سے جلوے چُرا کر اُن ہی پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ کل ایک ناکامیاب مصور اپنے رنگ، اپنے برش، اپنی مہانگی پلیٹ یا اپنی کوئی شاہکار پینٹنگ لے کر ایک جگمگا رہی نمائش گاہ میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ جیتی جاگتی ایک عورت کو لے آیا تھا تا کہ کوئی مسیحا اُس کے ننگے بدن کو ڈھانپنے کے لیے ایک لبادہ بنا سکے مگر وہ آج اپنے پیچھے ایک سحر انگیز تاثر چھوڑنے کی بجائے ایک سحر انگیز رنگ برنگی ماحول چھوڑ کر اُن تاریکیوں میں واپس لوٹا ہے جہاں رنگ نظر ہی نہیں آتے! مگر اُس کے ساتھ ایک ماں ہے، ماں کے سینے سے لپٹا ہوا ایک بچہ ہے اور چارسُو پھیلی کچی مٹی کی مہک بھی ہے!!

○○

کھیل

کارتک میرا پوتا ہے، ہمیشہ ٹی وی کا رموٹ کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھ کر کارٹون چینل دیکھتا رہتا ہے، میں جب بھی روکنے کی کوشش کرتا ہوں تب وہ کوئی رٹا ہوا جملہ سنا کر اتنا ہنساتا ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ ساٹھ سال کا بچہ اور میں پانچ سال کا بوڑھا ہوں! وہ باتیں ہی ایسی کرتا ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ وہ کبھی کبھی اپنی توتلی زبان میں گہری باتیں کر جاتا ہے اور اکثر خود کو چالاک چوہا اور مجھے بے وقوف بلی سمجھ کر تنگ بھی کرتا ہے، ڈراتا بھی ہے اور کبھی کبھی اپنی معصوم باتوں سے چونکا بھی دیتا ہے۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا جب اُس نے مجھ سے کہا کہ جو کھیل میں اپنے دوست کے کہنے پر کھیلنے والا تھا وہ ''کھتل ناکھ'' (خطرناک) ہوگا۔ اور اگر میں اس کے لیے ایک 'ماسک' (Mask) لے آؤں تو وہ مجھے بچا سکے گا! ایک چہرے پر طرح طرح کے مکھوٹے پہن کر کوئی کبھی راجا، کبھی رنک، کبھی دیوتا، کبھی راکھشس، کبھی رستم، کبھی سہراب، کبھی ستیہ وادی ہریش چندر، کبھی فریبی وغیرہ وغیرہ بن جاتا تو ہے مگر اصلی چہرہ تو وہی رہتا ہے! چاہے وہ طاقتور کا چہرہ ہو یا کمزور کا، امیر کا ہو یا غریب کا ہو۔ شہید کا ہو یا غدار کا ہو، دوست کا ہو یا دشمن کا ہو۔ میں نے ایک ایسے چہرے بدلنے والے کو پچاس سال پہلے دیکھا تھا تب میں دس سال کا تھا اور خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اور پھر جوانی سے بوڑھاپے کے سفر میں اپنے ہم سفر دوست کے بدلتے ہوئے چہرے دیکھ کر اپنے آپ سے ڈرنے لگا ہوں۔ تب کی بات بہت پرانی ہے! مگر اتنی پرانی بھی نہیں کہ اپنی ہی کہی بات کی تصدیق کے لیے تواریخ کے مطالعے اور آثارِ قدیمہ کے مشاہدے کی ضرورت پڑ جائے! یقین کیجیے کہ خدا کو حاضر ناظر رکھ کر جو بھی کہوں گا سچ کہوں گا! کیونکہ یہ سنی سنائی کہانی تو ہے نہیں! بلکہ میری اپنی کہانی جو ہے!

پچاس سال پرانی کہانی مجھے یوں یاد ہے جیسے کل کی بات ہو! میں اسکول سے لوٹ رہا تھا جب میرے سامنے ہنومان جی کھڑے ہو گئے۔ میری سانسیں رُک گئیں مگر اگلے لمحے ہی میرے

دل کی بہت تیز دھڑکنوں نے میری رُکی ہوئی سانسوں کو اتنا تیز دوڑایا کہ ہنومان جی بھی میری کیفیت بھانپ کر ایک اور لڑکے کی ٹوپی اُٹھا کر لے گئے! لوگ ہنومان جی کو دیکھ کر ہنس رہے تھے!

ہنومان جی بالکل ویسے ہی نظر آرہے تھے جیسے مندروں میں رکھی ان کی مورتیاں! بلکہ ہمارے گھر میں دیواروں پر آویزاں رنگ دار تصویروں جیسے! میں واحد تماشائی تھا جو سہما سہا، ڈرا ڈرا سا نظر آرہا تھا۔ باقی ناظرین ہنومان جی کی اداؤں پر نثار ہو کر سڑک پر اُترے ہوئے بھگوان کو اپنی عقیدت، احترام وا پنی قدردانی کا احساس دلا کر ان کے پیچھے چند قدم چلتے رہتے تھے۔ پھر ہنومان جی ایک گروپ کو اُچھل اُچھل کر وداع کرتے ہوئے آگے نکل جایا کرتے تھے!

ہنومان جی صرف ایک طبقے سے تعلق رکھنے والے دکانداروں کے سامنے ہی نہیں رُک جایا کرتے تھے بلکہ بازار میں ہر چھوٹی بڑی دُکان کے سامنے کھڑے ہو کر اُچھل اُچھل کر کبھی اپنے غصّے کا اظہار کرتے رہتے تھے اور کبھی ایک فاتح کی طرح اپنی خوشی کا اظہار کرتے رہتے تھے جبکہ تماشائی اپنے غم یا خوشی کے احساسات کو بھول کر ہنومان کے کرتب دیکھ کر خوشی کی لہروں کی طرح جھومتے ہوئے نظر آتے تھے۔

ہنومان جی کے پھٹے جوتے دیکھ کر میرا بھی ایک قہقہہ لگانے کو جی چاہتا تھا مگر ڈر نے میرے دماغ کو اس قدر گھیر لیا تھا کہ میں اپنے گھر جانے والی گلی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر جب ہنومان جی بھی اسی گلی میں داخل ہوا تو میں یقیناً بے ہوش ہوا ہوتا اگر میں اپنے ابا کو سامنے نہ پاتا!

میرے چہرے کے اُترے ہوئے رنگ کو دیکھ کر وہ میری کیفیت بھانپ گئے تھے اس لیے وہ مجھ سے کچھ کہنے کی بجائے مجھے دریا کے کنارے واقع اس مندر میں لے گئے تھے جہاں ہنومان جی اپنی لمبی پونچھ اُتار کر ایک پرانے ٹرنک میں رکھ کر اپنے چہرے سے ایک مکھوٹا اُتار رہے تھے۔

''ارے واہ! یہ تو ایک آدمی ہے!'' میرے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ جونہی نکلا گویا ایک خوف کے پھیل رہے غبارے کی پھونک نکل گئی!

ابا نے اُس سے پوچھا! کل کون سا رُوپ دکھا رہے ہو؟ تو وہ جواباً بولا۔ نرسنگھ اوتار یا راون! میں قریب جا کر جب اس کے ٹرنک میں جھانک جھانک کر دیکھتا رہا تب اس نے خود ہی مجھے چند مکھوٹے، نقاب اور راجوں، مہاراجوں، سلطانوں اور طلسمی کرداروں کی پوشاکیں دکھا کر یہ سمجھایا کہ وہ ایک بہروپیا ہے۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں جا کر وہ کسی اچھے یا بُرے کردار کا مکھوٹا و پوشاک پہن کر روز کسی علاقے میں اپنا یہ کھیل دکھا کر آخری دن ایک کشکول ہاتھ میں لے کر دکانداروں اور

لوگوں سے دان لیتا ہے جو وہ خوشی خوشی اس کو دے کر وداع کرتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں عام لڑکوں کی ذہنی عمر اصلی عمر سے بہت کم ہوا کرتی تھی اس لیے میں اُس وقت یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ ''بہروپ'' بھی ایک تفریح کا ذریعہ ہوا کرتا تھا اور یہ بھی فنونِ لطیفہ کا ایک رنگ ہے۔ جس کو تماشائی عقیدت کی نگاہوں سے کم اور تفریح و ثقافتی زاویوں سے زیادہ دیکھا کرتے تھے۔ یعنی 'بہروپ' بھی اظہار کا ایک ذریعہ ہے جس کو لوک فن کا ایک فارم (Form) کہا جاسکتا ہے۔ لیکن دوسرے مقامی اظہارِ فنون کی طرح یہ آرٹ بھی ایک کھنڈر بن چکا ہے۔ نہ وہ بہروپی ہیں، نہ وہ شہر یا گاؤں ہیں اور نہ وہ بازار ہیں جہاں بہروپی کبھی ہنومان اور کبھی راون کا مکھوٹا پہن کر آتا جاتا تھا۔

تب فلمیں دیکھنا ایک عیب سمجھا جاتا تھا اس لیے لوگ کتھائیں پڑھ لیا کرتے تھے یا مندروں میں کھیلی جانے والی رام لیلائیں اور کرشن لیلائیں دیکھ کر تفریح کا سامان تلاش کیا کرتے تھے۔ جبکہ آج کل فلمیں، ٹی وی، سیٹلائٹ چینلیں جب پراچین کتھائیں اور جدید کہانیاں دکھا رہے ہیں تب بے چارے غریب بہروپی کا کھیل کوئی کیوں دیکھے گا؟ میرے ایک بہت ہی امیر دوست کے اندر دبے ہوئے فنکار کو جب میں نے ایک بدحال بہروپی کی داستانِ غم سنائی تو وہ اپنی امیری کے منوں بوجھ کو ہٹا کر فنکار کو باہر لے آیا اور بہروپی کو اپنے کپڑے پہنا کر خود اس کا لباس پہن کر کشکول ہاتھ میں لے کر شہر شہر، گاؤں گاؤں کو بہ کو گھومتا رہا! ناظرین کو یہ مناظر اس قدر پسند آئے کہ الیکشن میں اس کا کشکول نوٹوں کی بجائے ووٹوں سے بھر دیا!

میں نے سوچا کہ لوگ میرے دوست کو ایک ایسے فنکار کی حیثیت میں قبول کر چکے ہیں اور میں منصوبے بناتا رہا کہ کیسے کلاسک آرٹ کو ایک فنکار منسٹر کی مدد سے از سرِ نو نکھار کر پیش کیا جائے۔ جبکہ فنکار ایک بہروپی کی طرح کبھی رام کبھی شیام بن کر اپنے ووٹروں کا دل و دماغ جیتنے میں کامیاب ہوتا رہا۔

میں سمجھ بیٹھا تھا کہ گزرا زمانہ لوٹ کر آیا ہے۔ اس لیے ویسے ہی جیسے میرے ابّا نے بہروپی سے مندر میں پوچھا تھا کہ کل کون سا رُوپ اُجاگر کرنے کا ارادہ ہے، میں نے بھی ایک فنکار کے اندر چھپے ایک منسٹر سے پوچھا۔ اب کون سا رُوپ لے کر لوگوں کے سامنے آؤ گے؟ میرا یہ دوست بھی میری طرح ساٹھ سال کی عمر کا نشانہ پار کر چکا ہے اس لیے وہ اب گلی کوچوں میں نہیں جاسکتا ہے جبھی تو وہ کچھ ایسا سوچ رہا ہے کہ لوگ ہی اس کے دروازے پر دستک دے کر ایک کرشماتی لیڈر

سے مدد مانگ لیں اور وہ ان کی مدد کر کے ان کا من جیت لے۔

اچانک سیلابی پانی نے جہاں گاؤں، کھیت اور لوگوں کو اُجاڑ دیا وہاں سانپوں کے بل بھی اکھاڑ کر ان کو پہاڑوں اور جنگلوں سے نکال کر لوگوں کے گھروں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

ہاہا کار مچ گیا تو لوگوں نے بچوں کے لیے دودھ، اپنے لیے روٹی، کپڑا اور مکان مانگنے کی بجائے سانپوں کو مار بھگانے کی التجا کی اور پھر جب میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ الیکشن سر پر ہیں، اب کیا کرو گے۔ تب وہ میرے ہی گھر میں بیٹھ کر طنزاً بول پڑا۔ سرکاری نیولے ڈیوٹی پر لگا دیے جائیں گے۔ پھر میری سنجیدگی کو دیکھ کر اور مجھے اپنا ہم راز بنا کر بول پڑا۔

میرا مشورہ تو یہ ہوگا کہ جس گھر میں سانپ گھس جائے ان کے فرش پر پاؤں نہیں رکھنے چاہئیں اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اپنی کھٹیا اوپر کرنے سے پہلے ایک لوک سیوک شیو بھگت سے فوراً ملیں یا پھر میرے ایک دوست سے جن کو آپ اپنے گھر کا جغرافیہ سمجھا دیں تو وہ آپ کے دُکھ درد مٹا کر آپ کو ایک نیا جنم دے گا۔ کسی کو کسی قسم کی دکھشنا یا پھر دان ڈونیشن (Donation) دینے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں جو ہوں ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے۔ دونوں ناگوں کو اپنے بس میں کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس نے جب دونوں کے پتے ہاہا کار کرنے والے مصیبت زدوں کو لکھا کر دیے تو ان میں ایک پتہ میرا تھا۔

میں نے جب اُس سے پوچھا کہ میرا نام بطور شیو بھگت کیوں دیا تو اس نے سرگوشیانہ لہجے میں یہ احساس دلایا کہ جب بھگوان نے تمھیں یہ شکتی دی ہے تو کیوں اپنی روحانی طاقت کو چھپا رہے ہو!

میں اس کی اشاروں سے دی گئیں ہدایات پر عمل کر کے جب اپنے گھر پہنچا تو وہ تھوڑی دیر بعد رختِ فقیری میں میرے دروازے پر دستک دینے آیا۔ میرے پیچھے میرا چار برس کا پوتا بھی آ کر ہماری باتیں سنتا رہا۔ وہ مجھے پہلے یہ بتا گیا کہ میں نے ایک فارم ہاؤس کرائے پر لے رکھا ہے۔ کاروالے تمھارے پاس نہیں آئیں گے بلکہ میرے پاس آئیں گے۔ اس لیے جا رہا ہوں! میرے تذبذب کی کیفیت بھانپ کر وہ بول پڑا۔

جیسے بدلتے موسم کو دیکھ کر اپنا لباس بدلنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح بدلتے حالات دیکھ کر ہم لوگوں کو رُوپ بدلنا پڑتا ہے۔ میرے طاقتور سیاسی مخالف مچھروں سے بچاؤ کے لیے تمام ملک میں مچھر مار دوائیاں بانٹ چکا ہے! مچھر بھاگ جائیں گے تو ہم یہ کیسے ثابت کریں گے کہ مچھروں کی پیدائش اُس کی فیکٹری میں ہوتی ہے!

اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں گے تو الیکشن ہار جائیں گے۔ ہار گئے تو اپنے کیے ہوئے وعدے پورے کیسے کر پائیں گے؟ ورنہ تمھارے بیٹے کی پرموشن اور تمھارے پوتے کا کسی اچھے اسکول میں داخلہ کیسے ہو سکے گا؟

''میری مدد بیٹ مین (Bat Man) کرادے گا! وہ سب کی مدد کرتا ہے'' کارتک بول پڑا۔

''ارے واہ یہ لڑکا تو پیدائشی ایکٹر ہے۔ کہو تو نہیں نہیں ابھی نہیں علم بڑی دولت ہے!''

میں خاموش تھا اس لیے کہ میرا پوتا میرے دوست کی باتیں اُسی دلچسپی سے سن رہا تھا جیسی دلچسپی سے وہ کارٹون دیکھتا رہتا ہے۔ میرے تذبذب کو دیکھ کر میرے دوست نے میرے ارادے کو مضبوط کرنے کی خاطر یہ بتا دیا کہ علاقے میں جو سانپ اُس کے آدمیوں نے ڈال دیے ہیں ان میں بیشتر سانپ ربڑ کے ہیں اور جو اصلی ہیں وہ سب بے اثر ہیں۔ نہ ان کے کاٹنے والے دانت ہیں اور نہ منہ میں زہر!

یہ سن کر کارتک بول پڑا: ''دادا! اگر زہر والا سانپ ہوگا تو وہ جادوگر بھیس بدل کر آیا ہوگا۔ پھر کھیل کا مزہ آئے گا۔ آپ مدد کے لیے ماسک مین (Mask Man) کو آواز دو گے! کھیل کھتل ناکھ (خطرناک) ہو جائے گا۔ پھر سانپ آپ کو نگل جائے گا۔ مگر میں ماسک پہن کر سانپ کے پیٹ سے نکال دوں گا۔ لیکن آپ کو میرے لیے ایک ماسک لانا پڑے گا۔ لے آؤ نا دادا!''

میں کارتک کو دیکھتا رہا اور میرا دوست یوں بولتا رہا گویا وہ مجھے ویسے ہی اُپدیش دے رہا تھا جیسے بھگوان کرشن کروکھشیتر کے میدانِ جنگ میں ارجن کو ہتھیار اُٹھانے کی ضرورت سمجھا رہا تھا! دراصل میرا دوست میرے خدشات کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بار بار یہ بتا رہا تھا کہ اصلی سانپ بھی اگر ہاتھ میں آئے تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ ایک آزمودہ کھیل کھیلنے جا رہے تھے!

میرا دوست میرے دل سے ڈر نکال کر اپنے کھیل کی تاثیرِ مسیحائی کے بارے میں جب بتا رہا تھا تب میری نگاہیں اپنے پوتے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میں حیران تھا کہ جس پانچ سال کے بچے کا دادا دس سال کی عمر میں ایک منورنجن کرنے والے بہروپی کو دیکھ کر لرز اُٹھا تھا وہ ایک خطرناک کھیل کے بارے میں ہماری گفتگو یوں سن رہا تھا گویا وہ پہلے بھی ایسی کہانیاں سن چکا ہے۔

میرے دوست کے جانے کے بعد کارتک اپنی توتلی زبان میں مجھے یہ بتاتا رہا کہ اگر بُرا آدمی ایک مگرمچھ بن کر مقابلے کے لیے آ گیا تو ماسک مین ہی آپ کو بچا سکتا ہے۔ اس لیے وہ

مجھے نقاب (Mask) پہن کر جانے کے لیے اصرار کر رہا تھا بلکہ وہ اپنے لیے بھی ایک ماسک مانگ رہا ہے تا کہ وہ مگر مچھ کو اپنے منہ میں ڈال کر ایک چاکلیٹ کی طرح کھا سکے! پھر کارتِک مجھے گئی رات تک ایک کے بعد ایک اور سی۔ڈی (C.D) چلانے کے لیے مجبور کرتا رہا تا کہ میں Mask یعنی کرشماتی نقاب کے کرامات دکھا کر اس کے لیے ایک ماسک لے آؤں!

میں سوچ رہا ہوں کہ اُس پھٹے جوتے اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے بہروپی کے بیٹے اور پوتے اب کیا کر رہے ہوں گے؟ کہیں وہ بھی کوئی خطرناک کھیل تو نہیں کھیل رہے ہوں گے؟

میری سادگی تو دیکھیے میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں! اپنے تصوّر سے ڈر رہا ہوں!

اپنے پوتے کی سوچ سمجھ سے ڈر رہا ہوں!

اُجالوں کو دبوچنے والی تاریکیوں میں جنم لینے والے شیطانی کھیلوں سے ڈرتا ہوں!

مگر کیا کروں ایک نڈر کھلاڑی ایک ڈرپوک کو بھی اپنے کھیل میں شامل کر چکا ہے!

کارتک سو رہا ہے اور علی الصبح کوئی میرے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

گویا میرے دوست کا نیا کھیل شروع ہو چکا ہے!

OO

خوشبو

اپنی تین سال کی شادی شدہ زندگی میں خوشبو ایک کھلے ہوئے گلاب کی طرح بیٹھی تھی اور جو بھی آج ہوا تھا یا سہاگ رات کے وقت سے ہی ہو رہا تھا اس کا کرب بھول کر وہ آج بے حد خوش تھی کہ اُس کے بدن سے اس کی پوشاک اُتارنے والا اس کا اپنا شوہر تھا۔ اُس کا محبوب تھا جس کے ساتھ شادی کرنے کی خاطر اُس نے اپنے سماج سے ہی نہیں بلکہ اپنے والدین سے بھی بغاوت کی تھی۔ اگر بالغ نہ ہوتی تو شاید میاں بیوی کو قانونی لڑائی بھی لڑنی پڑتی اور دونوں کے پیار کی کہانی کسی تھانے کی فائل میں درج ہوئی ہوتی، انھیں تفتیش کے اذیت ناک مرحلوں سے بھی گزرنا پڑتا۔ یوں تو ایسے معاملات میں جنگ کی بھاگ دوڑ مرد کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے لیکن یہاں معاملہ اُلٹا تھا۔ یعنی خوشبو ہی ہر مورچے پر مقابلہ کر کے اپنے محبوب کو گاؤں سے یوں اٹھا کر لے گئی تھی جیسے مہاراجا پرتھوی راج چوہان اپنی محبوبہ سنجوگتا کو اُٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ اس لیے کہ اس کا شعور حالات کا مقابلہ کرنے سے پہلے ہی تھرتھرا کر گر جایا کرتا تھا یا پھر لرز کر کانپ اُٹھتا تھا اور اپنی ٹانگوں کو یوں گھسیٹ کر چلا کرتا تھا گویا ایک تیز رفتار ندی میں چل کر دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ خوشبو کو اکثر اپنی ماں کی یاد آیا کرتی تھی مگر اپنے گاؤں میں جانا گویا جنگ بندی لائن کو پار کر کے جیل یاترا کو دعوت دینا تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو گاؤں بدر کی ہوئی سمجھا کرتی تھی۔

خوشبو اپنی شادی شدہ زندگی سے شروع شروع میں چونک پڑا کرتی تھی مگر بعد میں وہ ایک بے شکل خوف سے خوف زدہ ہوتی رہتی تھی۔ یوں تو وہ گہری جھیل کو ایک تالاب سمجھ کر کود پڑی تھی اس لیے وہ اپنا حالِ دل کسی کو سنا بھی تو نہیں سکتی تھی۔ چونکہ واحد... یعنی اُس کا شوہر احساسِ کمتری، خودداری یا کئی بہانوں کی آڑ میں کوئی کام کاج نہیں کرتا اس لیے اقتصادی بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے خوشبو اپنے گھر سے چرائے ہوئے روپے اور زیورات چھپا کر خود ہی آس پاس کے گھروں

میں برتن صاف کرنے، صفائی کرنے اور گندے کپڑوں کو دھو کر اپنے گھر کا چولھا جلایا کرتی تھی۔ اور صبح سے شام تک کام کرتے کرتے اُس کے بال اُلجھے ہوئے رہتے ہیں۔ کپڑوں سے باس آتی ہے پھر بھی ضرورت مند لوگ اس کو برداشت کرتے ہیں کیونکہ خود ایک میلی کچیلی عورت گھروں کو شیشوں کی طرح صاف رکھتی ہے۔ کپڑے بھی صاف وشفاف رکھتی ہے۔ اس لیے اپر مڈل کلاس (Upper middie class) گھرانوں میں وہ بہت ہی مقبول ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ لوگ اس کے کام کاج کے دوران اُس کے آس پاس نظر نہیں آتے، مجبوراً آنا پڑے تو اپنی ناک پر رومال رکھ کر۔ یعنی خوشبو نام کی کام کرنے والی بدبو کا ایک بدنما داغ لے کر چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ خود بھی اپنے حال پر ہنستی رہتی ہے اور جب کوئی اس کی پُرکشش آواز میں سنائے گئے اس کے لطیفوں پر ہنس پڑتا ہے یا پڑتی ہے تب باس قہقہوں کو دبوچ ڈالتے ہیں۔

خوشبو بہت ہی حساس اور جذباتی عورت ہے مگر مجبوریوں نے اُس کے احساسات کو مفلوج کر دیا ہے کیونکہ اس کا شوہر کاہل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے کہ گویا منہ چھپا کر زندگی گزارنے کا عادی ہو چکا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اُس کو باغی بن کر خوشبو سے شادی کرنے کا ملال ہے بلکہ وہ غصّے میں بھی اپنے پیار کا واسطہ دے کر خوشبو کے زخموں پر خود ہی مرہم لگاتا رہتا ہے۔ اکثر شرمسار بھی ہو جاتا ہے لیکن رات گئی بات گئی۔ وہ سو جاتا ہے اور بیوی کو یوں بھول جاتا ہے گویا زندگی کے سفر میں جو اُس کی ہم سفر ہے وہ پل دو پل کی ہم نفس اور ہمنوا ہونے کے بجائے چند قدموں کا ساتھ دینے والی ایک شناسا سا راہی بن جاتی ہے۔

خوشبو کی کہانی بھی اُس کی زندگی کی طرح رنگ و بو کے بغیر گزر چکی ہے اُس کی ماں جب بھی اُس کو نہلاتی تھی تب وہ یوں محسوس کرتی تھی جیسے چار سو خوشبو پھیلی ہوئی ہو۔ وہ اپنی سہیلیوں کو فخر سے یہ کہا کرتی تھی کہ یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں، زمین سے پوچھ کر دیکھ لو، وہ بھی یہی کہے گی۔ یہی غنچے کو کھلنے دو تو وہ اپنی خوشبو سے اپنی شناخت کروا دے گی۔ جبھی تو ماں نے خوشبو کو یہ نام دیا تھا۔

خوشبو ادھ کھلے گلاب کی طرح مہک کر گاؤں والوں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ دل پھینک لڑکے تو کیا سنجیدہ لڑکے بھی خوشبو کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ مگر خوشبو نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کھلے پُرکشش گلاب کی مہک کو قید نہیں کیا جا سکتا بلکہ پکڑا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن ایک لڑکا ایسا تھا جو جوان ہو کر بھی خوشبو کو دیکھ کر نہ دل پھینک فقرے سنایا کرتا تھا اور نہ روحانیت کی آڑ میں شادی کے

ارادوں کو ظاہر کیا کرتا تھا۔ بس وہ خوشبو کو دیکھ کر زیرِ لب مسکرایا کرتا تھا۔ وہ جب خوشبو کے قریب آیا کرتا تھا تو وہ شرما کر بھاگ جایا کرتا تھا۔ ایک اچھے کھاتے پیتے گھر سے تعلق رکھنے والا یہ نوجوان یقیناً گاؤں کے دوسرے جوانی میں قدم رکھنے والوں سے مختلف تھا، حالانکہ گاؤں کے لوگ بلکہ خوشبو کے گھر والے بھی اس الگ تھلک رہنے والے نوجوان کو اپنے ماں باپ کا 'بگڑا ہوا اِکلوتا بیٹا' کے طور پر جانتے تھے۔ وہ اگر اسکول نہیں جایا کرتا تھا تو ماں باپ اسکول والوں کو قصوروار ٹھہراتے تھے۔ وہ لوگ اُس کی پٹائی تو کرتے تھے مگر اس لیے کہ وہ کلاس روم میں بھی خراٹے مارتے ہوئے سو جایا کرتا تھا۔ سارے گاؤں میں اُس کے دو ہی مہربان تھے۔ ایک اسکول کا چوکیدار اور دوسری خوشبو!

خوشبو جب بھی گاؤں کے مندر، دریا کے کنارے، کسی شادی کی خوشنما تقریبات یا گاؤں کے کسی میلے میں نظر آیا کرتی تھی تو خوشبو اپنے اِردگرد چاہنے والوں کو یوں پایا کرتی تھی گویا ایک پھول کے اِردگرد تتلیاں یا شہد کی مکھیاں مگر خوشبو کی نظریں جس بھنورے کو ڈھونڈتی رہتی تھیں وہ نہایت شائستگی سے دُور بیٹھا اُس کو دیکھتا رہتا تھا اور جب خوشبو ہی بات چیت کا سلسلہ شروع کیا کرتی تھی تو وہ اپنے محبوب کی باتوں میں ذرا بھی چھچھورے پن کی جھلک نہیں پایا کرتی تھی بس یہی باتیں، سلیقہ اور پیار کرنے کے ایک انوکھے پن نے اس کو دل دینے کے لیے مجبور کیا تھا۔

پھر ایک دن اپنے لگن منڈپ کو ٹھکرا کر وہ اپنے دیوتا کے پاس گئی تھی۔ گاؤں والے حیران ہوئے تھے کہ خوشبو نے ایک نکمّے کے ساتھ شادی کیوں کی تھی جبکہ خوشبو کو معلوم تھا کہ گاؤں والے اُس کو نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں دیں گے!

خوشبو کو یہ تمام باتیں یاد آ رہی ہیں اور اُس کے ہونٹ پولیس کو دیکھ کر تھرتھرا رہے ہیں کیونکہ آج جو بھی اس کے ساتھ ہوا ہے اس کے ایک ایک لمحے کو یاد کرتے ہوئے وہ سمٹ کر ایک نقطے کی طرح خود کو بے معنی سی محسوس کرنے لگی۔ دراصل شہر میں آ کر وہ ایک دلدل میں پھنس گئی ہے کیونکہ اُس کا شوہر ڈرگس (Drugs) کا استعمال کر رہا ہے اور وہ خوشبو کا سارا سامان بیچ چکا ہے۔ اور پھر دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کھانے کے لیے کام کرنے پر مجبور ہے۔ آج بھی وہ معمول کی طرح علی الصبح گھر سے نکل پڑی تھی مگر اچانک بارش کی وجہ سے اس کے کپڑے بھیگ کر اُس کے بدن سے چمٹ گئے تھے۔ فائدہ یہ ہوا تھا کہ اُس کا بدن زور کی بارش سے ایک گندی سڑک کی طرح دُھل گیا

تھا۔ بال گیلے ہو کر اُس کے گلابی گالوں سے چمٹ گئے تھے۔ مشکل سے وہ ایک نیک خاتون کے گھر میں گھس گئی تھی۔ خوشبو کی حالت دیکھ کر خاتون نے اُس کو اپنی شادی کا جوڑا پہننے کے لیے دے دیا تھا وہ بھی اس لیے کہ اٹیچی میں رکھے اس خوبصورت قیمتی لباس میں کیڑوں نے ایسے بے شمار چھید کر دیے تھے جن پر رفو بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

خوشبو اس لباس میں واقعی بارش سے دُھلے ہوئے ایک کھلے گلاب کی طرح شاداب نظر آرہی تھی۔ چونکہ اُس نے اپنے بدبودار کپڑے کسی جگہ چھپا دیے تھے اس لیے وہ مہک کر جب اپنے دوسرے مالکوں کے گھر میں کام کرنے کے لیے داخل ہوتی رہی تو جو نظریں اس کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں وہ یا تو حیرانگی سے دیکھتے رہتے یا پھر للچائی نظروں سے دیکھتے رہتے۔ ایک رئیس زادے نے اُس کو دھوکے سے دبوچنے کی بھی کوشش کی تھی، مگر شام کو تھکی ہاری خوشبو اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور جب اُس نے اپنی آبرو بچانے کی کہانی اپنے شوہر کو سنا کر اُس کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی تو اُس نے گہری نیند سے جاگ کر اپنی بیوی کے جسم پر دونوں ہاتھ پھیر کر خوشبو کے جسم سے اُس کا لباس اُتار کر اور فاتحانہ قہقہے لگا کر قیمتی لباس کو سمیٹنا چاہا تب خوشبو کو یوں لگا جیسے اُس کا مجازی خدا اس کو اپنے سینے سے لپیٹ کر سہاگ رات منائے گا۔ مگر اپنے شوہر کے بارے میں اس بار بھی اُس کی سوچ غلط ثابت ہوئی اور سمجھ اُس کی ناسمجھی کی وکالت کرتی رہی!

خوشبو کا شوہر گئی رات جب لباس بیچ کر اور خوشبو سے چھینے ہوئے روپے سے اپنے لیے ڈرگس (Drugs) لے کر آیا تو وہ اپنی زندگی کا واسطہ دے کر اپنی کارکردگی کی وضاحت کرتے ہوئے سو گیا!

خوشبو اب ایک برہنہ عورت ہے، اور سوچ رہی ہے کہ وہ کل اپنے کام پر جانے کے لیے کیا پہنے گی؟ رات بھر کروٹیں بدل بدل کر وہ اپنے بارے میں سوچتی رہی۔ ایک بدخیال نے اُکسایا تو وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ کاش میں نے اُس رئیس زادے کے ہاتھ کو جھٹک کر الگ نہ کیا ہوتا تو میں بدبو سے خوشبو بن گئی ہوتی! پھر علی الصبح اُس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اگر میں ایسا کرتی تو میں ایک پھول کی خوشبو کی بجائے کاغذ کے پھولوں میں لگائی جانے والی بند بوتلوں میں رکھی عطر کے مانند ہوتی۔ بکنے والی خوشبو!

اور جب یہ بات خوشبو کی ماں جان لیتی تو؟

خوشبو رات بھر سسکتی رہی اور سحر کی پہلی کرن دیکھ کر اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے نشے میں چور شوہر کو کھلے دروازے پر ایک ڈور میٹ (Door mat) کی طرح دیکھ کر سمجھ گئی کہ جس باغ کا مالی سویا پڑا ہو اُس میں خوشبو سونگھنے والے بھی آتے جاتے رہیں گے اور پھولوں کو کچلنے والے بھی گھستے رہیں گے۔ پھول بھاگ بھی نہیں سکتا جبکہ خوشبو کو چار سو پھیلنے سے کوئی روک نہیں سکتا!!

OO

خوشی

توبہ؟ توبہ!! توبہ توبہ!؟ تم توبہ توبہ کیوں... میری بات کاٹ کر تم... ہاں ہاں فون کاٹنے سے پہلے میری پوری بات تو سن لو... وہ کل کہا تھا... تب میں نشے میں تھا... لکشمی کی بات اس لیے کی تھی کیونکہ میرا امریکن دوست اس کو میری بیوی سمجھ بیٹھا تھا... سنو سنو... تم خود بھی اس کو ایک پتی ورتا پتنی کا درجہ دے چکی ہو... لیکن تمھاری آدھی بات میں سچائی ہے... پھر توبہ توبہ... کیوں؟... ویسا نہیں جیسا تم سوچ رہی ہو... اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد... امریکہ میں بچپن گزار کر بھی تم شوہر پر شک کرنے والی ایک عام مشرقی بیوی ہو... اور نہیں تو کیا؟ بات پوری کرلوں تو پوری سچائی بیان کرسکتا ہوں نا...!

سچ تو یہ ہے کہ لکشمی، نارائن سے اتنا ہی پیار کرتی ہے جتنا پیار میں تم سے کر رہا ہوں... چلو مان لیتا ہوں کہ تم مجھ سے یک طرفہ پیار کرتی ہو جبکہ میں اپنی شراب نوشی کے علاوہ کسی اور سے پیار محبت نہیں کرتا ہوں۔ بیوی او بیوی! جو ہو چکا ہوتا رہا۔ بھول جاؤ وہ سب... نہ تم کوئی گلہ کرو گی اور نہ میں کوئی شکوہ یا شکایت کروں گا۔ بس میری باتیں سنتی رہو... نہیں، جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ ایک شرابی کی بے ہوشی میں بڑبڑانے کی بے تکی باتیں نہیں ہیں! اور نہ ایک بگڑے رئیس زادے کے تصورات سے اُبھری ہوئی عیاشی کی ضروریات کی فہرست ہے... وہ اس لیے کہ اس وقت میں نے شراب نہیں پی رکھی ہے۔ ہاں آواز میں جو لرزش ہے وہ کل رات کی مے نوشی کی تاثیر ہے مگر میری سوچ سمجھ کی آہنی قوت کی وجہ سے میں نے توبہ کرلی ہے... یہ ڈرامہ نہیں ہے... ہاں ہاں میں یہ جانتا ہوں کہ یہ دنیا بھی ایک اسٹیج ہے اور زندگی بذاتِ خود ایک ڈرامہ ہے... ہاں ہاں، ہم سب اپنا اپنا کردار نبھا رہے ہیں۔ اگر تم اس ڈرامے کی بات کر رہی ہو تو سمجھ لو کہ زندگی نے کروٹ بدل کر میرا کردار اپنی نظر سے ایک منظر دیکھ کر بدل گیا ہے۔ گویا انگولی مال جیسا ایک درندہ ایک بودھ

بھکشو بن گیا۔ یقین کرو میں وہ ڈرامہ نہیں کر رہا ہوں جس میں اندھیرے میں بیٹھے ناظرین پردہ اٹھتے ہی رنگ منچ پر پھیلی رنگ برنگی روشنیوں میں وہ کردار دیکھتے ہیں جو اپنے اپنے گیٹ اپ میں، وہ ہوتے ہیں جو اصلی زندگی میں نہیں ہوتے ہیں۔ ایک جھوٹ بولنے والے والا ستیہ وادی ہریش چندر بن جاتا ہے، ایک جوان بیوہ ستی ساوتری بن جاتی ہے، غریبوں کا خون چوسنے والا سود خور سخی حاتم بن جاتا ہے۔

اور پھر دوسرے دن جب خالی خالی ہال یا تمبو میں کھڑے ہو کر بے رونق اسٹیج کو دیکھتے ہیں تب زندگی کا اصلی رنگ دیکھ کر یا تو چونک کر شام ہونے کا انتظار کرتے ہیں یا پھر اپنی زندگی کی کہانی کو ایک موڑ دے کر بدل دیتے ہیں۔ سوکھے سے متاثر لوگ اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر نارائن کی طرح شہروں میں سائیکل رکشہ چلاتے ہیں اور ان کی بیویاں گھروں میں کام کرتی ہیں۔ یا پھر سستی شراب پی کر مدہوش ہو جاتے ہیں۔ ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ وہ اپنے خیالات، جذبات، احساسات اور اپنی خواہشات کو سلا کر خود بے ہوش ہو جاتے ہیں، گویا بیابانوں میں کھو جاتے ہیں۔ لکشمی کی کہانی تو تم نے ہی مجھے سنائی تھی ایک دن اور ایک اپنی بیوی کے کرب کو محسوس کر کے صبح سے گئی رات تک شراب نوشی ترک کرنے کی صلاح دی تھی، لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا... ہاں، ہاں، ہاں... گویا تم نے اہم یا غیر اہم واقعات کو ذہن نشین کر دیا ہے۔ اگر اس واقعے کا ذکر کل ہوا ہوتا تو میں پھر وہی کہتا جو تب کہا تھا یعنی میرے پڑدادا نے اچھا کیا تھا جو اپنی زمین بیچ کر شہر میں ایک کارخانہ کھولا تھا۔ دادا امیر تھا اور باپ ایک ملک کا ایک نامور صنعت کار جس نے روپے اُگانے والے اتنے پیڑ لگا دیے ہیں کہ اگلی دس پشتیں بھی کام کیے بغیر گھر بیٹھے عیاشی کر سکتے ہیں۔ اور میری عیاشی کا ذریعہ شراب نوشی تھا۔ چونک کیوں پڑی ہو تم... تھا اس لیے کہ میں نے شراب نوشی ترک کر دی ہے آج صبح سے... تم ہنس رہی ہو۔ دیکھو، ہر نیک کام ایک دن شروع ہوتا ہے... نہیں۔ نہیں۔ نہ کسی نے اپنے سر کی قسم دی اور نہ کسی مہاتما نے اُپدیش دیا۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ بھی نہیں۔ نہ کسی نے بتلایا، نہ کسی نے جتلایا اور نہ میں پچھتایا۔

ہاں اب بتا دو کیا ہوا۔ مطلب ایسا کیا ہوا جو میں نے توبہ کر لی۔ یہ ہوئی نا بات۔ جب تم گھر چھوڑ کر چلی گئی میرا کھانا ہوٹل سے آتا رہا۔ لکشمی صبح سویرے آ کر برتن صاف کیا کرتی تھی۔ مجھے نیمو قہوہ پلایا کرتی تھی، گھر کی صفائی کیا کرتی تھی، کپڑے لانڈری سے لایا کرتی تھی۔ یوں تو وہ ایک

اچھی ہاؤس کیپر (House Keeper) تھی۔ یہ سوچ کر کہ مجھے صبح سویرے جاگ کر دروازہ کھولنا پڑتا تھا اس لیے میں نے گھر کی چابیاں لکشمی کو دے دی تھیں... کیا کیا؟ ہاں وہ سب کچھ لوٹ کر چلی جاتی تو؟ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا ہے... اچھی صورت والی لکشمی اچھی سیرت والی عورت بھی ہے۔ پھر وہی مشرقی عورت کی سوچ... تم جانتی ہو کہ میں... پھر ایسی باتیں کر کے کیوں؟ ٹھیک ہے ٹھیک ہے! سناتا ہوں... میں نے اس عورت کے چہرے میں زندگی کو اپنے رنگ میں دیکھا ہے۔ موسم بہار کو گویا نکھرتے ہوئے دیکھا ہے موسم خزاں کو مرجھاتے ہوئے دیکھا ہے... جانے کیوں میں مصنوعی زندگی میں اپنے روح کو سکون دینے والی خوشیاں ڈھونڈتا رہا... ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ آنکھوں میں آنسو ہوں تو نظر دُھندلا جاتی ہے۔ ہاں غم کے بہتے ہوئے آنسو روکنا ممکن نہیں جبکہ خوشی کے آنسو نکل کر بہہ جاتے ہیں۔ آستین کو بھگو نہیں دیتے... ضروری نہیں کہ ہر سنجیدہ بات میں فلسفے کی چاشنی ہو۔ نہیں نہیں۔ میری سوچ اور سمجھ کو دیوانگی کا نام مت دو۔ نہیں نہیں۔ میں جواب بتا دینا چاہتا ہوں، یعنی وجہ تو یہ کیا ہے، کسی مفکر کے اقوالِ زریں سے منسوب مت کر دینا... وہ اس لیے کہ یہ میرا جائزہ ہے، میرا مشاہدہ ہے... تمھارے ہنسنے میں مجھے طنز کی کھنک سنائی دے رہی ہے۔ اس لیے فون رکھ دیتا ہوں۔ لگتا ہے کہ تمھیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔... ہیلو! اب تم نے فون کیوں کیا؟ اچھا کیا جو فون کیا ورنہ میں شاید... ہاں اپنے بے ساختہ قہقہے کو روک نہیں پایا... نہیں! ایسی بات نہیں کہ غم ہو یا خوشی، صدمات ہوں یا شادیانے ہوں، پینے والوں کو پینے کا بہانہ چاہیے... ہاں میرا عزم تو یہ بلند ہے، اتنا بلند کہ ڈگمگانے کا ڈر نہیں ہے... ٹھیک ہے، میں تمہید باندھے بغیر بتا دیتا ہوں کہ یہ کرشمہ ہوا کیسے... دراصل ایک طویل عرصے کے بعد تمھاری آواز سن رہا ہوں تو۔ نہیں غصہ نہیں! پیار آ رہا ہے۔

لکشمی کو دیکھ کر لگ رہا ہے جیسے تم میرے سامنے ہو۔ بے فکر ہو کر سو رہی ہے! تمھیں غصہ آ رہا ہے؟ مگر کیوں؟ پوری بات سن کر فوراً چلی آنا... کون بہک گیا ہے کون بھٹک گیا ہے اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ ہیلو؟... ہیلو؟... ہیلو ہیلو!! تم سن رہی ہو نا؟... ہاں! میں لکشمی کی بات کر رہا ہوں، تمھارا پرانا گاؤن پہن رکھا ہے۔ بال کھلے ہیں بالکل تمھاری طرح۔ کل شام میرا ایک امریکن دوست میرے گھر آیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے رُکا تھا، تم جانتی ہو کہ بوتل کبھی خالی نہیں کرتا اور پھر کسی شام مختلف بوتلوں، بچی ہوئی مختلف برانڈ کی اسکاچ کی کاک ٹیل بنا کر اپنے خاص

دوستوں کو پلاتا رہتا ہوں۔کل بھی میں نے چاہا تھا کہ اپنے دوست کو کاک ٹیل پلا دوں مگر میرے نجی بار میں جتنی بھی بوتلیں تھیں سب بند تھیں، میں نے اپنے دوست کے لیے ایک نئی بوتل کھولتے ہوئے مسکراتے ہوئے یہ کہا کہ میری درجن بھر بوتلوں میں وہسکی کے ریزیڈیولز (Residuals) تھے تو اس نے لکشمی کو میری بیوی سمجھ کر کہہ دیا کہ بھابھی پی گئی ہوگی، میں نے قہقہہ لگا کر کہا کہ اگر وہ پی لیتی تو وہ مجھ سے بھاگتی کیوں؟... ہاں تم نے صحیح جواب دیا۔لکشمی اپنے تھکے ہارے شوہر کو روز اسکاچ وہسکی بھی پلاتی رہی اور ہوٹل سے لائے ہوئے کھانے میں بچا ہوا کھانا کھلا کر اتنا خوش کیا کرتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کی مدد کرنے کی خاطر روز شام کو آیا کرتا تھا۔ میں شوہر کو اپنے گھر میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔آزمانے کے لیے میں نے جب اپنا بٹوہ میز پر رکھ دیا تو نارائن نے بٹوہ میز سے اٹھا کر میرے سرہانے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ دونوں میاں بیوی جب اپنے گھر جایا کرتے تھے تب وہ زبردست بارش میں بھی میرا اچھا تایا رین کوٹ اپنے ساتھ نہیں لیا کرتے تھے۔ ایک شام میں نے خود اپنا امریکن جیکٹ اس کو دیا تھا۔اس روز میں نے لکشمی کی آنکھوں میں خوشی کی ایک چمک دیکھی تھی۔کل رات میں نے وہسکی کی آدھی بوتل اپنے بار میں رکھ دی تھی۔ آج دس بجے بھی جب لکشمی میرے لیے قہوہ نہیں لائی تو میں خود کچن میں چلا گیا اور وہاں لکشمی اور نارائن فرش پر ایک دوسرے سے لپٹ کر سوئے پڑے تھے۔انھوں نے ہوٹل سے آیا ہوا ٹفن صاف کر کے میز پر رکھ دیا تھا اور اسکاچ کی بوتل خالی کر کے فرش کے کونے میں رکھ دی تھی۔سوچو تو ذرا کیا ہوا ہوگا... ہاں! بالکل! میرا بھی یہی اندازہ ہے۔انھوں نے میرا جھوٹا کھانا اور جھوٹی وہسکی پی لی تھی۔ پیتے پیتے دونوں کو یہ پتا نہیں چلا ہوگا کہ ایک اچھی وہسکی رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھاتی ہے اس لیے جیسے کھانا برتنوں کو چاٹ کر ختم کر دیا تھا ویسے ہی انھوں نے وہسکی کی آخری بوند بھی پی لی تھی۔

میں دونوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ان کی مستی کے پس پردہ اعلیٰ معیار کی وہسکی ہے؟ اعلیٰ معیار کا کھانا ہے؟ پیٹ بھر کر کھانا کھانا ہے؟ یا ایک دوسرے کی چاہتوں کی قدر کرنے کی وجہ ہے... ہاں! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں کسی نے اپنا سلیقہ یا طرفہ بدل کر ایک جھرنے کو ندی میں ڈال دیا ہو... ہاں! ہنسی آ گئی کیونکہ میری ہر بات سن کر یا تو بات کو کاٹ دیتی ہو، ہنس پڑو تو اس میں غصہ ورنہ طنز کی ملاٹ ہوتی ہے یا پھر توبہ توبہ کہہ کر میری توبہ کو شک کے شکنجے میں ڈال دیتی ہو۔تم اچانک خاموش کیوں ہو گئیں؟ مگر میں خاموش نہیں رہ سکتا۔یا اپنے آپ سے وفا کروں گا ورنہ جفا

کرنے کے لیے مجبور ہو جاؤں گا۔ فیصلہ تم کو کرنا ہوگا کہ میں توبہ کرلوں یا تم توبہ کرلوگی؟ فون رکھ دیتا ہوں۔ ہاں! پھر فون کر رہا ہوں... کرنا ہی پڑا، کیوں؟ سن سکو تو سن لو! شام ہونے کو ہے اور میں حسبِ عادت نئی بوتل کھولنے گیا تھا پھر توبہ توبہ؟ تو کیا تم جانتی تھی کہ میں... پہلی بار غلط سوچا... ہاں! میں نے بوتل کھول تو دی مگر ساری کی ساری خالی کر دی۔ پی کر نہیں... فرش پر پھینک کر۔ جانتی ہو کیوں؟ لکشمی اور نارائن اس وقت بھی ساتھ ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ مجھے نارائن کی تقدیر پر رشک آ رہا ہے اور لکشمی پر پیار آنے لگا ہے۔ پھر اس کو میں چوم بھی سکتا تھا، ہاں! بے ہوش مریضہ کو کیسے پتہ چلتا کہ اس پر کس نے کب نشتر چلایا۔ نہیں نہیں! تم توبہ توبہ نہیں کہوگی... کیونکہ میں اپنی خوشی کے لیے درندہ نہیں بن سکتا۔ ویسا ہوتا تو تم سے یہ کہنے نہیں آتا کہ بیوی او بیوی! درست ہے میرا عزمِ توبہ! چلی آؤ کہ ایک دوسرے سے لپٹ کر ایک نئی شناسائی کریں ایک دوسرے کی پذیرائی شروع کریں جشنِ پارسائی! چلی آؤ۔ چلی آؤ میرے پاس میری خوشی! چلی آؤ!! میں دہلیز پر کھڑا ہو کر، اپنے بازو پھیلا کر اور آنکھیں بند کر کے تمھارے لمس کا انتظار کرتا رہوں گا!! سحر!

OO

منظر ایک بلندی پر

منظر، ایک بلندی پر تھا، کاش نشیبی علاقوں میں رہنے والے لوگ دیکھ پاتے! عرش پر بیٹھا خدا یہ منظر دیکھ تو رہا تھا مگر اس گھر میں نہ کوئی عبادت کرتا ہے اور نہ کوئی پرستش کرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ خدا سے دو باتیں کرنے کی خاطر کسی کو وقت نہیں ملتا ہے، بلکہ اس لیے کہ گھر کا مالک مذہب کو افیون کا تاثر سمجھ کر اپنی سوچ سمجھ کو ایک عملی دائرے میں رکھ کر، نشے کے اثر سے دُور رکھ کر ایک نئے طرز کی زندگی گزار رہا ہے! یعنی وہ ایک کامریڈ ہے! بیوی رسم و رواج کی پابند ہے اور ویسی ہی زندگی گزارنا چاہتی ہے جیسی زندگی اڑوس پڑوس میں رہنے والے امیر اور غریب دونوں اپنی اپنی اقتصادی محیط کے اندر رہ کر جی رہے ہیں۔

کامریڈ کے تین بیٹے ہیں۔ سب سے بڑا کرانتی کمار ہے جو اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر پڑھائی کو الوداع کہہ کر ایک روبوٹ کی طرح باپ کے اشاروں پر کام کرتا رہتا ہے۔ انقلابی نعرے اُس کی زبان پر یوں آتے ہیں جیسے سوئچ (Switch) دباتے ہی ٹیپ ریکارڈر کی آواز جو سننے والے کی مرضی کے مطابق کبھی دھیمی اور کبھی اونچی ہو کر فلک شگاف بن جایا کرتی ہے!

کامریڈ کا دوسرا بیٹا شانتی کمار ہے جو پڑھ لکھ کر کچھ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ کامریڈ کا تیسرا بیٹا مانو کمار ہے جس کو باپ نے پیار سے کامریڈ منّا کا نام دیا ہے۔ اُس کی عمر آٹھ سال ہے مگر وہ اکثر اپنے باپ سے ایسے سوال کرتا ہے جن کا جواب وہ دے نہیں پاتا ہے، پھر بھی وہ اپنے باپ کا ہی نہیں بلکہ اپنی ماں کا بھی لاڈلا ہے۔

ماں کا اس لیے کہ وہ ٹیلی ویژن کا کارٹون چینل دیکھ کر ٹام اینڈ جیری، پوکیمان، سُپر مین وغیرہ وغیرہ کے کرداروں کے علاوہ رامائن کے کردار ہنومان کا حوالہ دے کر گندے لوگوں کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ کامریڈ اپنے تینوں بیٹوں کو کامریڈ کے نام سے مخاطب کرتا ہے اور اکثر بیرونی ممالک

کے انقلابوں کے بارے میں دلچسپ باتیں سنایا کرتا ہے۔ انقلابیوں کو غریبوں کے مسیحاؤں کا درجہ دے کر دنیا میں یکسانیت کا بھروسہ دلاتا ہے، جبکہ بیوی کو اپنے شوہر کی باتوں میں حقیقت کم اور پروپیگنڈے کی چمک دمک زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کو وہ وقت زیادہ پُرسکون نظر آتا تھا جب اس کا شوہر ایک مل مزدور تھا، مزدوروں کا لیڈر نہیں تھا، حالانکہ تب کسمپرسی کی زندگی سے روز آمنا سامنا ہوا کرتا تھا مگر اب گھر میں پُرکیف زندگی گزارنے کا ہر سامان ہوتے ہوئے بھی سکون کا فقدان ہے۔ اور جب شوہر بیوی کو بھی کامریڈ کہہ کر آواز دیتا ہے تب گویا راکھ کے نیچے دبے انگاروں پر پٹرول پڑ جاتا ہے اور آگ بھڑک جاتی ہے اور یوں ایک لیڈر اور اس کے بدترین دشمن میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے، گویا الیکشن سے پہلے سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کا کچا چٹھا بہ آواز بلند سنا رہی ہوں یا کسی ایوان میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچ رہی ہوں اور اکثر نظریاتی اور عملی اختلاف کی وجہ سے وہ دونوں بھی خونخوار درندوں کی طرح اور ضدی بچوں کی طرح لڑتے رہتے ہیں۔ آج بھی وہ معمول کی طرح ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ اور شوہر عارضی طور پر اپنے تیسرے بیٹے کی مرضی کے خلاف، کارٹون چینل کی بجائے نیوز چینل لگا کر شہر میں ہو رہے فسادات کے بارے میں تازہ ترین حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ مجبوراً اس کے تیسرے بیٹے کو بھی یہ دیکھنا پڑا کہ کیسے ایک ہی گھر کے دس افراد کو بے رحمی سے سر قلم کر کے مار ڈالا گیا تھا۔ لڑکے نے ایسا ہی ایک پروگرام اپنی پسندیدہ کارٹون چینل میں دیکھا تھا۔ لہو کی لکیریں ایسے ہی زمین پر گر پڑی تھیں لیکن ایک بونے نے ان لکیروں کو اپنے کرشماتی ڈنڈے سے ایک بوتل میں ڈال دیا تھا۔ اور پھر بوتل سے نکلے خون کے قطروں سے مقتولوں کی گردنیں دھڑوں سے جوڑ کر نہ صرف زندہ کر دیا تھا بلکہ ان قاتلوں کی خوب پٹائی کی تھی۔ لڑکا اس بونے کی آمد کا انتظار کر رہا تھا جبکہ اس کا باپ خوش ہو رہا تھا کیونکہ مرنے والے اس کے دشمن تھے اور اس کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ چونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ بیٹا باپ کی فتح کا منظر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اس لیے باپ نے بیٹے کو یا ایک لیڈر نے اپنے ایک حمایتی کو بہت سارے چاکلیٹ دے دیے!

''یہ ایک ڈراؤنا منظر تھا نا پاپا؟'' بیٹے نے باپ سے پوچھا لیکن جواب ایک لیڈر نے دے دیا ''یہ ظلم کی ایک اور کہانی ہے جو ظلم کی نوک سے مظلوم کی پیٹھ پر لکھ دی گئی ہے۔'' لڑکا کچھ کہے بغیر بونے کا انتظار کرتے ہوئے یہ جان گیا کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جنگ ہو رہی ہے اس لیے

معصوم بچّے کی طرح پوچھ بیٹھا۔

"پاپا! کامریڈ پاپا ہم ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"منّا! ہم انسان ہیں! جو مارے گئے وہ بھی انسان تھے۔ جنھوں نے مارا وہ وحشی درندے اور بے زبان حیوان ہیں!"

کامریڈ بیوی کی بات کاٹتے ہوئے گرج کر بولا: "ننھے کامریڈ یہ ایک ہی راستے پر چلنے والے، ہم نفس، ہم نوا، ہم سفروں کے کاروان کو منتشر کر کے ہجوم میں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے شیطان ہیں۔ ہم ہم خیال سیکولر طاقتیں، ان ہم خیال فرقہ پرستوں کا روکنا ہی ہمارا مقصد ہے۔ اور ہمارا عزم بلند ہے۔ ان کو حکومت کرنے کا موقع نہیں دیں گے۔ اگر مذہبی کارڈ کھیل کر یہ بازی جیت بھی لیں گے تو ہم واقعات کی آڑ میں ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ جیت کر بھی یہ لوگ ہار جائیں گے۔ سیکولرزم کا کرشماتی چہرہ دیکھ کر لرز جائیں گے۔"

بیوی غصّے سے اُبل کر کمرے سے نکل پڑی جبکہ لڑکے کو یقین تھا کہ اس کے پاپا بونے کی بات کر رہے ہیں۔ پھر بھی پوچھ بیٹھا "کامریڈ پاپا! سیکولرزم کا چہرہ کیسا ہوتا ہے۔ وہ کارٹون والے بونے جیسا نا؟"

کامریڈ غصّے سے لال ہو گیا مگر کچھ سوچ کر اس نے انگارے اپنے لاڈلے کے ماتھے پر لگانے کی بجائے اپنی مٹھی میں دبا کر اور درد کی شدت برداشت کرتے ہوئے سمجھایا۔ "میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان ہوں۔ بس انسان ہوں۔ مجھے عقیدوں سے نفرت ہے اور اعتماد پر بھروسا! میرا بھی لوک سبھا کے اسپیکر جناب سوم ناتھ چٹرجی کی طرح کوئی مذہب نہیں ہے اور ان ہی کی طرح میں سیکولر ہوں۔"

بیٹا بڑبڑانے لگا۔ "لیکن بونا تو بھگوان کی دی ہوئی شکتی سے اپنے تمام دشمنوں کو مٹی میں ملا دیتا ہے!"

یہ سب دیکھ سُن کر کامریڈ کی بیوی ایک زخمی شیر کی طرح چلاتی رہی۔ "جو باتیں مجھے پچھلے بیس برس میں سمجھ نہیں آئی ہیں وہ باتیں یہ بچہ کیا سمجھ پائے گا۔ ہڑتال بند کروا دو ورنہ کل یہ بچہ بھی اسکول نہیں جا پائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ روز کما کر روٹی کے دو ٹکڑے کھانے والے تمھارے بیٹے کو نمک مرچ لگا کر زندہ ہی نہ کھا جائیں!"

کامریڈ کو گھر میں ہو رہی بغاوت کا ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مشرق کی بیوی وہ بادل ہیں جو گرجتے ہیں برستے نہیں البتہ وہ حیران ہے کہ جو عورت گیلی لکڑیاں جلا کر دو روٹیاں بنایا کرتی تھی اور شدت کی گرمی میں مٹکے میں دو کوس چل کر ایک مندر کے چشمے سے ٹھنڈا پانی لایا کرتی تھی اب فرج سے نکالی بوتل کو منھ سے لگا کر پینے سے راحت محسوس کیوں نہیں کرتی۔ لڑکا کارٹون بھول کر خبروں کے ایک کے بعد دوسرے بلیٹن دیکھتا رہا اور اُس بونے کی آمد کا انتظار کرتا رہا جو گندے لوگوں کو بھگا دے گا اس لیے وہ ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا رہا جبکہ کامریڈ اپنے فون پر اپنے لوگوں کی باتیں سن رہا ہے اور کچھ سنا رہا ہے۔

بیوی کامریڈ کی باتیں سن کر زور زور سے چلا رہی ہے۔ ''اگر اسکندر راجا... کی مدد سے جنگ جیت گیا تو اس کو غدار کہا جاتا ہے۔ تم چوروں قاتلوں کی مدد کر کے حکومت کرنا چاہتے ہو۔ تواریخ تمھیں کیا کہے گی۔''

''تم سیکولر ہو۔ انسان کی زندگی سے مذہب کے کیڑے نکال کر انسانوں کو انسانوں کا ہم سفر بنا دینا چاہتے ہو! پھر ان کو اپنے کاروان میں شامل کیوں کر چکے ہو جو ایک چمڑے کی مل مالک کے بیٹے کے لیے ذات پات کی بنیاد پر ایک خاص رتبہ مانگ کر ایک غریب پجاری کے ذہین بیٹے کا حق چھین لیتے ہیں۔ کیا جنم لینے والے سے کوئی پوچھ لیتا ہے کہ تم کس کے گھر میں پیدا ہونا چاہتے ہو؟ ہندو کے گھر یا مسلمان کے گھر؟ ابراہم کے گھر یا کسی ہریجن کے گھر؟ شیعہ کے گھر یا سنّی کے گھر؟''

''پھر جنم کی وجہ سے سزا یا جزا دینے والوں کا ساتھ کیوں دے رہے ہو۔ کامریڈ؟ تمھیں حکومت چاہیے۔ ہم لوگوں کو شکم کی آگ بجھانے کے لیے روٹیوں کی ضرورت ہے۔ پناہ کے لیے چار دیواروں پر ڈالی گئی چھت کی ضرورت ہے۔ تن ڈھانپنے کے لیے دو گز کپڑے کی ضرورت ہے۔ چولھا جلانے کے لیے روزگار کی ضرورت ہے۔ نلکوں اور نہروں کی ضرورت ہے! دہقانوں کو کھاد کی ضرورت ہے اور بیماروں کو طبیبوں کی ضرورت ہے۔ کیا فرقہ پرستوں کو روکنے سے عوام کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔''

کامریڈ کو بیوی کی نا سمجھی پر ترس آ رہا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی کامیابی فرقہ پرستوں کی شکست میں پوشیدہ ہے۔ ایک محنت کش مل مزدور جب ایک منسٹر بن جائے گا تب ایک احمق بیوی سمجھ جائے گی کہ سیاست ایک مزے دار کھیل ہے۔ وہ اپنی کامیابی کی جھلکیاں ٹی وی پر دیکھنے

جب بھی جاتا ہے تب اس کا ننھا کامریڈ ایک ہی جملہ بولتا ہے: ''پاپا! کامریڈ پاپا!!! ابھی تک وہ بونا نہیں آیا ہے مگر وہ آئے گا!'' کامریڈ مسکرا کر پھر اپنی بیوی کی وہی باتیں مختلف لہجوں میں سن رہا ہے۔ کبھی للکارتی ہوئی آواز میں اور کبھی ایک فریادی ماں کی آہ زاریوں کی آواز کے ساتھ۔

اچانک کامریڈ کا نجی موبائیل بج اُٹھا تو کامریڈ کے غصّے کی لالی اس کی آنکھوں میں چھا گئی۔ کیونکہ دلّی سے شانتی کمار نے SMS کر کے اپنے باپ کو یہ اطلاع دی ہے کہ اس کا آئی آئی ٹی میں ۹۶ فیصدی نمبر لے کر بھی داخلہ اس لیے نہیں ہوا کہ وہ بے شک اپنے مذہب کو ترک کر چکا ہے اور ایک کامریڈ ہے مگر جنم سے وہ براہمن ہے اس لیے ۶۰ فیصدی نمبر لانے والے ایک ہریجن آئی اے ایس افسر کے بیٹے کو داخلہ دیا گیا۔ کامریڈ کے اندر بیٹھے باپ نے فوراً دہلی جانے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے معاون کو دنگے فسادات جاری رکھنے کی ہدایات دیں۔

چھوٹا کامریڈ اپنے باپ کو آوازیں دیتا رہا کہ اُس نے بڑے بھیّا کو ٹی وی پر دیکھا ہے مگر کامریڈ اپنے معاون کو یہ سمجھا رہا تھا کہ اگر ان کا کوئی آدمی تصادم میں مارا جائے تو لاش کو پارٹی کے پرچم سے لپیٹ کر اُن کی پارٹی کے دفتر لایا جائے۔ پھر شہید کے والدین کو دفتر میں لا کر ایک جلوس نکالا جائے پھر وہی سب کیا جائے جو اُن کے کاروان کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش میں ہر بار کیا جاتا ہے۔

کامریڈ غصّے سے اُبلتے ہوئے جونہی اپنی بلیٹ پروف کار کے قریب پہنچا تو اپنے چھوٹے کامریڈ کی وردناک چیخ سن کر تو نہیں رُکا مگر اپنے موبائیل کی گھنٹی سن کر شہید ہونے والے اپنی پارٹی کے جانباز سپاہی کا نام جان کر وہ یوں گر گیا جیسے ہوا کے جھونکے سے ایک خزاں آلودہ پتہ شاخ سے الگ ہوا ہو کیونکہ شہید ہونے والا اُس کا بیٹا کرانتی کمار تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا، موبائیل کی گھنٹی پھر بج اٹھی اس بار شانتی کمار کا ایس ایم ایس (S.M.S) تھا۔ وہ یکسانیت کا دعویٰ کرنے والی اپنے ابا کی پارٹی، جو حکمران پارٹی کی ایک مضبوط حلیف ہے، کے صدر دفتر میں اپنے ساتھ ہوئی ناانصافی کے خلاف خودسوزی کرنے جا رہا تھا۔

یہ اطلاع پڑھ کر ایک لیڈر کا غصّہ اور بھڑک گیا مگر ایک باپ یوں دوڑتا رہا گویا زمین پر گرا ہوا پتہ آندھی کے ساتھ اُڑتے ہوئے یہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

اس کا چھوٹا کامریڈ اپنے بڑے بھائی کا خون سے لت پت جسم دیکھ کر بونے کا انتظار کرنے

کی بجائے اپنی ماں سے لپٹ گیا ہے۔ بیٹا ماں کی مدد کرنے کی خاطر سُپر مین (Super man) کو فون کرنے کے لیے اصرار کر رہا تھا جبکہ ماں برف کی طرح ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ یہ منظر ایک بلندی پر ہے اس لیے نہ اس کو ملوں میں کام کرنے والے مزدور دیکھ سکتے ہیں اور نہ کھیتوں میں کام کرنے والے دہقان دیکھ سکتے ہیں۔ نہ امن کے خواہش مند سپاہی دیکھ سکتے ہیں اور نہ روزگار کی تلاش میں گھر سے بھوکے نکلے ہوئے مزدور دیکھ سکتے ہیں!

ہاں عرش پر بیٹھا خدا یہ منظر دیکھ رہا ہے مگر وہ ان کو کیا سمجھائے جنھوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ اس کا نام بھی جوڑ دیا ہے! جب خدا کچھ نہیں کر سکتا تو اس کو مسیحا سمجھنے والے کیا کر سکتے ہیں۔ منظر بلندی پر نہ ہوتا تو شاید مظلوم ظالموں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے!

مگر تب —!! لیکن کب؟؟

OO

آخری خواہش

میں شاد بھی ہوں اور ناشاد بھی ہوں۔

شاد اس لیے ہوں کیونکہ دنیا بنانے والے نے میری عبادت قبول کر کے مجھے وہ غیبی طاقت دی ہے جس سے میں کوئی بھی ایک ایسا کام کر سکوں جس کا حوالہ دے کر دنیا مجھے ایک مسیحا کا لقب دے سکے! یا پھر مجھے سکون دے پائے!

ناشاد اس لیے کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ میں قہرِ خدا کی کسی قدرتی ناگہانی آفت کو روک دوں یا پھر قہرِ آدم کی بھیانک صورت کا چہرہ مسخ کر دوں۔ کیونکہ میں جس برگد کے نیچے بیٹھا کٹھن تپسیا کر رہا تھا اس لیے میرے پربھو کے دیے ہوئے وردان کے بارے میں جان چکا تھا۔ میں جونہی اپنے نیک سفر پر نکلنے والا تھا کہ درخت نے آواز دی تھی — اے نیک بندے! میری فریاد بھی تو سنتا جا! یہ سوچ سمجھ کر میں نے تمھیں تحفظ دیا۔ تمھیں دُھوپ، بارش، برف کے علاوہ اپنی جڑوں میں چھپے زہریلے ناگوں اور پاتال میں رہنے والے راکھشسوں سے بچایا۔ دن رات جاگ کر میں نے تمھاری تپسیا کو بھنگ نہیں ہونے دیا۔ اندرلوک کی اپسرائیں جب تمھاری سادھنا کو بھنگ کرنے آئی تھیں تب میں نے اپنے پتّوں سے ایسے سُر نکال دیے تھے جن کو سن کر اُن کی توجہ ہٹ گئی تھی ورنہ جہاں مہارشی وشوامتر جیسے تپسوی مینکا کے گھنگھروؤں کی آواز سن کر بہک گئے تھے وہاں تم کیا کر پاتے۔ تو میرا احسان مان یا نہ مان مگر میری کہانی تو سن جا!

او جانے والے سن تو لے میری کہانی — تیز ہوا کے جھونکوں سے میں تھرتھرا جاتا ہوں! میری شاخیں کانپتی رہتی ہیں اور پتے لرز جاتے ہیں! لرزتے پتے مجھ سے جدا ہو کر، سسک سسک کر، بے بس ہو کر اُڑتے اُڑتے مجھ سے بچھڑ کر، دور کہیں گر جاتے ہیں گویا بچے ماں سے بچھڑ کر کسی بیابان میں کھو جاتے ہیں۔ ماں بچوں کو ڈھونڈ سکتی ہے بلکہ ڈھونڈ ہی لے گی کبھی، مگر میں یہاں سے

ہل نہیں سکتا نا!

لوگ کہتے ہیں میری جڑوں میں برہما رہتے ہیں۔ میرے تنے میں وشنو موجود ہیں۔ مگر میرے پتوں کو جوانی میں مار ڈالنے والے طوفان کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا! میرے پتوں کو ڈھونڈ کر لے آؤ۔ ہرے ہرے پتے! جو دُور تک مجھ کو تڑپ تڑپ کر صدائیں دے رہے تھے! ہمیں بچالو! ہمیں بچالو! ہمیں بچالو! یہ ہوائیں جانے کہاں لے جا رہی ہیں ہمیں!! جانے کہاں گر پڑے ہوں گے میرے پتے! کسی جھیل کی سطح پر! یا کسی دلدل کے اوپر!

درخت کی کہانی سنتے سنتے میں نے سوچا طوفانوں کو روکنا ایک نہایت ضروری کام ہے!

اس سے پہلے کہ میں آنکھیں بند کر کے دنیا بنانے والے کو اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنے سامنے پاتا ایک عورت کی نوحہ خوانی نے مجھے چونکا دیا۔ وہ خشک لکڑیاں جمع کر رہی تھی بلکہ خشک پتے بھی۔ اس سے پہلے کے میں نوجوان عورت کو پتے اکٹھے کرنے سے روک لیتا، درخت کی ایک بغیر پتوں کی شاخ پر بیٹھے مایوس پرندے نے کہا: تم کیسے انسان ہو؟ پتے نظر آئے مگر وہ گھاس پھوس نظر نہیں آ رہے ہیں کیا؟ وہ میرا اُجڑا گھونسلہ ہے! اس میں میرے انڈے تھے! میری چھوٹی سی دنیا تھی! میرے ارمانوں کی دنیا تھی! طوفان سے اکھڑ گئی!

جب پتے گر رہے تھے تب میرے انڈے بھی گر گئے تھے ویسے ہی جیسے اس بیوہ کے آنسو اس کے شوہر کی لاش پر گر رہے تھے! وہ اپنے شوہر کی اَدھ جلی لاش کو اِن پتوں کا کفن اوڑھا کر چتا کو آگ دکھانا چاہتی ہے! بے چاری دہشت گردی کی آگ سے نکال کر اپنے شوہر کو یہاں لے آئی تھی یہ سوچ کر کہ وہ بھی کل یگ میں ساوتری بن کر مہا کال سے اپنے ستہ وان کو جیون دان دے پائے گی!

میں تذبذب میں تھا کہ کیا کیا جائے؟ سوچا کیوں نہ پتوں کو آگ کی تپش سے بچایا جائے مگر ایک اُڑ رہے پتے نے مجھے یہ اطلاع دی کہ وہ بہت دُور سے آ رہے ہیں اور طوفان اُس پھلوں کے باغ کو اکھاڑ کر یہاں چھوڑ گیا ہے۔ وہ جو لکڑیاں بیوہ اپنے شوہر کی چتا پر رکھ رہی ہے وہ اُسی باغ کے سر سبز درختوں کی ٹہنیاں ہیں۔ گیلی ہیں نا اس لیے کیسے جل پائیں گی؟ تم اس بے کس کی مدد کرو نا؟ تمھارے پاس طاقت جو ہے؟ بس تمھیں زبان ہلانی ہے! الہ دین کی طرح چراغ کو جیب سے نکال کر اس کو رگڑنا بھی نہیں ہے! پھر جن نمودار ہونے کے بعد من چاہا حکم بھی نہیں دینا ہے! اُڑتا ہوا پتہ بیوہ کے ہاتھ میں آتے ہی خاموش ہو گیا تو میں ایک بار پھر سراسیمگی کی حد تک

تذبذب کا شکار ہو گیا۔ میں نے کون سا کوئی ایٹم بم یا کیمیکل ہتھیار بنا دیے جو میری طاقت کی بات اُڑتے ہوئے پتّے کو اُڑتی ہوئی گرم خبر کی طرح معلوم ہے۔ پرندہ میری کیفیت بھانپ گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ایک باز کی طرح میرے کندھے پر بیٹھ کر بولتا رہا۔ پل دو پل کے لیے رُکے بغیر۔ حالانکہ میں راجا وکرم کی طرح چپ رہا اور پرندہ بیتال کی طرح میری خاموشی توڑنے کی کوشش کرتا رہا۔

مجھے باز بنا دو تو میں تمھارے کندھے پر بیٹھ کر تمھیں اس ملک کا راجا بلکہ مہاراجا بنا دوں گا۔

ہاں یا نا بولو! میں بیتال کی طرح تمھارے بولتے ہی اُڑ نہیں جاؤں گا۔

اچھا اگر میں تمھیں یہ بتا دوں کہ بیوہ کا شوہر اپنی بیوی کی عزّت بچاتے بچاتے اپنی جان گنوا بیٹھا اور بیوی اپنے نیم مردہ شوہر کو پانے کے لیے اپنی عصمت کا سودا کر بیٹھی تو کیا اس کی مدد کرو گے؟ تم اِس کے شوہر کو زندہ کر سکتے ہو! بولو کرو گے یا نہیں؟ بے چاری دردِ محبت سے جاں بلب ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اس کی چتا کو کون بنائے گا؟ کھا جائیں گے گدھ یہ نوچا ہوا جسم! تم کیسے رشی ہو؟ درخت کو پتّے نہیں دے سکتے؟ مجھے میرے انڈے نہیں دے سکتے؟ بیوہ کو سہاگ نہیں دے سکتے؟

قہرِ خدا سے کائنات کو نہیں بچا سکتے؟

قہرِ آدم سے انسانیت کو نہیں بچا سکتے؟

پھر تم کیا کر سکتے ہو؟ یہ تو بتا دو مہارشی؟

پرندہ کچھ اور بھی بولتا مگر ایک بھیانک دھماکے کی گونج سن کر میں چونک پڑا اور پرندہ اُڑ گیا۔

چاروں طرف دُھواں ہی دُھواں دیکھ کر میں سمجھ بیٹھا کہ شاید چِتا پر رکھی گیلی لکڑیاں شعلے پیدا کرنے کی بجائے دُھواں بن کر ایک ابھاگن کی کہانی میری آنکھوں میں اُتار کر دل اور دماغ کو ہلا رہی ہیں۔ مگر بات کچھ اور تھی۔

شہر میں ایک ساتھ کئی جگہوں پر بم دھماکے ہونے کی وجہ سے شہر کے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر دوسروں کے خالی خالی گھروں میں پناہ لے رہے تھے اور جب یہ جان پاتے تھے کہ وہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے وہ افراتفری اور شورش کے ملے جلے تاثرات کے شکار ہو کر ایک دوسرے کو روند کر یا دھکیل کر دوڑ رہے تھے، چیختے چلاتے، روتے بلکتے۔ بچے اپنوں سے بچھڑ کر کھو گئے تھے۔ شاخوں سے جدا ہوئے پتّے اُڑتے اُڑتے کھو گئے تھے۔ کیفیت ایک زبردست طوفان کی تھی لیکن

ہوا میں گویا شور، چیخ و پکار اور نوحہ خوانی کی آوازوں کی وجہ سے تھم گئی تھی۔

لہولہان لوگ اسپتالوں کے اِرد گرد سڑکوں پر پڑے کراہ رہے تھے۔ پیاسے، دم توڑ رہے لوگ گویا کنویں کے پاس پہنچ کر بھی دو بوند پانی پی نہیں سکتے تھے۔

مجھے راستے میں پڑا کسی بدنصیب کا مردہ بچہ ملا۔ جی تو چاہا کہ اس بچے کو زندہ کروں، مگر پھر سوچا کہ اگر اس کی ماں کہیں نہیں ملی تو پھر کیا کروں گا؟

جب میری نظر آسمان میں اُڑ رہے گدھوں پر پڑی تب میں نے اپنا چولا اُتار کر اُس کا کفن بنا دیا اور بچے کو گود میں اُٹھا کر بھیڑ اور ہجوم کو چیر کر جہاں بھی پہنچا وہاں نہ بچے کو دفن کرنے کی جگہ ملی اور نہ ایک ننھی سی جان کو جلانے کی جگہ ملی کیونکہ دفن کرتا تو دلدل میں دھنس جاتا اور شمشان اَدھ جلی چتاؤں سے بھرا پڑا تھا۔

آخر یہ سوچ کر کہ خشکی کے جانور لاش کو چیر پھاڑ کر کھا نہ جائیں میں نے بچے کو ایک پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا۔ میں جانتا تھا کہ لاش دیکھ کر پانی بھی گھبرا گیا ہوگا مگر آب میں رہنے والے جانداروں کے لیے زمین پر کچلے انسان کا بچہ ایک غذا ہے، اس لیے میں نے دنیا بنانے والے سے کہا۔ میری خواہش ہے کہ آبی جانور اس بچے کو نوچ نوچ کر نہ کھائیں اور پانی میں رہ کر جسم کو ذرا چین سے ابدی نیند سو لینے دیں!

وہ پرندہ جانے کہاں تھا اور کیوں آ کر میرے کندھے پر بیٹھ کر بولا:

آخری سوال پوچھ رہا ہوں۔ چاہو تو جواب دو، ورنہ تمھاری مرضی! اِس بار میں اصرار نہیں کروں گا۔ اگر دنیا بنانے والے نے تمھیں تمھاری ایک خواہش پوری کرنے کی بجائے تمھاری دو خواہشیں پوری کرنے کا وردان دیا ہوتا —— تو —— تمھاری دوسری خواہش کیا ہوتی؟

پرندہ شاید یہ سوچ رہا تھا میں دنیا میں شانتی قائم رکھنے کی خواہش ظاہر کروں گا تاکہ نہ کوئی دیار اُجڑ پائے اور نہ کسی کا گھربار اکھڑ پائے۔ میں تذبذب میں تھا کہ قہرِ خدا کے روکنے کی خواہش ظاہر کرتا یا پھر قہرِ آدم کو ٹوکنے کی خواہش ظاہر کرتا! درخت کی باتیں یاد کرتے ہوئے پتّوں کو شاخوں سے لپٹ کر رہنے کی خواہش ظاہر کرتا یا پھر ہجوم میں بچھڑے بچوں کو اپنے والدین سے ملا دینے کی خواہش ظاہر کرتا! وحشی درندوں کو سکون بخش کر انگولی مال جیسے لوگوں کو جوگی بنا دینے کی خواہش ظاہر کرتا یا پھر جوگیوں کے لیے بستیوں میں سکون پانے کی خواہش ظاہر کرتا!

میں تذبذب کے دلدل سے نکل نہیں پا رہا ہوں کیونکہ فسادات کی زد میں آ کر میں بھی تو لہولہان ہو چکا ہوں نا!

سر میں چوٹ آنے کی وجہ سے لہو بھی تو بہہ کر مٹی کے ساتھ مل رہا ہے نا!

میں نے پرندے سے اپنی دوسری خواہش کا اظہار کر کے پرندے کو بتا دیا کہ میں اگلے جنم میں نہ انسان بننا چاہتا ہوں اور نہ حیوان، بلکہ پرندہ بھی نہیں! میری خواہش ہے کہ دنیا بنانے والا میری تڑپ رہی آتما کسی مکوڑے کے جسم میں ڈالے تاکہ زمین کے اندر تاریکیوں میں اُجالوں کو ڈھونڈ سکوں! یہ میری دوسری اور آخری خواہش ہے!! پرندہ جواب سنتے ہی اُڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ میں زمین چھوڑ کر ہوا میں کھڑا ہو رہا ہوں۔ گویا برف پگھل کر ڈھوپ میں سما گئی ہے!

OO

بدنام

جب گوری بار بار ڈاکٹر راگنی کے کیبن (Cabin) کا پردہ ہٹا کر اُس کی توجہ مبذول کرنا چاہتی تھی تب ڈاکٹر راگنی اس کو اُس کی ماں سمجھ کر تقریباً بیس سال پہلے ایک گزرے حادثے کی یاد سے یوں چونکتی رہی گویا اُس پر بجلیاں گر رہی تھیں۔ وہ حادثہ اُس کی زندگی کا وہ المناک سانحہ تھا جس کا ذکر وہ کسی سے بھی نہیں کرنا چاہتی ہے۔ خاص طور پر اپنے شوہر کو وہ اپنے اُس المیے کے بارے میں قطعاً کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی ہے کیونکہ جو بھی ہوا تھا اُس کے بچاؤ کے لیے نہ تو اُس کے پاس وکالت کا مواد ہے نہ وضاحت اور نہ جواز! یہ سوچ کر کہ بیس سال کے بعد بھی ایک عورت اتنی خوبصورت کیسے ہوسکتی ہے اور ہم شکل ہونا ایک اتفاق بھی تو ہوسکتا ہے۔ تجسس اور تذبذب کی کشمکش پر قابو پا کر اُس نے گوری کو اپنے کیبن میں جوں ہی بلایا، ڈاکٹر راگنی جان گئی کہ جس کو وہ گاؤں کے پجاری کی پری چہرہ بیوی سمجھ بیٹھی تھی وہ اُس کی بیس برس کی بیٹی ہے جس نے اس کو پہچان لیا تھا اور ملنے آئی تھی۔ یہ جان کر ڈاکٹر راگنی نے ایک مہربان کی طرح ایک مریضہ سے اُس کی بیماری کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تھی مگر گوری نے سلیم کا ذکر چھیڑ کر جب یادداشت کو تازہ کرنے کی خاطر وہ اخبار، جس میں سلیم کی پوسٹ مارٹم کے بعد لی گئی تصویر چھپی تھی اور اُس کے نیچے لکھی عبارت میں اُس کو ایک خطرناک دہشت گرد ثابت کیا تھا، راگنی کے سامنے رکھا تب راگنی کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ شکل سے بھولی بھالی عورت یقیناً بلیک میل (Blackmail) کرنے آئی ہوگی۔ اخبار چھین کر ڈاکٹر راگنی مصلحتاً گاؤں کے بارے میں بولتی رہی اور اُسے اچانک وہ منظر یاد آیا جب سلیم کی بیوی نے اس کو گاؤں والوں کے سامنے سلیم کی رکھیل ہونے کا مجرم ٹھہرا کر عتاب کے ہتھوڑوں سے اس کی فولادی عزت کو بے شکل کر کے چند گھنٹوں میں ہی گاؤں بدر کر دیا تھا۔ وہ ڈاکٹر راگنی کا بدترین دن تھا۔ وہ ایک تماشہ تھی اور سارا گاؤں تماشائی تھا۔ کوئی اُس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں کہہ رہا تھا ہاں مگر ہر چہرہ سلیم کی عادتوں اور عیبوں کے پس منظر میں راگنی کے دامن

پر لگے داغ کی تصدیق کر رہا تھا۔ گاؤں میں ایک ہی ہندو کا گھر تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ صدیوں سے اس کے خاندان والے ہی گاؤں میں واقع پراچین (قدیم) مندر کے پجاری رہے ہیں۔ گوری کا باپ بھی اُسی مندر کا پجاری تھا۔ گاؤں کے مسلمان مذہب پرست تھے مگر فرقہ پرست نہیں تھے۔ سلیم کا چاچا اس خاندان کی مالی امداد کیا کرتا تھا اس لیے اچھے ماحول میں اچھے دن کٹ رہے تھے مگر راگنی کے ساتھ جو ہوا اُس کے بارے میں سوچ کر بھی وہ لرز اٹھتی ہے!

اخبار میں چھپی سلیم کی یہ تصویر اُس نے بھی چند برس پہلے دیکھ لی تھی۔ تب وہ جذبات اور خیالات کے بھنور میں پھنس کر یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اس کو سلیم کے انجام پر خوش ہونا چاہیے یا نوحہ خوانی کرنی چاہیے۔ اُس کے شوہر نے جب اُس کے کانپتے ہاتھوں سے اخبار لے کر خبر کو پڑھ کر سنایا تب راگنی یہ سب جان کر سکتے میں آ گئی تھی کیونکہ وہ وثوق سے کہہ سکتی تھی کہ سلیم نہ تو ایک دہشت گرد تھا اور نہ سرکار کا ایک مخبر تھا۔ جب اُس کے بڑبڑانے کی آواز اُس کے شوہر نے سن لی تھی تو ایک ڈاکٹر نے دوسری ڈاکٹر کی کیفیت بھانپ کر اُس کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے لیے ایک ہی بات ہے۔ کوئی کسی کے لیے شہید ہو یا غدّار، ہم نے تو مردہ انسان پر بھی چھری چلانی پڑتی ہے اور زخمی انسان پر بھی نشتر چلانے پڑتے ہیں، ایک پر پوسٹ مارٹم کے لیے اور دوسرے کی جان بچانے کی خاطر! ڈاکٹر راگنی نے اپنے شوہر کی کُرید کو ٹالنے کے لیے اخبار کو چیر پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور یوں محسوس کیا تھا گویا دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ مگر اس عورت کی باتیں سن کر ذہنی کُرید پھر شروع ہو گئی۔ یادوں کا تسلسل پھر شروع ہو گیا۔

ایک لمبے سفر کے بعد وہ اپنا سامان لے کر ایک ایسی جگہ بس سے اُتر گئی جہاں اس کو یوں لگا تھا جیسے ایک چیل نے ایک چوزے کو اپنے پنجوں میں اُٹھا کر چونچیں مار مار کر کھا جانے کی بجائے ایک ایسے علاقے میں چھوڑ دیا تھا جہاں نہ سڑکیں تھیں، نہ گلی کوچے تھے، نہ بازار تھا اور نہ ہی کوئی دکان تھی۔ ہاں اِدھر اُدھر مکان تھے مگر نہ محلّے تھے اور نہ کوئی انسان نظر آ رہا تھا جو اُس کو اپنی منزل تک پہنچانے میں مدد کر پاتا۔ شاید اس لیے کہ دن کروٹ بدل کر شام کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک بچے کی طرح رو پڑتی اور اپنے آپ کو اس لیے کوسنا شروع کر دیتی کہ اُس نے اپنے شوہر کی ملازمت کے لیے امتحان کی تیار کرنے کے مشورے پر عمل کیوں نہیں کیا۔ ایک جیپ کے ہارن نے اُس کو چونکا دیا تھا۔ جیپ قریب آتی گئی اور اُس کی سانسیں پھولنے لگیں۔ پھر اچانک جیپ کی ہیڈ لائٹس (Head Lights) جب اس کے چہرے پر چمک اُٹھی تھیں تب اُس کا جسم گویا

ٹوٹ گیا تھا۔ جیپ اُس کے پاس رُک گئی تھی، اور ایک شائستہ مگر مزاحیہ انداز میں گفتگو کرنے والا نوجوان اُسے اپنے گھر لے گیا تھا اور اپنائیت کا احساس دلا کر اُس کے تمام اندیشوں اور خدشات کے طوفان کو گویا پکڑ کر جکڑ دیا تھا۔

وہ رات اُس نے نوجوان کے ایک محل نما مکان کے مہمانوں کے لیے رکھے گئے اُس مخصوص کمرے میں گزاری تھی جہاں مہمان نوازی کے لیے کئی نوکر آتے جاتے رہتے تھے لیکن ایک مہمان عورت سے ملنے ایک بھی میزبان عورت نہیں آئی تھی۔ صبح سویرے جب اُس نے برف سے ڈھکی پہاڑیوں کے پیچھے چڑھتے سورج کی اُجلی کرنوں کو آس پاس سرسبز جنگل کی شاخوں میں جھانکتے ہوئے دیکھا تھا تو یوں لگا تھا گویا آسمان سے اُتری پریاں اُس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اشارے کر رہی ہوں۔ پھر گرد و پیش نظریں دوڑائی تھیں تو گاؤں کی خوبصورتی سے پہلی ہی نظر میں پیار ہو گیا تھا۔ جھک کر دیکھا تھا تو وہاں درجنوں چرندے تھے مگر گوبر کی بدبو پر بھی گاؤں کی مٹی کی خوشبو حاوی ہو گئی تھی۔

کمرے کے اندر ایک چھوٹی سی لائبریری تھی جس میں رومانی ناول بھی تھے اور خلیل جبران کے فلسفوں کی کتابیں بھی تھیں۔ ثقافتی، تواریخی اور اقتصادیات کی کتابیں بھی تھیں۔ بیٹری سے چلنے والا ایک ریکارڈ پلیئر بھی تھا اور درجنوں کلاسیکل سنگیت وغزلوں کے ریکارڈ بھی تھے۔ گویا مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے بعد اپنی زندگی گزارنے کے لیے اُس کے پاس اپنا وقت گزارنے کے لیے طرح طرح کا سامان تھا مگر وہ اپنے مہربان میزبان کا کوئی تصوراتی خاکہ بنانے کے لیے کمرے میں آتے جاتے نوکروں سے جب بھی سوالات کی نوک سے کریدنے کی کوشش کرتی تھی تب وہ بھی فرمانبرداری کے لوازمات پورے کر کے چلے جایا کرتے تھے۔

آخر ایک دن تجسس ٹوٹ گیا اور ڈاکٹر راگنی اپنے میزبان کے بارے میں یہ جان گئی تھی کہ مہمان خانے میں وہ خود رہتا ہے، وہ بھی تب جب گھر آ جائے ورنہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت شہر میں یا پھر اُن مقامات پر گزارتا ہے جہاں سیاح آتے جاتے ہیں۔ گھر کے ملازموں نے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ وہ چونکہ کاروباری انسان ہیں اس لیے گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ان کی بیوی ایک عابدہ ہے، پردے میں رہ کر زیادہ وقت عبادت میں گزارتی ہے۔ مگر جب ڈاکٹر راگنی اپنے شفاخانے کی دوسری منزل یعنی اپنی سرکاری رہائش میں رہنے گئی تب وہ اپنی نوکرانی کی مدد سے کبھی کتابیں، کبھی غزلوں کے کیسٹس منگواتی رہتی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس کا میزبان ایک مہربان دوست بن

گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے سلیم اور راگنی کے نام سے مخاطب ہوتے رہے، آپ سے تم پر آتے ہی سلیم اپنے گاؤں میں رہنے لگا اور دونوں گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی ساتھ ساتھ سیر سپاٹے بھی کیا کرتے تھے۔ سلیم راگنی کو ہر سنیچر کو اپنے ماں باپ سے ملوانے کے لیے لے جاتا رہتا تھا۔ پھر ایک دن، چند مہینوں کی قربت رنگ لائی تھی اور راگنی کو بے رنگ ہو کر بلکہ ذلیل ہو کر، تبدیل ہو کر گاؤں چند گھنٹوں کے اندر چھوڑ کر جانا پڑا تھا اور جو بھی ہوا تھا وہ سلیم کی عدم موجودگی میں۔ ہوا یوں تھا کہ سلیم کی بیوی نوری نے راگنی کو اپنے جلوے دکھا کر ورغلانے کا الزام لگا کر، خود ہی وکیل اور خود ہی جج بن کر سزا سنادی تھی۔

راگنی کی حالتِ بد دیکھ کر دَبے دَبے الفاظ میں نوری کے والد کے ڈرائیور نے راگنی کے سامنے سلیم کے چہرے سے نقاب اُٹھا کر اُس کو سلیم کی کہانی اس لیے بتادی کہ اُسے شیر کے پنجے سے نکل کر اپنی آبرو ایک عیاش اور اوباش انسان سے بچا تو لی ہے، سلیم کی کہانی بھی فلمی ہے۔ نوری کا باپ اُس کا سگا چچا ہے اور کروڑوں کا مالک ہے۔ اپنے بڑے بھائی کی بے وقت موت کی وجہ سے اُس نے نوری کا اپنے بڑے بھتیجے سے نکاح پڑھوا دیا تھا مگر ایک بے بس باپ تب کیا کرتا جب اُس کی اٹھائیس سال کی بیٹی بیوہ ہوگئی تھی۔ وجہ ایک کار حادثہ! کافی غور وخوض کے بعد ایک بے بس باپ نے اپنی اکلوتی اولاد کی بہتری کے لیے نوری کا نکاح اپنے دوسرے اٹھارہ سال کے بھتیجے سلیم سے پڑھوا دیا۔ حالات نے ایسے واقعات پیدا کیے تھے کہ دلہن شادی کا جوڑا پہن کر بھی اپنے شوہر کی بے وقت موت اور حادثے کے المناک تاثرات کو یاد کرتے ہوئے چیختی چلاتی رہتی تھی۔ پاگلوں جیسی حرکتیں کیا کرتی تھی۔ گھر کے وفادار نوکر نوکرانیوں کو اپنی مرحومہ والدہ کی طرح پیار کرنے والی ایک نرم دل والی نوری بیگم بات بات پر اذیتیں دیتی رہی۔ ایک زخمی شیرنی کی طرح اپنے شکار کا پیچھا کرتی رہی۔ جبکہ دولہا میاں پُراسرار طریقے سے غائب ہو کر کبھی کبھار گھر آتا جاتا رہا۔

میاں بیوی کا رشتہ قائم ہی نہیں ہو سکا۔ دونوں بچپن سے ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ دونوں ایک اَن دیکھی آگ میں جلتے رہے اور اٹھارہ برس کا سلیم اپنے سے دس سال بڑی ماں کا پیار دینے والی اپنے باپ جیسے بھائی کی بیوہ سے آنکھ ملانے کی بجائے یا تو وہ اپنی پیاسی آنکھوں سے شہر و گاؤں کی لڑکیوں سے دل بہلانے کی خاطر گھر سے دُور دُور رہا کرتا تھا یا جب وہ گاؤں میں ہوتا تھا تب کنواری لڑکیاں اور گاؤں کی جوان عورتیں بھی اُس کے سامنے سے گزرنے

سے گریز کیا کرتی تھیں۔ پھر وہ اب تک راگنی کے بہت نزدیک رہ کر بھی کبھی اس کے قریب کیوں نہیں آیا۔ اکثر گئی رات تک وہ اس کے کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ پھر اگر وہ ایک عیاش واوباش رئیس زادہ ہے تب اس کے ساتھ سنگیت، آرٹ، فلسفوں اور کتابوں کی باتیں کیوں کیا کرتا تھا جبکہ ڈاکٹر راگنی اپنے پیشے کی آڑ میں سلیم کے کسی بھی سوال کا جواب دے سکتی تھی۔ چونکہ پڑھے لکھے جوان دل دو دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو اپنے اپنے پیار کے قصے سنایا کرتے تھے۔ بقول سلیم وہ ایک ہی لڑکی سے پیار کرتا ہے جبکہ کئی عورتیں اُس کی دوست ہیں۔ کوئی اس لیے کہ بہت اچھی گلوکارہ ہے۔ کوئی اس لیے کہ وہ اُس کو اس کے من پسند کھانا کھلاتی ہے۔ کوئی انگریزی میم اس لیے کہ دونوں مچھلیاں پکڑتے یا گولف کھیلتے ایک دوسرے کو مزے دار لطیفے سناتے رہتے ہیں۔ دوست، دوست پر بھروسہ کرے تو نجی باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ نہ سلیم اور نہ راگنی اپنی محبوبہ یا شوہر کا مذاق اُڑانے کی خاطر ان کی بے ہودہ حرکتوں کا ذکر کر کے قہقہے لگایا کرتے تھے اس لیے ڈاکٹر راگنی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا سلیم ایسا کر سکتا ہے۔ ہر بار جب ڈرائیور کی دبی دبی باتیں سن کر وہ اپنا حوالہ دے کر اس کو یہ بتا دینا چاہتی کہ سلیم بد نہیں بلکہ بدنام ہو سکتا ہے، اُس کی زبان پر خدشات تالا لگا دیتے اور یہ سوچ کر کہ کہیں سلیم اپنائیت کی آڑ میں اُس سے میاں بیوی کے درمیان ہوئی نجی باتیں جان کر اُس کو بلیک میل کر کے اپنے شوہر سے الگ کروا کر اُس کو زندگی بھر استعمال کرنے کا جال تو نہیں بچھا چکا ہے؟

یہ بات اُس کے ذہن میں تب اُبھر کر آئی جب ڈرائیور نے اُس کو یہ بتایا کہ سلیم دانے ڈال کر پنچھی کو دوست بنا لیتا ہے اور کسی بھی وقت اُس کے پَر کتر کر اُڑنے کے قابل نہیں رکھ دیتا ہے۔ اُس روز وہ اپنے آپ کو کوستی رہی کہ اُس نے سلیم کو کیوں یہ بتا دیا تھا کہ اُس کا شوہر اپنی بیوی کو پہلی بار پلنگ پر ننگی دیکھ کر آپریشن کا سامان ڈھونڈنے لگا تھا۔ اور اگر یہ بات —؟ یہ سوچ ہی اس کے وجود پر بجلیاں گراتی رہی جبکہ سمجھ بادلوں کی طرح ٹکرا کر گرجتی رہی۔

آج جب وہ دو بچوں کی ماں ہے اور اپنے شوہر کو امریکہ سے واپس بلانے میں کامیاب ہو گئی ہے وہ اخبار دیکھ کر گھبرا گئی۔ مگر اس سے پہلے کہ ڈاکٹر راگنی گوری کے ہاتھ سے اخبار چھین کر اُسے اپنے کیبن (Cabin) سے نکال دیتی، گوری نے راگنی سے کہا کہ وہ اخبار کو سینے سے لگا کر سو جاتی ہے۔ راگنی سمجھ بیٹھی کہ سلیم نے اُس کو بھی جال میں پھانس لیا ہو گا تو گوری نے اُس کی کیفیت بھانپ لی اور آہ بھر کر بول پڑی کہ آپ کے جانے کے بعد ہمارا گاؤں بھی دہشت گردی

کا شکار بن گیا لیکن سلیم کے چاچا ہماری حفاظت کرتے رہے۔ پھر کسی دوسرے گاؤں کے ایک آدمی کو میری ماں پسند آئی۔ اُس نے سلیم سے یہ سودا طے کرلیا کہ پجاری کو مار کر وہ خود اُس کی بیوی سے شادی کرلے گا اور مجھے سلیم کے سپرد کردیا جائے گا، گاؤں کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ سلیم شام کو آجائے گا اور اُس کو اپنا چاچا بھی نہیں روک سکتا۔ ہم سلیم کی جنسی بھوک سے واقف تو تھے لیکن پیدل چل کر کہاں پہنچ سکتے اس لیے گھڑیاں گنتے رہے۔

شام ہوئی تو جیپ کا ہارن (Horn) یوں بج اُٹھا جیسے خطرے کا الارم۔ سلیم کمرے میں داخل ہوا اور فوری طور پر ہم تینوں کو جیپ میں بٹھا کر ہمیں جموں کے ایک امدادی کیمپ میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میرے پتاجی کو دس ہزار روپے بھی دے کر گیا۔ چند دن بعد ہمارے گاؤں سے آئے ایک شخص نے بتایا کہ جو شخص میری ماں سے شادی کرنا چاہتا تھا اور سلیم سے میرا سودا طے کر گیا تھا اُسی نے سلیم کو گولی ماردی۔ سلیم اُس شخص کی گولی کا نشانہ اس لیے بنا کیونکہ اُس نے جموں سے واپس آکر اُس کے ارادوں پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا تھا کہ ''کیا کوئی اپنی بیٹی جیسی لڑکی سے شادی کرتا ہے؟'' سلیم صاحب نے مجھے بیٹی اور میری ماں کو بہن سمجھ کر ایک نئی زندگی دی۔ وہ ہمارے مسیحا تھے جس نے جان دے کر ماں، بیٹی اور ہمارے خاندان کو عزّت کی زندگی دی۔ وہ نہ دہشت گرد تھے اور نہ ایک مخبر تھے۔ وہ ایک دیوتا تھے! یہ سن کر ڈاکٹر راگنی چیخ پڑی اور اخبار کو ایک جھنڈے کی طرح لہرا کر اپنے شوہر کو سلیم کی کہانی سنانے چلی گئی۔ دراصل سلیم بد نہیں بدنام تھا۔

OO

مجھے میری کشتی لوٹا دو

میں حیرت کی گہرائیوں میں ڈوب کر خود ایک سوال بن گیا ہوتا اگر میں اُس انسان کو بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے نہیں دیکھ لیتا جس کے ساتھ میں نے ساتھ والے کمرے میں کئی گھنٹے گزارے تھے! وہ دردناک آواز میں اپنی کشتی یوں مانگ رہا تھا جیسے ایک ضدی بچہ اپنا پسندیدہ کھلونا مانگ رہا ہو!

ہم میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔ آخر آ ہی گئی نا دل کی بات زبان پر! یہ جاسوس جذبات کی آڑ میں سرحد پار جانا چاہتا ہے! یہ کمہارن نہ سوہنی ہے اور نہ یہ مہیوال ہے! ایک شوہر ہے جو اپنی بیوی کے پاس جانا چاہتا ہے! اب گرفتار ہو چکا ہے اس لیے رشتوں کی باتیں کرتا ہے!

اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے دوست ڈاکٹر شرما کے کمرے میں وہ بحیثیت ایک فوجی کرنل ایک غیر سنجیدہ ماحول میں .L.O.C پر پکڑے گئے ایک جاسوس سے نہایت سنجیدہ تحقیق کر رہا ہے تو میں ہرگز کمرے میں داخل نہ ہوا ہوتا!

یہ میں نے تھوڑی دیر پہلے جان لیا ہے کہ میرے ساتھ بیٹھے سول ڈریس پہنے لوگ بھی آرمی کے آفیسر ہیں اور ڈاکٹر شانتی ایک کونے میں ایک مجرم کی طرح دُبک کر بیٹھی اپنے ہینڈی کیم سے تحقیق کی ویڈیو ریکارڈنگ کر رہی تھی۔

میری موجودگی کو بھی اس لیے برداشت کیا گیا تھا تاکہ جاسوس کو یہ شک نہ ہو کہ اُس کے ہر لفظ، ہر جملے اور ہر بات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ مجھ سے ہی مخاطب ہو کر باتیں کرتا رہتا تھا کیوں کہ میرے چہرے کے سوا کمرے میں موجود بھی چہرے اس کو بے صدا دریچے نظر آ رہے تھے۔

وہ اُس ندی کی باتیں کرتا تھا جس کے دو کناروں پر دو ملک ہیں۔ وہ بار بار اُس کشتی کا ذکر کرتا تھا جو لوگوں کو بھی آر پار لے جایا کرتی تھی لیکن اُس وقت جب میں کمرے میں داخل ہوا تھا

تب وہ ایک فلسفی کی طرح ڈاکٹر شرما کو کچھ بتا رہا تھا اور سمجھا رہا تھا۔ ''سنا ہے کہ ان وادیوں میں دُور دُور سے لوگ آ کر برفیلی بلند چوٹیوں پر پرستش کیا کرتے تھے! سر سبز درختوں کے نیچے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے! اب جب پربت ننگے ہیں اور درختوں سے گوند (Raisin) نکال کر ان کو کھوکھلا بنا دیا ہے تب جگت کے کلیان کے لیے اشرف المخلوقات تاثیر مسیحائی کیسے پہنچا پائے گا؟

گویا حکیم صاحب مریض کی نبض پر انگلیاں رکھ کر خود اپنے دل کے ڈوبنے کا منظر، دہشت گرد کی لال لال آنکھوں میں دیکھ رہے ہوں! سوچ لو کہ میں نے کیا کہا؟ کیوں کہا؟ اب سمجھ گئے کہ میں روتے روتے کیوں ہنس پڑا؟ اور اب ہنستے ہنستے اس لیے رو رہا ہوں کیونکہ میں سمجھ گیا ہوں کہ جنگ بھگوان اور شیطان کے درمیان ہو رہی ہے اور مر رہے ہیں انسان! بھگوان شیطان کو کیوں نہیں مار ڈالتا ہے؟ سارا قصور بھگوان کا ہے! اور نہیں تو کیا؟ ایک ہی صدی میں یونان میں ارسطو کو پیدا کیا، ہندوستان میں چانکیہ پیدا کیا اور چین میں کنفیوشیس پیدا کیا۔ انھوں نے کیا کیا۔ ارسطو نے سکندر اور چانکیہ نے چندر گپتا کو بنایا۔ کس لیے؟ خاقان بن جانے کے لیے انسان کا خون بہانے کی خاطر نا؟ کنفیوشیس نے تو اپنے پیروکاروں کو افیون کھلا کر کاہل بنا دیا۔ بھگوان نے ہٹلر مسولینی کو بنایا! کیوں؟ کیوں؟؟ اور ریڈ کلف کو ہندوستان کا بٹوارہ کرنے کے لیے پیدا کیا!''

میں حیران تھا کہ ڈاکٹر شرما جیسا دانشور فوجی ڈاکٹر اِن سنجیدہ باتوں کو غیر سنجیدگی سے کیوں سن رہا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ روکنے ٹوکنے کی بجائے وہ مشکوک آدمی سے نہ تو کوئی سوال کرتے تھے اور نہ اُس سے پوچھ رہے تھے کہ تم اُن سوالوں کا جواب دے رہے ہو جو میں نے پوچھے ہی نہیں۔ یہ مجھے تب معلوم ہوا جب شرما نے ایک جملہ اخبار کے ایک کونے پر لکھ کر میرے آگے رکھ دیا: ''سنتے جاؤ یہ جواب جو میں نے سوال پوچھ کر مانگے نہیں۔''

شکل وصورت سے یہ اجنبی ایک خوب رو ماڈل جیسا تھا مگر اُس نے اپنے ہاتھوں میں کوئی کولڈ ڈرنک کی بوتل کی بجائے بہت سارے جریدے اور اخبارات دبوچ کر یوں رکھ لیے تھے گویا وہ ہیرے موتی تھے۔ جبھی تو وہ گاہے گاہے خاموش ہو کر، عینک لگا کر ورق گردانی یوں کرتا رہتا تھا جیسے دیکھ رہا ہو کہ کوئی ہیرا یا موتی گفتگو کے دوران کسی نے چُرا تو نہیں لیا ہے۔

چونکہ میں ایک صحافی ہوں اس لیے بار ہا مجھے شک ہو رہا تھا کہ اس ذہین، پڑھے لکھے آدمی نے ڈاکٹر شرما کو متاثر کرنے کے لیے کچھ نوٹس (Notes) بنا کر جرائد میں چُھپا کر تو نہیں رکھ لیے ہیں۔ مگر جونہی وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ میں نے جھانک کر یہ تو جان لیا کہ وہ کچھ اور

نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہو رہی بات چیت کے بارے میں سرخیاں تھی!

شاید وہ میرے تجسس کو محسوس کر گیا تھا اور میری کیفیت بھی بھانپ گیا تھا اس لیے وہ بے ساختہ رو پڑا تھا۔ حالانکہ میں رو نہیں رہا تھا مگر وہ مجھے تسلیاں دے کر یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ میرے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ''رومت! آنکھیں اشک بار ہوں تو سب کچھ دھندلا دھندلا نظر آتا ہے! جبھی تو ہم دیکھ بھی نہیں پاتے کہ ہمیں کس نے رُلایا ہے! پاس پاس رہنے والے بھی دُور دُور نظر آتے ہیں۔ جیسے ہمارے گاؤں کے دو حصے ہمیں نظر آ رہے ہیں! آر اور پار! جب بھی درمیان میں بہہ رہی ندی یاد آ جاتی ہے تب وہ کشتی سامنے اُبھر کر یوں نظر آتی ہے جیسے بادلوں کو چیرتا ہوا ہلال! وہ کشتی ہمیشہ ندی کے اِس پار یا اُس پار نظر آیا کرتی تھی۔ کشتی چلانے والے چاچا کو گاؤں والے ملاّح یا کھیوٹ کہہ کر آواز دیا کرتے تھے اور پھر بل کھاتی لہراتی، موجوں سے ٹکراتی، سوہنی، کے مٹکے کی طرح دوسرے کنارے پر انتظار کر رہے مہیوال کی طرف جایا کرتی تھی۔

''یہ وہ کشتی نہیں تھی جس میں بیٹھ کر رام، سیتا اور لکشمن نے اپنی بن باس کی شروعات کی تھی۔ ارے بابا وہ نوح کی کرشماتی کشتی بھی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو سیاسی گردات اس کو نگل کیوں جاتا! تمھاری محبوبہ بھی اُس پار ہے کیا؟ ملنے کو دل چاہتا ہے کیا؟ کیا کریں اگر ہم چوہے ہوتے تو زمین دوز سرنگ بنا کر پار جاتے! ہم سانپ بھی تو نہیں ہیں جو کسی کے بل میں گھس کر پاتال میں اپنا راستہ بنا کر پار جاتے۔ ہاں اُڑ کر جا سکتے تھے اگر پرندے ہوتے! مگر؟! اگر باز نے دیکھ لیا تو!

''۱۹۷۱ء کی جنگ میں میں اور میری محبوبہ اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ ہاں بھئی ہاں اس کے بچے بھی اسکول میں پڑھ رہے ہوں گے (رادھا نے کرشن کے ساتھ شادی نہیں کی تھی) سوہنی نے مہیوال سے شادی تو نہیں کی تھی۔ یہ چاہت کی داستانیں ہیں!

''عشق میں رومانیت اور شدت کا احساسِ شناسائی بھی ہے! یہ وہ خواہش ہے جس کی آخری منزل شادی نہیں ہے۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں، وامق عذرا اور لیلیٰ مجنوں ایک دوسرے کے قُرب کے لیے تڑپتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے سے لپٹ کر ہم بستر ہونا ان کی زندگی کا مقصد نہیں تھا۔

''میرا اور اُس پار رہنے والی میری محبوبہ کا رشتہ ہے، بندھن نہیں! جیسے تان سین کا تانی سے رشتہ تھا۔ میرا کا کرشن سے تھا۔ ایک بار مجھے میری وہ کشتی لوٹا دو! میں پار جانا چاہتا ہوں!''

میں اُس کی باتیں سن کر لاشعوری طور پر اپنے سامنے پڑے اخبار کی ایک کشتی بنا تو گیا تھا مگر سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہے جو ایک بچے کی طرح کاغذ کی کشتی لے کر اس کمرے سے نکل گیا جہاں

بقول ڈاکٹر شرما اُس کی گرفتاری اور وہ بھی .L.O.C کے قریب اُس کے لیے ایک سنسنی خیز مسئلہ ہے۔ پھر جب ڈاکٹر شانتی نے ویڈیو ریکارڈنگ کمرے میں موجود افسروں کو دکھادی تب یقین ہو گیا کہ یہ جو شخص پیار، محبت یا چاہت کی باتیں کرتا رہا ایک جاسوس ہے اور اس بات پر ایک رائے تھی کہ یہ جاسوس کوئی اعلیٰ افسر ہوگا!

ڈاکٹر شرما کو اس بات کی خوشی تھی کہ اُس کا یہ شک کہ جاسوس پاگل نہیں ہے، صحیح نکلا۔

اچانک ایک سپاہی دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہو کر ڈاکٹر شرما سے کچھ ایسا کہہ گیا کہ وہ شخص کمرے میں موجود افسروں کے ساتھ ایک ایسے لاک اَپ میں چلا گیا جہاں مشکوک آدمی کشتی میں بیٹھ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک وہ چیخ پڑا اور پھر چلاّتا رہا۔ ''یہ وہ کشتی نہیں ہے جس میں میں ندی پار کر سکوں گا!'' میں جب کمرے میں داخل ہوا تب اُس نے مجھے کشتی کی ایک تصویر دکھا کر کہا ''پھر دھوکہ! بار بار دھوکہ! بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ! یہ خودکش دہشت گرد ہے۔''

میں نے کشتی کو ہاتھ میں اٹھا کر اخبار میں چھپی ایک تصویر دیکھی جو واقعی ایک خودکش حملے کی بھیانک تصویر تھی۔ ڈاکٹر شرما ایک بہت اچھا ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تجربہ کار کرنل بھی ہے۔ اس لیے اس نے فوراً کشتی کو جلا دیا۔ جلا ہوا اخبار جب فرش پر گر گیا تب مشکوک آدمی ہنس پڑا اور قہقہے لگاتے لگاتے اچانک ایک بچے کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے بڑبڑایا ''خود بھی مر گیا شیطان! اچھا ہوا! اگر میں نے اپنی جان کی بازی لگا کر اس کو کشتی سے نکال دیا ہوتا تو شاید کشتی بچ جاتی! اور آر پار آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اگر رسائی نہیں ہوگی تو شناسائی کیسے ہوگی۔ تاثیرِ مسیحائی لوگوں تک پہنچ کیسے پائے گی۔''

ہم لوگوں میں کوئی کچھ کہہ پاتا کہ دور کھڑا کینٹین والا قریب آ کر بول پڑا ''یہ اسی علاقے کا باشندہ ہے۔ بہت امیر ہے۔ شہر میں ایک عالی شان بنگلے میں رہتا ہے۔ داداناناہے اور غریب پرور ہے۔ سبک دوش ہونے سے پہلے افسرِ اعلیٰ تھا۔

''جب بھی کبھی ہندوستان اور پاکستان کی ممکنہ دوستی کی خبریں اخباروں میں آجاتیں اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ پچھلی بار ڈپٹی کمشنر چڑھا کر لے گیا تھا۔ اس کے گھر والے بھی جانتے ہیں کہ جب بھی وہ بڑبڑا کر یا چلا کر یہ کہنا شروع کر دے کہ 'مجھے میری کشتی لوٹا دو یہ ماضی کی تاریکیوں میں اپنا لڑکپن ڈھونڈتا رہتا ہے۔''

یہ سب جان کر میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں ہم مستقبل کی دُھند میں کھو نہ جائیں۔

OO

انجلی کی کہانی

ترنّم اُس انجلی کی باتیں تو نہیں کر رہی تھی جو رام بھگت ہنومان کی ماں تھی! بلکہ اُس انجلی کی باتیں بھی نہیں کر رہی تھی جو مہاتما بدھ سے پیار کرتی تھی! وہ جو بھی کہہ چکی تھی وہ اُس بد بخت انجلی کی ایک سچی کہانی ہے جو وہ اپنے جسم کو نوچنے والوں کو سنانا چاہتی تھی مگر وہ بے صبر ہو کر اس کو ایک گدھ کی طرح چونچ مار کر چلے جاتے تھے!

ترنّم کے ہر جملے میں شکتی ماں کے سوزیدہ نغمے کی دل کو چھو لینے والی آواز سنائی دیا کرتی تھی مگر لحہ بہ لحہ اس کا دماغ یوں اُبل پڑتا تھا کہ اُسے ترنّم کے بے حد خوبصورت چہرے کو بھاپ سے جلا کر مسخ کرنے کو جی چاہتا تھا تا کہ وہ ترنّم کے خلاف فلک شگاف نعرے لگانے والوں کے جوش کو ٹھنڈا کر کے وہ نیک کام کر پاتا جس کے لیے اُس کو ایک غیر سرکاری تنظیم نے، خاص طور پر ترنّم کو اُس کی بدکاری اور اُس کے معاشرے کو جنسی آلودگی سے پاک رکھے جانے کے لیے نہایت ادب واحترام کے ساتھ بطور ایک منصفہ بلایا گیا تھا، مگر وہ حیران تھی کہ جس عورت کو نعرے لگانے والے نوجوان اور بزرگ اسکول اور کالج کے لڑکے بھی اپنے جال میں پھنسانے کے چکر میں ان کو ہاتھ پکڑ کر اپنے کنجر خانے میں لے جانے کے سنگین الزامات لگا رہے تھے، وہ ترنّم کے شیریں لہجے میں سُنے جملے سن کر یوں خاموش ہو گئے تھے گویا ترنّم نے اُن سب کے کھلے منہ میں اُبلے ہوئے گرم آلو ڈال دیے تھے جو نہ ان کو کچھ بولنے دے رہے تھے اور نہ آلوؤں کو حلق کے نیچے اترنے دے رہے تھے۔ اس کشمکش میں وہ نظریں جھکا کر کھسک کر واپس کیوں لوٹ کر آئے تھے۔

کھچا کھچ بھرا ہال جب مکمل طور پر خالی ہو گیا تو منچ پر ترنّم اور شکتی ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اس لیے میڈیا والوں کی چکا چوند کرنے والی روشنیاں ان ہی دو عورتوں پر مرکوز ہیں، ہال خاموشی کی گہرائیوں میں ڈوب گیا ہے! دونوں ایک دوسرے کے سامنے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دوسرے کی کیفیت بھانپنے کی کوشش کر رہی ہیں اور میڈیا والے ان کی بات چیت کرانے کے

لیے بار بار اشارے دے رہے ہیں۔ مگر بے آواز ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔

شکتی ماں گیروی رنگ کے کپڑوں، گلے میں رودراکش کی مالا ڈال کر، اپنے لمبے اور چمکیلے بالوں کو کھلے چھوڑ کر اور ماتھے پر سیندور کی بجائے چندن کا تلک لگا کر ایک باوقار سنیاسن لگ رہی ہے جبکہ اپنے سر کو ڈھک کر ایک سفید پوشاک میں اپنے پُرکشش جسم کی بناوٹ، ایک پری چہرے پر پڑ رہے دو گڑھوں، چمکیلے دانتوں والی بغیر میک اپ کے گلابی ہونٹوں اور جھیل جیسی گہری آنکھوں اور چہرے پر ایک کمسن لڑکی کی معصومیت کیمرے کی آنکھ سے جھانکنے والی میڈیا ٹیم کے ہر فرد کو ترنم گویا جنت سے بادلوں کی سیڑھیوں سے اُتر کر، بادلوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر ایک پری خوش قسمتی سے ان کے کیمرے میں قید ہو گئی ہے۔

شکتی ماں کو وہ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی اونچے خاندان سے اپنا تعلق توڑ کر ہری دوار میں خود اپنا شرادھ کر کے رشتے ناطے توڑ کر، دنیاداری سے منہ موڑ کر سنیاسن بن گئی ہے۔ وہ اپنے آشرم میں پوجا پاٹھ کرتی رہتی ہے یا پھر دھارمک (اساطیری) کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی ہے، ہاں مگر، اگر عورتوں کی عزت و آبرو کا تحفظ کرنے والی تنظیم والے اُس کو بطور ایک مہمانِ خصوصی بلاتے ہیں تو وہ کبھی انکار نہیں کرتی ہے۔ لیکن ایک مخصوص انداز میں۔ یعنی اُس کی آمد پر اُس کی جے جے کار ہونا لازمی ہے۔ میڈیا کی کوریج (Coverage) بھی ہونی چاہیے۔ منچ پر اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہونا چاہیے۔ پھر وہ اپنے معمول کے مطابق چند بھجن سناتی ہے اس کے بعد کوئی سبق آموز کتھا سنا کر مسئلے مسائل پر غور کرتی ہے، کوئی سنجیدہ معاملہ ہو تو کسی کی وکالت، وضاحت، تجاویز، مفاہمت، کسی کی پکار، فریاد وغیرہ کے پس منظر میں وہ آنکھیں یوں بند کرتی ہے گویا جیوری (Jury) کی بجائے فیصلہ سنانے سے پہلے بھگوان سے منظوری لیتی ہو مگر آج ان کی ضروریات پوری نہیں ہوئی تھیں۔ آمد پر جے جے کار نہیں ہوئی تھی کیونکہ ہال کے اندر جسم فروش عورت ترنم کے خلاف اشتعال بلکہ اخلاق سے گرے ہوئے نعرے گونج رہے تھے۔

شکتی ماں کو دوسرا جھٹکا تب لگا جب اس کے ہال میں داخلے کے وقت میڈیا والوں کی چکا چوندھ کرنے والی روشنیاں اس کے چہرے کی بجائے نعرے لگانے والوں پر مرکوز تھیں۔ مشکل سے منتظمین نے شکتی ماں کو منچ پر لے جا کر جوں ہی مائک اُس کے سامنے رکھی، ترنم نے منچ پر جاتے ہی مائک اپنے سامنے رکھ کر بولنا شروع کر دیا تھا۔ ترنم کی آواز میں روانی تھی، گویا وہ نعرے لگانے والوں کو اپنی آواز سرگوشیوں میں سنا رہی تھی جو اُن کی خاموشی کی وجہ سے ان کے آگے پیچھے،

دائیں بائیں کھڑے لوگوں کو بھی سنائی دے رہی تھی۔ کچھ لوگوں کو سائرن کی طرح اور کچھ لوگوں کو مندر کی گھنٹیوں کی طرح۔ شکتی ماں سمجھ گئی تھی کہ یہی وہ عورت ہے۔ جو جسم فروشی کا دھند کرتی ہے اور یوں ایک بازاری عورت ہی ایک سنیاسن کی قدر نہ کر کے اُس کے سامنے سے مائک چھین سکتی تھی۔ سریلی رس بھری آواز میں سہی ترنم جو بھی کہہ چکی تھی وہ شرم وحیا کی اونچی فصیلوں کو پھاند کر کہہ رہی تھی۔

''مجھے میرے سنہری بالوں سے گھسیٹ کر ایک خارش زدہ کتے کی طرح شہر کے حدود سے باہر پھینک کر، میری لس سے بچاؤ کرنے والو! مجھے میرے گالوں میں میرے شیطانی گڑھوں میں زنگ آلودہ کیل ٹھونک کر میرے چہرے کو داغی کر کے میری طلسمی خوبصورتی کو ڈراؤنی بنانے والو! میرے جسم کو کالک لگا کر ایک جونک کی طرح مجھ سے لپٹ کر میرا خون چوسنے والو! میری جسم فروشی کا حشر دکھانے والو، میں نے اپنا دروازہ بند کیا تو بھڑک اُٹھے۔ روز میں تم سے کہتی رہی کہ میں بیس سال کی ماڈل یا کال گرل نہیں ہوں بلکہ چالیس سال کی ایک عورت ہوں جس کا جسم اور چہرہ اُس کے دو پیدائشی دشمن ہیں۔ اپنی اصلی عمر بتاتی رہی، ہر کالج کے لڑکے کو یہ احساس دلانے کی خاطر کہ اُس کو مجھ میں اپنی ماں کے عکس نظر آ جائے اور ہوش میں آ کر وہ اُس دس سال کی بچی کو ورغلا کر میرے گھر کو کھنڈر سمجھ کر لایا تھا۔ میں نے روکا تو اُس نے خرگوش کو چھوڑ کر بکری کو اپنی مردانہ قوت سے دبوچ ڈالا۔''

''پھر ایک بزرگ کی گود میں ایک بچی کو دیکھا جو بزرگ کی بے ہودہ حرکتوں سے بے خبر چاکلیٹ کھا رہی تھی۔ میں نے روکا ٹوکا تو وہ بوڑھا بھیڑیا مجھ پر فدا ہو کر میرے گھر میں گھس آیا—— اور پھر باقاعدگی سے آتا رہا۔ میں نے اس کو یہ سمجھانے کی خاطر کہ بچی اس کی پڑپوتی یا پڑنواسی کی عمر کی ہے پھر بھی وہ اُس بچی کو میرے سے لپٹنے کا انٹری کارڈ (Entry Card) بناتا رہا۔ چند روز پہلے میں نے اخبار میں ایک دردناک خبر پڑھی تو مجھے انجلی کی کہانی یاد آئی۔''

''انجلی کے پاپا ایک فوجی افسر تھے اور اُس کی بیوی ایک کتھک ڈانسر تھی۔ انجلی کو ممی کے رقص میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر اپنے پاپا کے ساتھ لیٹ کر ان کے گیت سنتے سنتے سو جانے کی ویسی ہی عادت پڑ گئی تھی جیسے عام طور پر بچوں کو ماں کے سینے پر ہاتھ رکھ کر یا انگوٹھا چوستے چوستے سو جانے کی عادت ان کا ایک عیب بن جاتا ہے تو بڑھتی عمر میں بھی چھوٹ جانے کا نام نہیں لیتا، بدبخت انجلی بھی ایک عیب کی شکار ہو گئی تھی جس کا خمیازہ اُس کو بھگتنا پڑا۔''

انجلی کے پاپا سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے جب شہید ہو گئے تھے تب وہ پانچ سال کی

تھی۔ پاپانے چونکہ اپنی مرضی سے شادی کی تھی اس لیے انجلی کی ماں اپنے رشتے داروں سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ انجلی جب بھی کسی لمبے چوڑے گورے اور خود رو آدمی کو دیکھتی تھی تو اُس میں اپنے باپ کا عکس دیکھ کر اُس کے ساتھ لپٹ جاتی تھی اور سو جاتی تھی۔"

"انجلی کی ماں کو فقط اپنی بیٹی کی خاطر اشتہاروں کے ذریعے ایک ایسے آدمی سے شادی کرنی پڑی جو پیشے سے ہیرے جواہرات کا تاجر تھا، بہت امیر تھا مگر عمر میں انجلی کی ماں سے پندرہ سال بڑا تھا۔ اس کی طلاق شدہ بیوی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ نیویارک میں رہتی تھی جبکہ دوسرا بیٹا ہوسٹل میں رہتا تھا۔"

"انجلی کی عمر تب بارہ سال تھی اور اُس کا سوتیلا بھائی اُس سے چھ سال بڑا تھا۔ گھر میں ماں اور ایک پیاری سی چھوٹی بہن آئی تو وہ ہوسٹل چھوڑ کر گھر آ گیا۔ مگر باپ کو بھائی بہن کے اس پیار سے نفرت ہونے لگی کیونکہ اُس کا بیٹا اپنی بہن کو اپنے باپ کی پسند کے مغربی طرز کی پوشاکیں پہننے سے روکا کرتا تھا۔ سوتیلے بھائی کو ہوسٹل جانا پڑا تو انجلی کے لیے سوتیلے باپ نے ایک مستقل فیشن ڈیزائنر اور میک اپ کرنے والا رکھا اور باپ فخر سے انجلی کو مس ورلڈ بنانے کے خواب دکھاتا رہا اور اُس کو نیم عریاں لباس پہنا کر کیٹ واک (Catwalk) کراتا تھا۔ بیوی کو اُس نے شراب پینے کی لت لگا دی تھی اس لیے انجلی اپنے باپ کے ساتھ لپٹ کر سویا کرتی تھی۔"

"روز صبح سویرے جب ماں بیٹی دونوں کا سر بھاری بھاری رہنے لگا تب ماں سمجھ گئی کہ اس کی تیرہ سال کی بیٹی ایک عورت بن گئی ہے۔ گویا ہیرے جواہرات کے تاجر کی منجھی ہوئی چنگی سے نکلا تیر ماں کے قلب میں جا کر جان لیوا ثابت ہوا۔"

"ایک بھیڑیے کے غار سے نکل کر انجلی اپنے ماما کے گھر گئی اور وہاں وہ ایک نیا جنم لے کر ایک سیدھی سادی لڑکی کی طرح رہنے لگی۔ ماما کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی کمرے میں اپنے سے چار سال بڑے ماموں زاد بھائی کے ساتھ رہنا پڑا۔ کہتے ہیں قدرت کے کچھ قوانین ہوتے ہیں جو کہیں لکھے نہیں گئے ہیں مگر عمل میں خود بخود آ جاتے ہیں۔ انجلی بھائی کی کلائی پر راکھی باندھنے گئی تو اُس نے انجلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انجلی سولہ سال کی تھی جب اس کے ماما نے اُس کا چھ مہینے کا حمل گروا کر جلد بازی میں ایک ذہنی مریض کے ساتھ شادی کرا دی۔ اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی انجلی کی شادی کے نام پر بربادی کی شروعات تھی۔ نہ دلہن کے ہاتھوں پر مہندی لگی اور نہ شہنائیاں بجیں، بس ایک رسمی پوجا کے بعد دلہن اُس دولہے کے کمرے میں بٹھا دی گئی جو اپنی ماں

کے ساتھ ایک بچے کی طرح سویا پڑا تھا، گویا جس غنچے کو ایک شاخ سے جدا کرنے کی بجائے موڑ کر اَدھ مرا چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ سیدھا کرنے سے کھل تو گیا تھا مگر اُس کو کاٹ کر نہ کسی نے گلدان میں سجاوٹ کے لیے رکھا اور نہ کسی نے رنگ اور خوشبو کی قدر کی۔ ہاں اُسے مسل ضرور دیا۔ تازگی چھین کر۔ انجلی کو اُس کے سوتیلے باپ نے کِھلنے سے پہلے گویا آگ میں جھلس دیا تھا۔ پھر بھی عمر کے تقاضے پورے ہوئے تو انجلی اپنے جسم میں تبدیلیاں محسوس کرتی رہی۔ خاص طور پر جب وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھا کرتی تھی تب خود بھی اپنے حسن پر فدا ہو جایا کرتی تھی اور پھر عام دیہاتی پوشاک میں بھی اُس کے جسم اور پری چہرے پر اڑوس پڑوس کے نوجوانوں کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ گاؤں کے میلے میں وہ یہ بھول گئی کہ وہ ایک اونچی سوسائٹی سے کئی سال پہلے کٹ چکی ہے، چند دل پھینک نوجوانوں کے ساتھ بے باک ہو کر ناچنا اُس کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ وہ اجتماعی عصمت دری کی شکار بن گئی۔"

"اپنے باپ جیسے سسر کے سینے سے چمٹ کر اُس نے حالِ دل سنایا تو وہ رات بھر اُس کے ساتھ ہی رہا اور تسلی دیتا رہا۔ مگر نہ جانے کب اور کیسے ایک نیک دل انسان میں وہ شیطان گھس گیا جو ایک سنگین رات کے بعد اُجلی سحر دکھانے کے وعدے کرنے والا اُس کو دن بھر کی تاریکیوں میں دھکیل گیا تھا۔"

"پھر روز روز اُجالوں میں بھی تاریک زندگی دیکھ کر وہ گاؤں سے فرار ہو کر شمشان میں جل رہی ایک چتا میں کود گئی مگر دور دھونی (Bonfire) کے سامنے بیٹھے ایک سادھو نے انجلی کو بچا لیا۔ چہرہ اور جسم جھلس گئے اور سنہرے بال بھی جل کر ایک ربڑ کے جلے ٹائر کی طرح بدبودار بن گئے۔ سر منڈوا کر سادھو کی گہری باتیں سن کر وہ سطحی طور پر یہ سمجھ گئی کہ چندن کی لکڑی ہون کنڈ میں جل کر راکھ ہو جائے تو وہ بھبھوتی (Sacred ash) کہلاتی ہے جو سادھو سنت متبرک سمجھ کر اپنے بدن پر لگاتے ہیں مگر وہی چندن کی لکڑی جب چتا میں جلائی جاتی ہے تب راکھ دریا میں ڈالی جاتی ہے۔ بابا نے اُس کو دھرم اور کرم کی باتیں سمجھا کر اپنے آپ کو راکھ میں تبدیل کرنے کی بجائے بے لوث خدمت کرنے کا مشورہ دے کر ایک مندر میں روز صفائی کرنے کا کام دلایا جب تک اُس کے چہرے پر جھلسنے کے داغ تھے اور سر پر اَدھ جلے بال تھے مندر میں آنے جانے والے بھگت اس کو قریب سے گزرنے بھی نہیں دیتے تھے۔ گویا وہ ایک کوڑھ کی مریضہ تھی لیکن جب چہرے کے داغ مٹ گئے اور اس کے سنہرے بال ہوا کے جھونکوں سے بے قابو ہو کر لہرانے لگے تب دیوی

دیوتاؤں کے درشن کرنے دُور دُور سے آئے بھگت ایک بے حد خوبصورت جسم، ایک پری چہرے میں پڑ رہے دو پُرکشش گڑھوں کو یوں دیکھتے جیسے شکاری اپنے شکار کو دیکھنے کے لیے تاک میں بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر چند دل پھینک جنس زدہ نوجوانوں نے اُس کو ندی پر نہاتے ہوئے دیکھا تو وہ اُس پر ہمدردی کے کانٹے پھینک کر ایک بے سہارا لڑکی کو ایک اَن دیکھی آگ میں جلاتے رہے۔ ایک گیلی لکڑی کی طرح یعنی نہ بجھنے دیتے تھے اور نہ جل کر راکھ ہونے دیتے تھے۔ پھر انجلی اپنے آپ سے گھبرا کر بابا کے پاس مدد کے لیے گئی۔ اُس نے دھرم کرم کا حوالہ دے کر ایک مسیحا کی آمد کا یقین دلایا۔"

"بابا کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ امریکہ سے آیا ہوا ایک نوجوان اپنے بورڈنگ اسکول کے چند دوستوں کے ساتھ موج مستی کے ارادے سے گھنے جنگل کے درمیان واقع اس صدیوں پرانے مندر کے پاس طے شدہ منصوبے کے تحت انجلی کے ساتھ موج مستی کرنے آیا تھا مگر انجلی کی بناوٹی خوشیوں کے پیچھے ایک لڑکی کے ارمانوں کی چتا دیکھ کر جب وہ انجلی کو اپنے ساتھ لے گیا تو مندر میں افواہیں پھیل گئیں کہ انجلی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ جو انجلی کو اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا تھا اور بعد میں ہوائی جہاز میں کسی نامعلوم جگہ لے گیا۔ وہ ایک شہید کرنل کا بیٹا تھا اور وہ انجلی کو اپنے آبائی گھر میں لے گیا۔ ایک بہت بڑے مکان کی نگران بنا کر اُس نے ایک سرحد کے نگہبان کی بیٹی کی عزت و آبرو کی حفاظت کا پورا انتظام اور مرحوم یادوں مثلاً ان کی کتابوں اور سنگیت کی لائبریری کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک معقول رقم بینک میں جمع کرنے کے بعد مسیحا وداع ہوا۔ گھر کو گرد و غبار نے کھنڈر بنا دیا تھا اور باغ میں گھاس اتنی اونچی تھی کہ گلاب کے پھول پر گرہن لگ گیا تھا۔"

"انجلی نے گھر سنوارا تو اپنا بچپن یاد آیا۔ ایسا ہی گھر تھا اُن کا۔ خوب محنت کر کے جب کھنڈر گھر بن گیا تو پھاٹک کھول کر ٹوٹے پھوٹے گیراج کے اندر نوجوانوں کا اپنی معشوقاؤں یا گھر کی نوکرانیوں بلکہ ورغلا کر لائی ہوئی معصوم لڑکیوں کی آبرو تار تار کرنے کی ایسی جگہ بن گئی جہاں آوازیں تو کیا چیخیں بھی سننے والا کوئی بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ انجلی کو ایک ایسی جگہ اپنی زندگی کے دس سال گزارنے پڑے تھے۔ اُس کی وہاں موجودگی کی وجہ سے پھاٹک بند رہا کرتا تھا اس لیے آوارہ مویشی یا کتے بھی احاطے کے اندر نہیں آ پاتے تھے۔ مگر ایک روز وہ معمول کی طرح آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی اور اپنے جسم اور چہرے پر رشک کر رہی تھی یعنی نرگسیت کا شکار ہو رہی تھی تب تیس سال کی عمر میں اُس کے تن اور من میں ایک سولہ سال کی کنواری لڑکی کی طرح عشق محبت اور

جسمانی ضرورتوں کا شدت سے احساس ہوا مگر پھر اُس عمر میں ہوئی جنسی اذیتوں کے جسمانی درد اور ذہنی کرب کی یاد آتے ہی وہ چیخ پڑی تھی جس کو سن کر پڑوسیوں کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ ایک بہت بڑے مکان کے اندر تنہا رہنے والی اور تنہائی پسند عورت یا تو پاگل ہے یا پھر ڈائن، اس لیے وہ اُس کی پہل کے باوجود اُس کے ساتھ میل جول بڑھانے میں کتراتے تھے مگر ان لڑکوں، نوجوانوں اور درمیانی عمر بلکہ بوڑھوں نے اس کو بہت قریب سے دیکھا اور جانا تھا، ان کے لیے وہ ایک ایسی دکان ہے جو لین دین کے بغیر صرف پہلی بار زبردستی من چاہی چیز حاصل کر کے بعد میں دکان کو لوٹ کر لے جانے کی ہمت اور جرأت سے جانے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس بدبختی کی شروعات تب ہوئی تھی جب اس نے ایک بچی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز کے بعد اپنے گیرج سے اُس بچی کی چیخ سن لی تھی۔ اندر گھس کر اس نے ایک بھیانک منظر دیکھا تھا۔ تقریباً ساٹھ سال کے بڑے میاں ایک چار سال کی لڑکی کے منہ میں چاکلیٹ رکھ کر اس کے ساتھ وحشیانہ حرکتیں کر کے اپنی جنسی خواہشات کو پوری کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انجلی نے بچی کو تو بچا لیا تھا مگر تب جب خونخوار درندے نے اپنی بھوک مٹانے کی خاطر اُس کو دبوچ لیا تھا۔ اُس روز انجلی نے بہت آنسو بہائے تھے مگر اپنے چکنا چور ہوئے دل کو تسلی دے کر جوڑ لیا تھا کہ اُس نے ایک بچی کی آبرو بچانے کی خاطر اپنی آہوتی دی ہے۔ پھر ایک دن گھر میں بارہ سال کی کام کرنے والی لڑکی کو سولہ سال کے ایک لڑکے کے چنگل سے آزاد کرنے میں کامیاب ہوئی تھی مگر خود اس کی ہوس کی جوالامکھی کی شکار ہو کر اور یوں انجلی اپنی آہوتی دے کر غنچوں کو، اَدھ کھلے پھولوں کو، بلکہ شاداب رنگ برنگی پھولوں کی خوشبو اور رنگت بچانے کی خاطر قربان ہوئی تھی۔"

"میں سب زخم دینے والوں کے احساسات کی آگ کو بجھانے کی خاطر انجلی کی بدبختی کی کہانی سنانا چاہتی تھی مگر کوئی اس کی کہانی سننا ہی نہیں چاہتا تھا بلکہ انجلی کا نام سنتے ہی وہ جنسی بھوک کے جنون کا مظاہرہ کرتے تھے۔"

"تنگ آ کر میں نے اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے اور شرط رکھ دی کہ وہ پہلے انجلی کی کہانی سن کر یہ تو سمجھ لیں کہ شکار شکاری کی پڑپوتی، بیٹی، بہن یا ماں ہو سکتی ہے تو میں قابلِ تعریف عورت سے ایک طوائف بن گئی۔" یہ کہہ کر ترنم خاموش ہو گئی کیونکہ ہال خالی تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی، مگر شکتی ماں کے چہرے کے تاثرات اور جسمانی حرکات دیکھ کر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ترنّم کا بولا ہوا جملہ اُس کے ذہن میں بادلوں کی گرج کی طرح گونج رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جوالامکھی نظر

آ رہی تھی۔''

ترنم نے مائک شکتی ماں کے سامنے رکھ دیا تو چند لمحات کے لیے وہ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتی رہیں جبکہ میڈیا والے باری باری ترنم کو دیکھ کر ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے۔ ''عورتیں اپنی عمر بتاتی نہیں اور اگر بتا بھی دیتی ہیں تو اصلی عمر سے بہت کم۔ یہ عورت بیس سال کی ہوگی۔ شرط لگانا چاہو تو میں تیار ہوں۔ چہرہ فوٹو جینک اور جسم سیکسی۔ ایک ریڈی میڈ ماڈل، مگر داغدار! بدہوئی مگر بدنام نہیں۔''

ترنم خاموشی سے شکتی ماں کو دیکھ کر جونہی منچ سے اُتر کر ہال کے باہر جانے کے لیے بوجھل قدموں سے چند قدم چل پڑی تو شکتی ماں کی آواز سے اس کے قدم تھم گئے۔

''سفید پوشاک پہن کر کوئی جسم فروش عورت جوگن بن جانے کا ڈھونگ نہیں رچا سکتی۔ تم فریبی ہو۔ دھرم کو چالاکی سے کرم قبول نہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتی کہ سنیاس لینے والا یا لینے والی خود اپنا شرادھ کر کے اپنے ماضی کو بھول کر کسی کو اپنے بارے میں، خاص طور پر اس کے ماضی کے بارے میں کسی کے منہ سے کچھ بھی سننا نہیں چاہتی ہے۔ پھر تم نے؟ یہ ایک جرم نہ سہی ایک گناہِ عظیم ہے، جس کی سزا تمھیں ملے گی۔ اور وہ پتھر کی لکیر میں کھینچوں گی۔ ایک سنیاسن جس کے ماضی کے بارے میں کہہ کر تم نے اپنا بچاؤ کرنا چاہا —— رعایت مل سکتی ہے اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ میرے ماضی کے بارے میں تمھیں کس نے اطلاعات دی ہیں؟ اور کیوں دی ہیں۔''

میڈیا والے اشاروں سے شکتی ماں کو اونچی آواز میں بولنے کی درخواست کر رہے تھے مگر شکتی ماں آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی کرید کرید کر ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی ''انجلی کے بارے میں کس نے تمھیں یہ سب بتایا ہے؟'' ترنم شکتی ماں کو بس دیکھتی رہی۔ ملتجی نگاہوں سے جبکہ وہ جواب کی منتظر تھی۔ ''ترنم! تم ایک بازاری عورت ہو؟ کون آیا تھا تمھارے پاس؟ انجلی کی کہانی بتانے؟'' شکتی ماں گویا ایک کانٹے دار تار سے کریدنے لگی تو ترنم حلیمی سے بول پڑی۔

''جن کو میں اپنی کہانی سنانا چاہتی تھی وہ سب مجھے دیکھتے ہی ہال چھوڑ کر چلے گئے۔ انجلی میرا نام ہے۔ وہ نام جو مجھے میرے پاپا نے دیا تھا۔ انجلی کو ترنم کا نام اُن ہی لوگوں نے دیا ہے۔ منسوب جن سے میری جسم فروشی ہوئی۔ نعرے لگانے والوں، میرے جسم کو چاہنے والوں کی رسوائی تو نہیں ہوئی البتہ ایک ڈراؤنی خاموشی ہوئی۔ اچھا ہوا جو آپ نے گیلے چندن کی طرح جل رہی بدبخت انجلی کی کہانی سن تو لی۔ مگر دو آنسو بہا دینے کی بجائے آنکھوں میں لالی کیوں؟ کیا آپ کا نام بھی

انجلی ہے؟ کیا ہماری داستانیں ایک جیسی ہیں؟''

شکتی ماں کے چہرے پر اچانک روحانی نور نمودار ہوا اور وہ انجلی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پلٹ کر میڈیا والوں سے مخاطب ہو کر اونچی آواز میں بول پڑی۔

''ترنم جیسی عورتوں کو یا لڑکیوں کو سمجھانے کے علاوہ ایک سنیاسن اور کیا کر سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر شکتی ماں تیز گامی کے ساتھ ہال کے باہر گئی اور میڈیا کی روشنیاں اس کا پیچھا کرتی رہیں، ہال میں اندھیرا ہے اور ہال کے باہر اُجالا۔ ہال میں خاموشی ہے اور باہر خوشی کو ظاہر کرنے والا شور۔ اور شکتی ماں کی جے جے کار کے نعرے! ترنم کی آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی ہیں گویا دہلیز پر بیٹھی وہ ان کا انتظار کر رہی ہے جو انجلی کی کہانی میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ مگر انجلی کو سرد ہوا کے جھونکے کی طرح ایک گیت دل کو چھو کر بار بار گزر گیا، یہ گیت اس کے پاپا اس کو سنایا کرتے تھے:

دو سکھیاں بچپن کی
ایک تو اپنے رُوپ کے کارن رُوپ متی کہلائے
دوجی اپنے رُوپ کے کارن گلیوں میں بک جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی کس کو دوش لگائے!

OO

اُس کی کہانی

اُس کی کہانی دن کے اُجالوں میں بھی راتوں کی سیاہی ثابت ہوتی ہے! مگر اُس کی واپسی کو اُس کے کروڑوں مداحوں نے نہ صرف خیر مقدم کیا ہے بلکہ اُس کو رنگ برنگے رُوپ میں دیکھنے کے لیے یوں بے قراری سے انتظار کرنے لگے گویا اپنی ست رنگی ماڈل اُن کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے رہنے کے لیے آرہی تھی۔ اشتہاری فوٹو سیشن (Photo Session) یا فلمیں بنانے والے اُس کے لمبے سنہری بال، گلابی گال، آنکھوں کے شرابی رنگ، خوبصورت لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹوں اور مرمریں جسم کی سحر انگیز بناوٹ کی نمائش کے ساتھ صابن، تیل، شیمپو، کریم، پاوڈر، نئے ڈیزائن کے کپڑے، زیورات کے علاوہ انمول ہیروں کو اُس کی ذاتی پسند ظاہر کر کے اس کے مداحوں سے اس کو اپنا ایمبسڈر (Ambassdor) بنا کر کروڑوں کی تجارت کرتے رہتے ہیں۔ یعنی اُس ماڈل میں جس کی ایک سفید کرن میں ان کو سات رنگ نظر آتے ہیں، انھوں نے اس کو ست رنگی کے لقب سے نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نیم عریاں سینے پر اگر کانچ کے ٹکڑے بھی رکھ دیے جاتے ہیں اُس کے مدّاحوں کو ہیرے جواہرات نظر آیا کرتے ہیں اور اس کے ایک فوٹو سیشن کے لیے لاکھوں روپے اس حسن کی ملکہ کو دے کر کروڑوں کی تجارت کرتے ہیں۔

ہاں کچھ لوگ ہیں جو اُس کو معاشرے کے لیے شیطانی آلودگی کا نام دے کر اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اُس کی عریاں تصویروں کو سڑکوں پر جلا ڈالنے کے عادی ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں جن میں اس کے کروڑپتی باپ کے علاوہ وہ خود بھی ہے۔

اُس کی کہانی سفید اور سیاہ ہونے کے سبب اُس سے کبھی چھپی نہیں رہی ہے!

اُس کا کروڑپتی باپ اپنی اکلوتی جانشین کو لندن کے اقتصادیات کے اسکول (London School of Economics) بھیج کر ایک بزنس وومین بنانا چاہتا تھا جبکہ ایک ڈاکٹر بن جانے اور ساتھ میں کتھک ناچ سیکھنے کی آرزوؤں کو اپنے دل میں چھپا کر وہ اپنی ہی حسرتوں سے ڈر کر گھٹن محسوس کیا کرتی تھی۔

پہلا دھچکا اُس روز لگا تھا جب اس کو کتھک سیکھنے سے روکا گیا تھا۔ دراصل ساٹھ سال کے باپ کی سولہ سال کی بیٹی کھانے کے ٹیبل پر کتھک سکھانے والے بیس برس کے ٹیچر بھاسکر کی خودداری اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے کے باوجود کسی کا احسان لینے سے گریز کرنے کی باتیں کر کے اپنے باپ کو یہ احساس دلاتی رہتی تھی کہ دولت ہی زندگی کی خوشیوں سے مالا مال نہیں کر سکتی ہے۔ پھر جب باپ کی کھوجی آنکھوں نے بیٹی کو اسٹڈی ٹیبل (Study table) پر اپنی کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے بھاسکر کی آمد کے انتظار میں اُس کی بے قراری کی شدت بھانپ کر، اُن کی رقص کی مشق سے پہلے دونوں کی گفتگو سن کر، بیٹی کو رقص سے تو کیا فنونِ لطیفہ سے دُور رکھا تھا تا کہ وہ اپنے دل میں چور کی طرح بیٹھے شک سے خوف زدہ ہونے کی بجائے اُس کو ہمیشہ کے لیے دل اور دماغ سے نکال دے۔

اُس کی کہانی 'شک' کے اِرد گرد گھوم کر ایک گرداب کی طرف جانے لگی تب وہ شاید ایک کاٹھ کے ٹکڑے کی طرح اپنے آپ کو پانی کی گہرائیوں کے حوالے کر دیتی مگر گود میں ایک بچہ لے کر انجان راستوں پر چل کر ایک ایسے جنگل میں پہنچ گئی تھی جہاں جانور تو تھے نہیں مگر ایسے انسان تھے جن کو نہ شناسا چہروں کی فکر تھی اور نہ اجنبی لوگوں کی آمد کا احساس تھا۔ بلکہ پوچھ تاچھ کرنے کا تجسس بھی نہیں تھا۔ ہاں وہاں ایک مہاتما جیسے انسان تھے جو پوچھ تاچھ کرنے کے ساتھ ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ باقی لوگ مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان سب گویا سوامی جی کے اشاروں پر روبوٹ کی طرح کھاتے پیتے اور پوجا پاٹھ کیا کرتے تھے۔ نہ کسی کو کوئی خواہش تھی اور نہ کسی کو حسرتوں کا دباؤ تھا۔ نہ غم نہ خوشی، نہ پچھلے جنم نہ اگلے جنم میں اپنے کرموں کا پھل بھوگنے کا ردِ عمل اور نہ اگلے جنم میں اس جنم میں کی گئی نیکی یا بدی کی سزا یا جزا۔ یہ سوچ کر کہ وہ خود اس ماحول میں راحت تو پالے گی کیونکہ گمنام رہنا ہی اس کے سفر کی منزل تھی مگر اُس کے بیٹے کا مستقبل اگر روبوٹ بن جاتا ہے تو ماں کا فرض پورا تو نہیں ہو پائے گا؟ یہی سوچ کر اُس نے اپنے بیتے ہوئے کل کی کہانی سنا دی تھی۔ ایک کروڑ پتی کی تین بیویاں بے اولاد مر گئی تھیں تو اُس نے دُور دراز پہاڑی علاقے میں ایک بے حد خوبصورت لڑکی سے تب شادی کی تھی جب اُس کی عمر چالیس برس سے زیادہ تھی۔ اس لیے ایک ہی اولاد نصیب ہوئی۔ میاں بیوی بہت خوش تھے پھر جب ان کی بے حد خوبصورت بیٹی 'کلپنا' صرف دس برس کی تھی تب باپ نے بیٹی کو ایک اعلیٰ سطح کے فینسی ڈریس مقابلے میں سفید پری بنانے کے لیے ملک کے مشہور ڈریس ڈیزائنر (Dress designer) سے

پوشاک بنوائی تھی۔ سفید پوشاک پر اصلی موتی جڑے ہوئے تھے۔ اُس کا میک اَپ ممبئی سے منگوائے گئے فلمی دنیا کے ایک میک اپ مین نے کیا تھا اس لیے پہلا انعام لینے والی اس ننھی پری پر عشائیہ پارٹی میں ناظرین کی نظریں یوں جمی رہی تھیں گویا وہ ایک عجوبہ دیکھ رہے تھے۔ ہر نظر ایک پرزم (Prism) بن کر ایک سفید رنگ میں سات رنگ دیکھ رہی تھی۔ ہر طرف سے تعریفیں ہو رہی تھیں گویا پھولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ پھر شراب کے دور چلے تھے۔ ایک فلسفی نے کہا تھا کہ کون کہتا ہے کہ سورج کی سفید روشنی میں سات رنگوں کو دیکھنے کے لیے اندر دھنش کو دیکھنا پڑتا ہے۔ کلپنا بیٹی کو غور سے دیکھ لو، ارے کلپنا کیوں؟ اس کا نام ست رنگی یا اِندرا ہونا چاہیے تھا۔ باپ خوش تھا لیکن ایک کونے میں باتیں کر رہے دو سرمایہ داروں کی باتیں سن کر چونک پڑا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے "یار نیمبو کے پیڑ پر سیب کیسے اُگ آیا ہے۔ یہ پھل نئی بیوی جہیز میں لائی ہوگی۔"

پھر اُس گفتگو نے ایک ذہین کروڑپتی کے ذہن میں شک کا بیج بو دیا تھا اور تب وہ بیج زمین کو چیر کر ایک کانٹے دار درخت بن چکا تھا۔ جب باپ نے بیٹی کے ڈانس ٹیچر کو دھکے مار کر بھگا دیا تھا۔ اور وہی ٹیچر بھاسکر تھا۔ پھر بیٹی نے اپنے باپ کو اچانک حیران کر کے خوشی دینے کی خاطر ایک ماڈلنگ کی سی ڈی دکھا دی تو ماں نے ناراضگی کا اظہار کیا مگر باپ خوشی سے اُچھل پڑا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے دوستوں کو بتاتا، شک کے کانٹے خاردار تار بن کر دل و دماغ دونوں کو چھلنی کرنے لگے تھے۔ کلپنا نے اپنی ماں کو قصوروار ثابت کر کے اُس کے ساتھ خوب جھگڑا کر کے اپنے باپ سے حوصلہ افزائی کے لیے چمٹ کر اپنے والہانہ پیار کا اظہار کیا تھا۔

یوں اکثر ہوتا رہا۔ مگر ایک رات جب باپ نے بیٹی کی ماڈلنگ پریڈ کا ٹیلی ویژن سے لائیو ٹیلی کاسٹ دیکھا تو اُس نے پہلے شرم سے اپنا سر جھکا تو دیا تھا مگر پھر غصے سے ایک کوبرا کی طرح سر اُٹھا کر اپنی بیوی کو پہلی بار ایسا ڈنک مارا تھا کہ جیتے جی مر گئی تھی۔ گرج کر کہا تھا کہ ایسی بے شرم اولاد سے میں بے اولاد ہی اچھا تھا۔ بول کس کی اولاد ہے یہ تمھاری بیٹی؟ ایک وفادار بیوی نے جفا نہ کرنے کی کوشش کی مگر اگلی صبح جب کلپنا جیت کا تاج لے کر گھر آئی تو باپ نے اپنی لاڈلی بیٹی کو، جس کو وہ اپنی ماں کی طرح مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ تو میری ماں کا پُنر جنم ہے، حرام کی اولاد کہہ کر گھر سے گھسیٹ کر باہر نکال دیا تھا۔ کلپنا یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائی تھی گویا خوشیوں کے رنگ اُڑ گئے تھے۔ کروڑپتی باپ کے دروازے پر میڈیا کے لوگ اور اشتہار کمپنیوں کے نمائندے جوق در جوق آتے رہے مگر اُن سے کہا گیا کہ حسن کی ملکہ گھر لوٹ کر نہیں آئی تھی جبکہ کلپنا

کی ماں اپنے شوہر کو یقین دلاتی رہی تھی کہ کلپنا کے گائے ہوئے بھجن سنا کر، جو بقول اُس کے شوہر اس کو اپنی ماں کے گائے ہوئے اُن بھجنوں کی یاد دلاتی رہی تھی جو وہ اکثر گایا کرتی تھی۔ فقط یہ احساس دلانے کی خاطر کہ پوتی کی آواز ہو بہو اُس کی دادی جیسی تھی۔ کلپنا اُس دن بھاسکر کے گھر میں رہی تھی اور اپنے سارے غم بھول کر شدت سے کھانس رہے بھاسکر کی دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔ بھاسکر چونکہ ماڈرن رقص سکھا نہیں پاتا تھا اس لیے بے کاری کی وجہ سے بیماری کا شکار ہو کر گھر کی چیزیں فروخت کر کے یا کسی محفلِ موسیقی میں طبلہ بجا کر کسمپرسی میں اپنے مشکل دور سے گزر کر رہا تھا شام کو وہ یہ بھول کر کہ وہ میک اپ میں ہے، بھاسکر کے لیے دوائی لینے گئی تھی جب غرض مند لوگ اس کو عزت و احترام سے ایک عشائیہ میں لے گئے تھے اور وہ لوٹ کر بھاسکر کے پاس نہیں آئی تھی۔ آتی بھی کیسے اشتہاری فلمیں بنانے والوں نے اُس کے پاؤں زمین سے اٹھا کر شہرت کے پَر جو لگا دیے تھے۔ وہ ایک پری جو بن گئی تھی جس کو اُڑتے ہوئے دیکھنے کے لیے اُس کے مداحوں کی نظریں بھی زمین پر جاتی ہی نہیں تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ملک کی بہترین ماڈلوں میں اپنے منفرد اسٹائل والی ایک ایسی ماڈل بن گئی تھی جو بیرونی ممالک میں بھی اپنے رنگ رُوپ کی وجہ سے مقبول انڈین ماڈل بن گئی تھی۔ وہاں کی اشتہاری کمپنیوں کی مقبول ماڈل بن گئی۔ مغربی اسٹائل میں اپنے جسم کی خوبصورتی کو دکھا کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی فحش تصویریں کھنچواتی رہتی تھی اور اُس کی دلکش اداؤں پر فدا ہو کر اس کے ایک ساتھی ماڈل نے اس کے ساتھ شادی کرنے کی تجویز رکھ دی تھی تو اُس نے ماڈلنگ چھوڑ کر ایک گھریلو عورت بن کر رہنے کی شرط پر اپنے پُرکشش جسم کے ساتھ اپنے دل کو بھی اُس کے حوالے کر دینے کے لیے ہاں کر دی تھی۔ وہ اس لیے کہ وہ اپنی ماں کی طرح شہرت کو ٹھکرا کر ایک مشرقی بیوی اور ماں بن جانا چاہتی تھی۔ سادہ طریقے سے شادی ہوئی تو وہ اپنا بنگلہ، کاریں اور بینک میں جمع لاکھوں روپے اپنے شوہر کو دے کر زندگی بسر کرنے کا عزم اٹھا بیٹھی تھی۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد اُس کی زندگی پُرکیف تھی۔ اس کا بیٹا شکل و صورت سے اپنے کروڑ پتی نانا پر گیا تھا اس لیے باپ کو اپنا بیٹا گود میں اٹھانے سے پہلے اس کا کالا رنگ دیکھ کر جھٹکا لگ جایا کرتا تھا مگر وہ یہ جانتا تھا کہ اُس کی بیوی کیمرے کے سامنے بے شک کپڑے اُتار کر آئی تھی مگر کسی کو قریب آنے نہیں دیا کرتی تھی اس لیے اپنی بیوی پر شک کرنے کا سوال اُس کے دماغ میں کبھی اُبھرتا نہیں تھا۔

بے تحاشہ عیش و آرام کی وجہ سے آمدنی کم اخراجات بہت زیادہ ہونے لگے تھے۔ کلپنا

بھاسکر سے سیکھا ہوا کتھک رقص روز کیا کرتی تھی اس لیے ایک بیٹے کی پیدائش کے پانچ سال بعد بھی اس کی شکل وصورت اور جسم کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ رقص کے ساتھ باقاعدگی سے یوگا کرنے کی وجہ سے وہ ایک اَدھ کھلے گلاب کی طرح گویا شباب کا راز چھپا کر ناظرین کی توجہ طلب کر رہی تھی جبکہ اس کا شوہر ڈٹ کر شراب پینے کی وجہ سے آنکھوں کی چمک، چہرے کی تازگی کھو جانے کے ساتھ موٹا ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کو ٹرک ڈرائیور جیسے گیٹ اپ میں پیش کیا جاتا تھا۔ بینک کے کھاتے ایک سوکھے تالاب کی طرح ان کو غصہ دلاتے رہے، جن کے کنارے پر بیٹھی ہوئی خود پالی ہوئی مچھلیاں نکال کر کھانے کے دن تھے۔

وہ دن منحوس تھا کیونکہ ماضی کو بھول کر جب کروڑپتی باپ اپنی کلپنا کو اپنانے کے لیے تیار تھا تب وہ ہوا جو اُس نے کبھی کسی ڈراؤنے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ ماں بیٹے کو سلیپنگ پلز کھلا کر ناکامیاب ماڈل نے بیوی کے سارے کپڑے اُتار کر اپنے Handycam سے تصویریں لے کر کسی Website کو بیچ دی تھیں۔ کہتے ہیں کہ خود غرض اور مطلب پرست کی نگاہ ہمیشہ اپنے ہدف پر رُک جاتی ہے اس لیے شوہر نے بیوی کو ڈرامائی انداز میں بلیک میل کر کے یہ پوچھا تھا کہ یہ شوٹ (Shoot) کب اور کس کے لیے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ میاں بیوی میں بحث ہوئی تھی جو تکرار میں بدل کر اس نقطے پر رُک گئی تھی کہ کلپنا پھر سے ماڈلنگ شروع کر دے۔ دباؤ بڑھانے کے لیے شوہر نے شاطرانہ طریقے سے ایک میگزین کے کور پر کلپنا کی ایک نیم عریاں تصویر شائع کروا کر اُن سے لاکھوں روپے لے کر اُس میگزین کے لیے ایک اشتہاری فلم یعنی Add film کر دے جس کی بدولت زیورات کی نمائش ہو سکے، وہ بھی ننگے جسم پر۔ کلپنا نے انکار کیا تھا اور طلاق کی دھمکی دے کر اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر اپنے گھر لوٹنا چاہا تھا لیکن اس بار ماں بھی بیٹی کے خلاف کھڑی ہو گئی تھی کیونکہ وہ بیٹی کی بے شرمی کے بوجھ سے اتنی جھک گئی تھی کہ اپنے شوہر کے فیصلے سے پہلے وہ خاندان پر ایک کلنک لگانے والی بیٹی کا کنیادان کر کے ''مر چکی کلپنا'' کہہ کر نوحہ خوانی کرنے لگی تھی۔ حالات کی وکالت یا غیر وضاحت کرنے والی ماں ہی دشمن بن گئی تھی۔ تب تو ہمت کرنا بے اثر تھا اس لیے کلپنا اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر اپنے گھر سے بھاگ گئی تھی جبکہ لالچی شوہر سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو کیسے ہاتھوں سے نکل جانے دیتا، خاص طور پر جب وہ زیورات بنانے والوں سے پیشگی لے چکا تھا۔ اس لیے وہ کتے کی طرح سونگھ سونگھ کر بیوی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کلپنا کو تقدیر ایک اَن جانی جگہ پر لائی تھی جہاں ملک کے کونے کونے سے بلکہ بیرونی ممالک سے بھی لوگ رہنے آجاتے تھے

جو Drug Addicts یعنی نشے کی گولیاں یا انجکشن لگا کر ہی ایک سانس کے بعد دوسری سانس لے سکتے تھے۔ایک جنگل میں ایک مہاتما سوامی ان کی دیکھ بھال کیا کرتے ہیں اور اس نیک کام کے لیے مریضوں کو وہاں چھوڑ کر جانے والے ہر ممکن سہولیات فراہم کرتے رہتے ہیں۔

سوامی جی کلپنا کی کیفیت بھانپ گئے تھے اس لیے اس کو بھی لوگوں سے الگ تھلگ رکھ کر آشرم کے کچھ کام کراتے تھے۔اور سوامی جی کی مہربانیوں کی وجہ سے یہ نوکری مل گئی تھی۔آج کا دن کلپنا کی کہانی کا سب سے دردناک واقعہ ثابت ہوا۔اُس کا بیٹا اسپتال میں داخل ہوا تھا۔ایک Pace Maker ڈالنے کے لیے۔خرچہ ایک لاکھ سے اوپر آنے کی اطلاع جب اُس کو دی گئی تھی تب اُس نے ایک تار بھیج کر اپنے شوہر سے مدد مانگ لی تھی۔شوہر فوراً پہنچ گیا تو تھا مگر اپنی لاچاری کا حوالہ دے کر زیورات والوں کے لیے اشتہاری فلم بنانے کی عوض رقم حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔اپنے بیٹے کے علاج کی خاطر ایک ماں کچھ بھی کرنے کو تیار ہو گئی تھی اور یہ کہہ دیا تھا کہ نہ اُس کو زیورات کی ضرورت ہے اور نہ زیادہ روپے کی چاہت ہے!

شوہر مان گیا تھا اور یوں کلپنا کا فوٹو سیشن ہو گیا تھا اور آپریشن بھی ہو گیا تھا اور آج اُس کو اپنے بیٹے سے ملنے دیا گیا تھا۔اور بیٹے کے ہاتھ میں وہ میگزین تھی جس کے کور پر کلپنا کے عریاں سینے پر ایک ڈائمنڈ ہار تھا۔وہ دیکھ کر چونک پڑی اور جب یہ پتا چلا کہ جریدہ باپ نے بیٹے کو دیا تھا وہ بیٹے کا حال پوچھنے کی بجائے اس کے ہاتھوں سے میگزین چھین کر بولی ''یہ کتاب گندی ہے!''

''سب یہی کہہ رہے ہیں۔پاپا بھی۔اور میں بھی میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گا۔پاپا کے ساتھ جاؤں گا! کیونکہ آپ گندی ہو۔'' کلپنا کے پاؤں سے زمین گویا کھسک گئی۔

اس کی کیفیت بھانپ کر شوہر بول پڑا۔''بچھڑے کو اپنے ساتھ لے رہا ہوں تو گائے بھی پیچھے پیچھے چلی آئے گی، بلکہ آنا ہی چاہیے۔بیٹے کے خوشحال مستقبل کے لیے۔آخر بھگوان نے اسی کے لیے تمھیں پھر سے ست رنگی بنا دیا۔میں اس کو ہولی کا تہوار سمجھتا ہوں۔''

کلپنا چیخ پڑی اور دروازے کے باہر کھڑے بھاسکر سے تب ٹکرا گئی جب وہ اپنے آپ سے گھبرا کر کمرے سے باہر آ رہی تھی۔دوڑتی ہوئی۔ایک شیر کو دیکھ کر ایک ہرنی کی طرح! دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور ایک دوسرے سے لپٹ کر بہت دیر روتے رہے۔گویا بن کہے ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سنا رہے تھے!!

OO

شور

منی بس جو کچھ دیر پہلے سواریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور رُک رُک کر چل رہی تھی، اب تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر کے علاوہ بس میں ایک ہی سواری ہے اور وہ میں ہوں! دہلی سے آیا ہوا ایک ایسا شخص جس نے سوچا تھا کہ کہانی ختم ہو چکی ہے مگر آج جو ہوا اُس سے یہ ثابت ہوا کہ کہانیاں رنگ بدلتی ہیں، البتہ ختم نہیں ہوتیں۔ وہ ڈر اور ڈراؤنا شور جو کئی برسوں سے میرا تعاقب کر رہا تھا اچانک ایک پُرسکون خاموشی میں کھو گیا تھا یا پھر بہت پیچھے رہ گیا تھا!

یہ میرا آبائی شہر ہے اور میں یہاں سے بھاگ کر دہلی چلا گیا تھا یا مجھے بھگایا گیا تھا۔ یہ ایک نظریاتی موضوع ہے۔ جس کے بارے میں جب بھی سوچا کرتا تھا مجھے ہر طرف شور سنائی دیا کرتا تھا۔ ڈراؤنا شور جو تحریروں، تقریروں اور تصویروں سے اُبھر کر مجھے تسلیوں کی آڑ میں دھمکیاں اور دھمکیوں کی آڑ میں تسلیاں دے کر، سیاست کے آئینے میں اپنی ہی صورت کے دو عکس دکھا کر خوف، ہراس اور خدشات، کے دلدل میں دھکیل کر مددگاروں کا محتاج بنا چکا تھا۔

کبھی کبھی جلسوں اور جلوسوں میں بلاوجہ ہنستا رہا اور کبھی مصلحتاً روتا رہا۔ لیکن پہلی بار میں یہ محسوس کر چکا تھا کہ میرے گھر والے مجھے زندہ دیکھ کر روتے روتے ہنس پڑے تھے۔ اور آج دوسری بار خود آنسو بہا کر یہ محسوس کیا ہے کہ لوگ ہنستے ہنستے رو کیوں پڑتے ہیں۔

میں جو اَب دیکھ رہا ہوں کاش وہ میں نے تب دیکھا ہوتا تو میں اپنا گھر، کاروبار، باغ اور اپنے وطن کی پاک زمین چھوڑ کر کیوں بھاگ جاتا!

ہاں یہ سچ ہے کہ میرے رشتے دار، محلے دار، شہردار، دوست احباب ملک کے بٹوارے سے پہلے یا بعد اپنا وطن چھوڑ کر ایک بہتر مستقبل کی خاطر ملک کے مختلف شہروں کے علاوہ لاہور، کراچی، لندن یا امریکہ میں جا بسے تھے مگر فرق یہ ہے کہ وہ خود کشمیر چھوڑ کر گئے تھے جبکہ میں دہشت گردوں کے ڈر کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دوست مشتاق کو چکمہ دے کر بھاگ گیا تھا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

وہ ایک اذیت ناک رات تھی اور ایک دردناک سانحے کا آغاز! دن کو میں نے ایک پُر جوش جلوس دیکھا تھا۔ چونکا دینے والے فلک شگاف نعرے سنے تھے۔ میں بھی جلوس میں شامل تھا اور یوں چل رہا تھا جیسے سیلاب کی تیز روانی اپنے ساتھ کناروں کو کاٹ کر لے جاتی ہے۔ رات کو ہر طرف شور سنائی دے رہا تھا۔ اشتعال انگیز نعروں نے رات بھر مجھے سونے نہیں دیا تھا۔ کڑاکے کی سردی میں بھی میں بار بار پانی پی کر سانسیں لیتا رہا اور سحر ہوتے ہی میں مشتاق سے ملے بغیر ایک ملٹری افسر کی مدد سے ہوائی اڈے پر پہنچا اور مشکلاً ٹکٹ لے کر دہلی پہنچ گیا تھا۔ ہوائی اڈے پر گزارے ہوئے ان کرب و کراہن کے لمحات کو جب بھی یاد کیا کرتا تب میرے سینے میں درد اُٹھا کرتا تھا۔

وادی کی سیاست نے ایک ایسی کروٹ لی تھی کہ میری رضامندی کے بغیر میری بیوی دو بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے کر اپنے بھائی کی کار میں دہلی چلی گئی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ ہمارے گھر آ کر دودھ دینے والے نے میری بیوی کو بتا دیا تھا کہ دوسرے محلے کا ایک دل پھینک باغی میری بڑی بیٹی کو اپنے حرم میں شامل کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں مشتاق کے پاس اپنا حالِ دل سنانے گیا تھا اور خاص طور پر یہ بتانے گیا تھا کہ جس عورت کو وہ ذہین اور دور اندیش سمجھا کرتا تھا وہ کیسی بے وقوفی کر چکی ہے مگر وہ مجھ سے خفا تھا اس لیے وہ مجھ سے ملا بھی نہیں تھا۔ ہاں اُس کی نیک سیرت بیوی نے مجھ سے یہ گلہ کیا تھا کہ میں نے ان کی بیٹیوں کو بھی اپنی بیٹیوں کے ساتھ دہلی کیوں نہیں بھیجا تھا۔ مشتاق بھی مجھ سے اسی وجہ سے ناراض تھا۔ تب میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنی بیٹیوں کو گھر سے بے گھر کیوں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں بعد میں مَیں یہ جان گیا تھا کہ ان دنوں چند وارداتیں ایسی ہوئی تھیں جن کے بارے میں سن کر بیٹیوں کے والدین سوزِ نہاں سے اندر ہی اندر روئی کی طرح جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ مگر پھر بھی کوئی بول نہیں پا رہا تھا۔ کیونکہ خوفِ خدا پر تب خوفِ بارود حاوی تھا۔ نہ دل کی بات زبان پر آ رہی تھی اور نہ کوئی اپنے دماغ کی بات مان رہا تھا۔ مصلحت کی آڑ میں یا ڈر کے دباؤ میں آ کر مصنوعی مسکراہٹوں کی مدد سے دوست سے دوست جھوٹ بولتا رہتا تھا۔

عام لوگوں کو رشتوں پر اعتماد اُٹھ چکا تھا اور ان ناطوں پر اعتقاد تھا جو گرم ہواؤں کے رُخ سے پیدا ہو رہی آندھیوں کو بادِ نسیم سمجھ رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے مشتاق کی بیوی سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں کر پایا تھا کیونکہ اس کی بیٹیوں کو میں اپنے ساتھ نہیں لا سکا تھا۔ حالانکہ اس

رات میں مشتاق کے گھر میں ہی تھا اور اپنے گھر کی چابیاں بھابھی کے سپرد کر کے صبح سویرے ہوائی جہاز کی ٹکٹوں کا انتظام کرنے نکلا تھا۔

حالات جب کسی شخص کے ارادوں پر حاوی ہو جاتے ہیں تو مجھ جیسا معقول سوچ سمجھ والا بھی اگر جہاز میں سوار ہونے کے بعد کسی سے اپنی نامعقول حرکتوں کو جائز ٹھہرائے تو ظاہر ہے کہ اس نے آگے چلتے چلتے اپنے قدموں کے نشانات مٹا کر اپنی واپسی کو خارج از امکان سمجھا ہے۔ مجھ پر بھی ایسی ہی کیفیت طاری ہو گئی اور رات بھر سے نعروں کی گونج ہوائی جہاز میں بھی میرا تعاقب کر رہی تھی۔ میں یہ سمجھا تھا کہ کہانی ختم ہو گئی ہے، لیکن کہانی جاری رہے گی یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ دراصل برف جب پگھل جاتی ہے تب زمین ویسی ہی ہوتی ہے جیسی وہ برف باری سے پہلے ہوتی ہے۔

مشتاق میرے بچپن کا دوست ہے! ہمارے پرانے مکان بھی ایک محلے میں تھے۔ ہمارے نئے بنگلے بھی ایک ہی کالونی میں ہیں۔ ہم دونوں نے وہ بھی دن دیکھے ہیں جب موسم سرما میں ہم اپنے گھروں کی چھتوں سے برف اُتروایا کرتے تھے تاکہ برف کے بوجھ سے چھت ہی نہ گر جائے!

ہم دونوں کتابوں کا ایک سیٹ خرید لیا کرتے تھے اور ایک ہی کمرے میں پڑھا کرتے تھے۔ کبھی ہمارے گھر اور کبھی مشتاق کے گھر۔ دراصل ہر کشمیری آدھا ہندو اور آدھا مسلمان ہے۔ اُسی کا نام کشمیریت ہے۔ مذہب ہمارا عقیدہ ہے، چاہت اور محبت کا ایک طریقہ ہے، عبادت کا ایک پُرسکون ذریعہ ہے۔ مگر آج کا واقعہ دیکھتے ہی دیکھتے صرف مذہبی رنگت کی وجہ سے برف کو بارود بنا گیا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ میں یہاں قطعاً نہیں آیا ہوتا اگر مشتاق میری بیٹی کی شادی کی تمام تقریبات میں شرکت کرنے کی خاطر جون کی جھلستی ہوئی دُھوپ میں دہلی نہ آیا ہوتا اور وہ بھی تب جب میں نے اُس کو یہ سوچ کر دعوت نامے کی بجائے ایک پوسٹ کارڈ لکھا تھا کہ بدلے بدلے حالات میں وہ کہاں آئے گا۔ اس لیے میں نے اپنا مکمل پتا بھی نہیں لکھا تھا اور نہ رابطے کے لیے اپنا فون نمبر دیا تھا۔ مگر دہلی جیسے شہر، جہاں ایک ہی بلڈنگ میں رہنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ساتھ والے فلیٹ میں کون رہتا ہے، اُس شہر میں اُس نے دن بھر دُھوپ میں جھلس کر شام تک میرا گھر تلاش کیا تھا۔ یہ بات میرے دل کو چھو گئی تھی اور اسی لیے میں جموں تک ٹرین میں آیا، یہ سوچ کر کہ جموں سے سری نگر کی فلائٹ لوں گا۔ میری ٹکٹ بھی او۔کے تھی مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے فلائٹ کینسل ہو گئی تھی۔ پھر ہم پانچ لوگوں نے ٹیکسی لی اور جب سری نگر پہنچے تو ٹیکسی ڈرائیور خالد حسین نے مجھے

ٹیکسی اسٹینڈ کی بجائے اُس اڈے پر چھوڑا تھا جہاں سے مجھے مشتاق کے گھر پہنچنے کے لیے منی بس مل گئی تھی۔ کشمیر میں سردیوں کے موسم میں چھ بجے ہی شام ہو جاتی ہے اور پھر جب برف باری ہو رہی ہو تو سڑکیں سنسان ہوتی ہیں۔ اس بار قدم قدم پر فوجی دیکھ کر اور بار بار چیکنگ دیکھ کر جبکہ کچھ زیادہ ہی گھبرا گیا تھا تب خالد حسین نے مجھے یہ کہہ کر چونکا دیا تھا کہ میں ہندو ہو کر بھی ملٹری والوں سے کیوں ڈر رہا ہوں؟ چونک کر ڈرنے کی وجہ یہ تھی کہ میں دورانِ سفر اپنے ہم سفروں اور ڈرائیور سے گفتگو کرتے وقت احتیاط سے کام لے کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر چکا تھا کہ میں بھی ان کی طرح مسلمان ہوں۔ حالانکہ اپنی کوشش کو کامیاب سمجھ کر بھی ایک بے شکل کا خوف سفر کے دوران میرا تعاقب کرتا رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ ڈر دہلی میں رہ کر ان لیڈروں کے بیانات، انٹرویو یا جلسوں اور جلوسوں میں ان کی تقریروں نے پیدا کر دیا تھا! بیتے کل کی باتیں سنا سنا کر وہ آنے والے کل کی باتیں اور ان باتوں کے حوالوں سے سبز باغ دکھانے والے لیڈران اپنی حکمتِ عملی سے اپنے گھروں میں لوٹ کر جانے والوں کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوئے تھے کہ وہاں جا کر کیا کرنا، جہاں پڑوسی بھی نہیں اپنا! وہاں جا کر کیا کرنا، جہاں غلام بن کر ہے رہنا! وہاں جا کر کیا کرنا، جہاں مذہب کو ہے بدلنا، ورنہ ہے مرنا—! یہ تمام باتیں جن کو میں نظر انداز کر کے گھر سے چل پڑا تھا جانے کیوں مجھے یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے منی بس میں بیٹھے سبھی لوگ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے مہابھارت میں کورو پانڈو ارجن کے بیٹے ابھیمنیو کو کال چکر میں پھنسا کر دیکھ رہے تھے۔ مجھے کشمیری ہونے کے باوجود ہندو ہونے کی وجہ سے اپنی سلامتی خطرے میں نظر آئی۔ ہوا یوں تھا کہ مجھے نہ ٹیکسی ملی تھی اور نہ آٹو۔ اس لیے مجھے مجبوراً ایک کھچا کھچ بھری منی بس میں بیٹھنا پڑا تھا۔ وہ بھی صنعت نگر جانے والی آخری بس میں۔ زبردست برف باری کی وجہ سے اُدھ ڈھکے چہرے پُراسرار نظر آ رہے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ کچھوے کی رفتار سے چل رہی بس بار بار رُک رہی تھی۔

ایک موڑ پر ایک نوجوان بس میں سوار ہوا تو سبھی سواریاں اس کو اپنی سیٹ دینے کے لیے کھڑی ہو رہی تھیں۔ دیکھا دیکھی مَیں نے بھی اپنی سیٹ کی پیشکش کی مگر وہ نوجوان مسکراتا ہوا آگے بڑھ کر ایک سواری کو سیٹ خالی کرنے کے لیے اشارہ کرنے کے بعد اُس درمیانی عمر کے شخص کے ساتھ بدتمیزی کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر بس میں بیٹھے تمام لوگ خاموش رہے مگر ایک عمر رسیدہ شخص نے نوجوان کو نہایت حلیمی کے ساتھ کہا۔ ''بیٹا! یہاں آؤ، میری سیٹ پر بیٹھو۔ میں نے اگلے موڑ پر اُترنا ہے!''

نوجوان غصّے سے بھڑک اُٹھا۔ ''کیوں یہ تمھارا داماد ہے پنڈت؟ یا یہ ان سب کو بتا دینا چاہتے ہو کہ مسلمان جابر ہے اور ہندو دیالو۔''

بوڑھا پنڈت پھر حلیمی سے بولا ''بیٹا ناراض کیوں ہو رہے ہو؟''

نوجوان چلاّنے لگا ''چپ ہو جاؤ! رہنے دو یہ مکاری، بھارت کے جاسوس، ڈرائیور صاحب! گاڑی روک لو اور اس کافر کو یہیں اُتار دو!''

منی بس رُک گئی اور نوجوان نے بوڑھے آدمی کو دھکّے دے کر بس سے اُتارا تو کڑاکے کی سردی میں بھی میرا حلق سوکھ گیا۔ منی بس میں خاموشی چھا گئی۔ اور وہ نوجوان بندوق ہاتھ میں لہرا کر اپنے گھر پر اُترا۔ تب تک منی بس ایک اور راستے پر چار کلومیٹر سفر طے کر کے واپس آ رہی تھی۔ اچانک میرے ساتھ بیٹھا نوجوان مسافر ڈرائیور کے کان میں کچھ بول کر پھر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے دبی آواز میں پوچھا ''کیا بات ہے؟''

وہ پہلے بڑبڑا کر بولتا رہا مگر جب آس پاس بیٹھی سواریاں اُس کی باتیں غور سے سننے لگیں تب وہ بآوازِ بلند بولتا رہا۔ ''ہندو ہو یا مسلمان، دونوں باہم ایک ہیں! جس طرح اعدادِ جمنا اور زمزم ایک ہیں! صوفی سنتوں کی اس پاک وادی میں یہ شیطانی ہوا کہاں سے آئی؟ جو ناک سے گھس کر چند لوگوں کے دماغ میں چھا گئی؟''

منی بس میں خاموشی چھا گئی تو ایک سواری نے ڈرائیور سے کہا ''بھیا دیر ہو گئی۔ سردی سے جان نکلتی ہوئی لگ رہی ہے۔''

ڈرائیور بولا ''ہاں! دیر ہو گئی، بلکہ بہت دیر ہو گئی۔ پنڈت کہیں مر نہ جائے!'' یہ کہہ کر جب ڈرائیور گاڑی موڑ کر واپس لے گیا تب سبھی سمجھ گئے کہ گاڑی بوڑھے پنڈت کو لینے کے لیے جا رہی ہے۔ کوئی کچھ بھی نہیں بولا مگر چہروں کے تاثرات یہ ظاہر کر رہے تھے کہ سبھی خوش تھے کہ ڈرائیور ایک انسان کو عذابِ شدید سے آزاد کرنے کی خاطر ایک سچے مسلمان کی طرح ثواب کا کام کرنے جا رہا ہے۔

زبردست برف باری میں بوڑھا سڑک پر کسی گاڑی کے آنے کی اُمید لگائے انتظار کر رہا تھا، مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان چھاتا ہاتھ میں لے کر کھڑا تھا مگر چھاتا بوڑھے کو برف سے بچا رہا تھا۔ یہ منظر گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں یوں نظر آ رہا تھا جیسے ٹی وی پر کوئی چونکا دینے والا منظر! بوڑھا گاڑی میں بیٹھ کر ہنس پڑا۔ اُس کی کیفیت بھانپ کر سواریاں بے ساختہ ہنس پڑیں۔ چند لمحات کے لیے پنڈت کو دیکھ کر سب کھلکھلا کر ہنستے رہے۔ پنڈت کے چہرے پر

اطمینان کے تاثرات تھے اور لبوں پر نہ گلہ نہ شکوہ اور نہ شکایت کے الفاظ تھے۔

ایک سواری نے مشکلاً اپنی ہنسی روک کر بوڑھے پنڈت سے پوچھا "پنڈت جی! سچ سچ بتادو، کیا آپ کو معلوم تھا کہ کوئی آپ کی مدد کرنے آئے گا؟"

پنڈت جی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر "ہاں" میں سر ہلا کر جب کسی نہ کسی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تب ایک نوجوان نے اپنی سیٹ پر بٹھا دیا مگر وہ بھی بوڑھے پنڈت پر ہنستا رہا۔ ڈرائیور، کنڈکٹر اور باقی سواریوں کی طرح!

بوڑھا بھی ایک معصوم بچے کی طرح ہنس پڑا تو میں بھی، رائے عامّہ سے ہاں میں ہاں ملانے کی خاطر، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اپنی سلامتی کی خاطر تو مناسب ہوگا، کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مگر آج میں پہلی بار بہت سارے لوگوں کو ایک ساتھ ہنستے ہنستے روتے ہوئے دیکھا۔

میں بھی رو پڑا اور جذبات کی رَو میں بہہ کر یہ نہیں جان پایا کہ کون کہاں اُتر کر اپنے گھر چلا گیا مگر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خاموشی چھا گئی۔ وہ ڈراونی خاموشی نہیں جو آنے والے طوفان کی اطلاع دیتی ہے بلکہ وہ خاموشی جو صوفی سنتوں کو سکون دیتی ہے۔ یہ وہ خاموشی تھی جس نے ان چند کشمیری لیڈروں، جو پچاس سال سے دہلی میں رہتے ہیں یا پچاس صدیوں سے کشمیر میں رہتے آئے ہیں، کے شور کو یوں نگل لیا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے سمندر منتھن کے بعد بھگوان شنکر نے زہر پی لیا تھا، ڈرائیور نے میرے احساسات کا سلسلہ توڑ کر آواز دی "پنڈت صاحب! اکیلے اکیلے میری گاڑی میں سفر کرنے سے ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟ میں آپ کو اپنے دوست کے گھر چھوڑ آؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے کہاں جانا ہے۔ خالد حسین نے بتا دیا تھا۔"

ایک ڈرائیور کے شور کے بعد ایک پُرسکون خاموشی پھر اچانک ایک ہوا کے جھونکے کی طرح اپنی موجودگی کا احساس دلانے والے ڈرائیور کی آواز سن کر مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ایک برفیلے طوفان میں ایک بچہ اپنی ماں کے بھیگے بھیگے آنچل میں چھپ کر بیٹھا اپنی ماں کے دل کی دھڑکنیں سن کر حفاظت کی آنچ محسوس کر رہا ہے۔

کاش وہ کشمیری جو ملک میں اور بیرونی ممالک میں بیٹھ کر کشمیر کے تحفظ کی باتیں کرتے رہتے ہیں، کشمیریوں سے لپٹ کر حفاظت کی آنچ محسوس کرتے اور یہ سمجھتے کہ وہ کورو، پانڈو جیسے بھائی نہیں بلکہ رام رحیم جیسے ہیں۔ شور کسی کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع دے تب نا؟

○○

گرین روم

کل سرسوتی تھیٹر کے بہت بڑے گرین روم میں جو اُس وقت ہو رہا تھا وہ آج اُس کو کہیں بھی نظر نہیں آرہا ہے!

کل جب وہ معمول کی طرح رات بھر کروٹیں بدل بدل کر گزارنے کے بعد اپنی بے تاب تمناؤں کو سینے سے لگا کر سحر ہونے سے پہلے گرین روم کے سامنے کھڑا ہوا تھا تب دروازہ اندر سے بند تھا۔ اُس نے نہ آواز دی تھی اور نہ دستک دی تھی، مگر اُس کی آمد کا بے صبری سے انتظار کر رہے اُس کے ڈرامے کے آرٹسٹوں نے اُس کے قدموں کی آہٹ سن کر دروازہ کھولا تھا بلکہ نہایت عقیدت مگر ڈرامائی انداز سے اُس کا استقبال کیا تھا! کیونکہ تمام آرٹسٹ اپنے اپنے گیٹ اَپ میں تھے اور دروازہ کھلتے ہی گرین روم میں چکا چوندھ روشنی دیکھ کر اُس کو یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ صدیوں گزر چکے مغلیہ دور میں پہنچ گیا تھا!

وہ کئی برسوں سے اُفق پر کھڑی سحر دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا مگر جس رنگین سحر کو دیکھنے کا وہ منتظر تھا وہ اُس نے کل گرین روم میں دیکھ لی تھی۔ اُس کی کیفیت اُس باغباں جیسی تھی جو اپنے گلشن کو بوقتِ سحر دیکھ رہا ہو اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانے پر فخر محسوس کر رہا ہو! کل اُس کو اپنے مرحوم دادا کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک ڈرامہ نگار زچہ ہے اور اُس کا بچہ اُس کا ڈرامہ ہے۔ گرین روم وہ جگہ ہے جہاں ہدایت کار ڈاکٹر کی طرح زچہ بچہ کا خیال رکھتا ہے اور پھر اسٹیج پر بچے کی منہ دکھائی کے لیے پردہ اٹھاتا ہے۔ بچہ خوب صورت ہو تو ناظرین کی واہ واہ سنتا ہے بصورتِ دیگر خود آہیں بھرتا ہے۔ اُس کو یقین تھا کہ گجراتی، مراٹھی یا دیگر علاقائی زبانوں میں کھیلے جا رہے ڈراموں کی طرح اُردو زبان سے پیار کرنے والے اُس کے اُردو ڈرامہ ''آخری رقص'' کو پسند کریں گے خاص طور پر اس لیے کہ وہ اپنے ڈرامے کو مرحوم آغا حشر کاشمیری کے سانچے میں

ڈھالنے کی خاطر بہت محنت کر چکا تھا۔ مگر وہ منزل کے قریب پہنچ کر بھی گرین روم سے اسٹیج تک کا مختصر فاصلہ طے نہیں کر پایا تھا، حالانکہ گرین روم تک پہنچنے کے لیے ایک لمبا اور دُشوار سفر طے کر چکا تھا!

وہ اگر ناکامیاب ہوا تھا تو وجوہات کسی طبقے کے اعتراضات، سیاسی اختلافات یا دہشت گردی کے امکانات وغیرہ وغیرہ نہیں تھے بلکہ بات کچھ اور تھی!

آج جب وہ سحر سے پہلے گرین روم کے قریب پہنچا تھا تب دروازہ کھلا تھا اور اندر کوئی اُس کا انتظار نہیں کر رہا تھا۔ اندر پھیلی دُھندلی روشنی یہ کہہ رہی تھی کہ میں وہ سحر ہوں جس نے شام کا لبادہ پہن رکھا ہے مگر اُس کو بار بار اپنے مرحوم دادا کی موجودگی کا احساس ہوتا رہا تھا بلکہ گاہے بگاہے ان کی ڈرامائی آواز بھی اُبھرتی ہوئی سنائی دیتی تھی اور جب بھی وہ آواز کا تعاقب کرتا تھا تب آواز یوں ڈوب جایا کرتی تھی جیسے ایک گہری جھیل میں ایک پتھر۔ پھر وہ پانی کی سطح پر ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے چند دائرے دیکھتا رہتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہر دور کا ڈرامہ تین ستونوں پر کھڑا ہے۔ رام لیلا، کرشن لیلا اور اِندر سبھا، مگر چوتھا ستون وقت کے ساتھ بدلتا ہے۔ کہیں شیکسپیئر اور کہیں کالیداس! اُردو ڈرامے میں آغا حشر کاشمیری بھی ایک ستون ہے جس کو اگر نکالا جائے تو ڈرامہ ڈگمگانے لگتا ہے اور بیساکھیوں کے سہارے کھڑا رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جملے اُس کے مرحوم دادا اکثر کہا کرتے تھے اور وہ گرین روم میں اپنے ڈراموں کی ریہرسل کرتے ہوئے اپنے پوتے کو سنایا کرتے تھے کیونکہ وہ بھی تھیٹر میں بہت دلچسپی لیا کرتا تھا اور یوں وہ بھی اکثر آغا حشر کے ڈراموں کے مکالمے بول بول کر اپنے کالج کا ایک مقبول ڈرامہ کار بن گیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنا ایک منفرد گروپ بنا کر ماضی کے حوالوں سے حال اور مستقبل کے عکس دکھانے میں ایک پہل کرتا ہے اس کے فلم ساز باپ نے اس کو اسٹوڈیو میں مستقل طور پر بٹھا دیا تھا۔ یوں ایک فلم کار ایک کامیاب فلم کار بن گیا تھا۔ خوب شہرت اور دولت کمانے والا ایک تخلیق کار فلموں میں آئی ہوئی مغربیت کے دباؤ اور تجارتی کھنچاؤ سے تنگ آ کر ایک روز اسٹوڈیو کی جگمگاتی روشنیوں کو چھوڑ کر اُس گرین روم کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ ایک مقصد کی خاطر، ایک بلند عزم کے ساتھ اُس کا سفر شروع ہو کر آج ختم ہوا تھا۔

اس کے ہم عصر اُس کو ایک ذہنی مریض سمجھ کر اُس پر ترس کھایا کرتے تھے وہ اس لیے کہ آج

کل کے دور میں جبکہ تھیٹر کو سیڑھی بنا کر فنکار فلموں میں کام کرنے کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں وہ عرش سے فرش پر کود کر مرحوم آغا حشر کاشمیری کے طرز کے ڈرامے کرنا چاہتا ہے اور وہ بھی زندہ ناچ گانوں اور مکالموں کے بل بوتے پر۔ ویسے ہی جیسے صدیوں سے رام لیلا کھیلی جاتی ہے۔

وہ جانتا تھا کہ وہ اپنا علاج خود کر سکتا ہے کیونکہ ایک بار اُس کے مرحوم دادا نے حکیم لقمان اور اُس کے بیٹے کی کہانی سنائی تھی۔ کہتے ہیں جب لقمان کے بیٹے کے پیٹ میں ایک جان لیوا رسولی کو اُس کی ادویات نکاس کرنے میں ناکامیاب ہوئی تو دم توڑنے سے پہلے بیٹے نے باپ سے تربوز کھلانے کی ضد پکڑ لی جو حکیم نے ٹھکرا دی تھی۔ حکیم لقمان نے تحقیق کے لیے مُردے کے جسم سے رسولی نکال کر جب تربوز میں ڈالی تب رسولی تحلیل ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھی۔ گویا مریض اپنے مرض کا علاج بتا تو گیا تھا مگر ایک باپ کے جذبات کو ایک حکیم کی منطق نے دبوچ ڈالا تھا۔ حالات نے اُس کا قد چھوٹا کر دیا تھا اس لیے اُس کے قدم بھی چھوٹے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ جب اس کا ڈرامہ 'آخری رقص' ناظرین کے سامنے آئے گا تب اُس کو ذہنی بیمار کہنے والے اُس کے اِرد گرد بونوں کی طرح نظر آئیں گے مگر اُس کے دل کی تمنا دل میں ہی رہ گئی!

کل اس کے چہرے پر خوشیاں رقص کر رہی تھیں جب سحر کے وقت اُس کا موبائیل فون بج اُٹھا تھا۔ فون امریکہ میں رہنے والے ایک سنگیت کار کا تھا جس نے امریکن لڑکیوں کو ہندوستانی سنگیت سکھانے کے لیے ایک اسکول کھولا تھا۔ جب وہ فون پر اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا اُس کے ڈرامے میں انارکلی کا رول ادا کرنے والی لڑکی 'شاردا' بار بار قریب سے گزر کر رقص کی مدد سے اشاروں ہی اشاروں میں یا ہلکے سُروں میں گنگنا کر اُس کی توجہ انارکلی کی ماں اور جودھا بائی کا کردار ادا کرنے والی دو لڑکیوں کی تکرار کی طرف مرکوز کرنا چاہتی تھی مگر وہ اپنی بے قابو خوشی کے اُچھال کے ساتھ باتیں کیے جا رہا تھا "واہ استاد! تم نے ایک کرشمہ کر کے دکھا دیا ہے۔ اور نہیں تو کیا۔ تم نے نیم عریاں چھاتیوں اور ٹانگوں کو مشرقی لباس سے چھپا کر ان کے ہاتھوں میں ستار رکھ کر اپنے تہذیب اور تمدن کا سر اونچا کر دیا ہے۔ وہ بھی تب جب ہمارے ملک میں ری میکس کے نام پر پرانے صدا بہار نغموں کو بے ہودہ عریانیت کی آڑ میں پیش کیا جانا ایک مقبول اور فائدہ مند عمل ہے۔ ارے اعتراضات کرنے والے بزرگ بھی شوق سے ایسے پروگرام دیکھنے کے بعد ٹی وی پروگراموں کی مخالفت کم اور وکالت زیادہ کرتے رہتے ہیں۔

"ارے جانتا ہوں وہاں شام ہونے کو ہے اور یہاں سحر کی کرنیں صبح ہونے کی اطلاع دے رہی ہیں۔ تمھارا یہ کہنا کہ تم نے میری نیند میں خلل ڈالا ہے نہ میرے لیے تکلف کا اظہار ہے اور نہ طنز کی گدگدی۔ وہ اس لیے کہ میں اپنے بیڈروم سے نہیں بول رہا ہوں بلکہ سرسوتی تھیٹر کے گرین روم سے بول رہا ہوں۔ اپنے ڈرامے 'آخری رقص' کا فائنل ریہرسل کرنے جا رہا ہوں۔ آج شب کو پہلا شو ہو رہا ہے۔ ایک مسیحا مل گیا! وہ ایک کروڑپتی ہے مگر وہ بھی مرحوم آغا حشر کاشمیری کا مداح ہے۔ اُردو زبان سے جنون کی حد تک پیار کرنے والا۔ بیوی اپنے وقت کی مشہور کتھک رقاصہ اور بیٹی ایک بہترین رقاصہ، گلوکارہ اور اداکارہ۔ ہاں، ہاں! وہی انارکلی کا رول کر رہی ہے۔ نہیں نہیں۔ سبھی آرٹسٹ نئے ہیں۔ پرانے آرٹسٹوں کو فلموں میں اگر کام نہیں ملتا ہے تو وہ میگا سیریل میں کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں سبھی کو شوق ہے۔ کام کرنے کی لگن ہے۔ سبھی امیر ہیں۔ کاروں میں یہاں آتے جاتے ہیں۔ اپنے خرچ پر اپنے ڈریس ڈیزائنروں سے اپنے اپنے ملبوسات بنوا چکے ہیں۔ سبھی کے اپنے اپنے میک اپ کرنے والے ساتھ آتے ہیں — اُردو زبان سبھی بولتے تو رہتے ہیں۔ ہاں لکھ پڑھ نہیں سکتے ہیں۔ ارے بھائی ہندی کے نیوز بلیٹنز میں بھی 'شرط'، 'مدعا'، 'ذمہ داری'، 'خارج'، 'مقدمہ' وغیرہ جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ہاں تلفظ صحیح ہو اس کے لیے میں نے سارا ڈرامہ صوتی اثرات، بیک گراؤنڈ میوزک، ڈانس میوزیک اور نغمے کو ریکارڈ کرا لیا ہے۔ ہاں ہاں مکالمے بھی۔ مردانہ مکالمے اپنی آواز میں اور زنانہ مکالمے شاردا۔ وہ لڑکی جو انارکلی کا رول کر رہی ہے۔ روز صبح سویرے یہ ریکارڈڈ کیسٹ آرٹسٹوں کو سناتا ہوں۔ ہاں یوں وہ اپنے مکالموں کو حسبِ ضرورت ادا کر سکتے ہیں۔ بہت محنت کی ہے۔ ارے بھائی انگریزی میں باتیں کرنے والے میرے آرٹسٹ اپنی مادری زبان بھی انگریزی لہجے میں بولتے ہیں۔ مجھے ہندی لکھنی آتی نہیں اس لیے اپنی ساری اُردو اسکرپٹ کو انگریزی میں ٹائپ کر کے ہر آرٹسٹ کو مکمل اسکرپٹ کی ایک ایک کاپی دے چکا ہوں۔" وہ اپنے دوست کو اور بھی کچھ بتا دینا چاہتا تھا مثلاً یہ کہ شاردا کے باپ نے اسٹیج پر شہنشاہ اکبر کے دربار کا ایک عالی شان سیٹ لگا رکھا ہے اور جدید قسم کی روشنی کے اِفیکٹس دینے کے لیے ایک ماہر کو مہارت کا کام سونپا ہے اور پہلے ہی شو کے لیے اعلیٰ عہدوں والی شخصیات کے علاوہ میڈیا والوں کو مدعو کیا ہے بلکہ شو کی مکمل ریکارڈنگ کے انتظامات بھی کر دیے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُردو زبان کے قدردان و مہربان کو بھی خاص طور

پراس اُردو ڈرامہ کو نیا جنم دینے والی مہم کو فروغ دینے کی خاطر اُس کے ہم سفر، ہم نفس اور ہم نوا بنتے جارہے تھے۔ مگر یہ باتیں وہ اپنے دوست کو بتائے بغیر، شو کے بعد فون کرنے کے وعدے کے ساتھ اپنا پُر جوش سلسلۂ گفتگو اچانک ختم کر کے اُسے اُن دو لڑکیوں کے درمیان کھڑا ہونا پڑا تھا جو تکرار کے ساتھ ایک دوسرے پر جاہل لوگوں کی طرح ٹوٹ پڑی تھیں اور ان کی باتوں سے اپنے دل کی باتیں جوڑ کر ڈرامے کی آخری ریہرسل کرنے کی بجائے اپنا تحریر کردہ ڈرامہ کھیل رہی تھیں جس کو دیکھ کر شارداا ور وہ لرز اُٹھے تھے اور ڈرامے کا انجام دیکھ کر رات کو اس نے امریکہ میں مقیم اپنے دوست کو فون کر کے اپنی گفتگو کو وہاں سے جاری نہیں کیا تھا جہاں وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ جو بھی ہوا تھا وہ گویا قسطوں میں ہوا تھا۔

شروعات انارکلی کی ماں اور جودھابائی کے کرداروں کو ادا کرنے والی لڑکیوں کی ٹکر سے ہوئی تھی۔

"ٹکر مار کر جو تم چکر چلا رہی ہو وہ میں ہونے نہیں دوں گی، نادرہ کی ماں!"

"میں نادرہ کی نہیں، انارکلی کی ماں کا رول کر رہی ہوں۔ مہارانی کا رول کیا مل گیا تم اپنے آپ کو برطانیہ کی ملکہ سمجھ رہی ہو! جودھابائی!"

"یہ لباس تم تو نہیں بنا سکتی۔ جبھی تو تمھیں یہ کباڑی سے لیے ہوئے کپڑے پہنا کر ایک مفلس کا رول دیا گیا ہے۔"

"یہ تو کیا بک رہی ہے؟ بھول گئی وہ اسکول کے دن۔ تو اسکول بس میں آیا جایا کرتی تھی جبکہ میں اپنی کار میں۔ میرا لنچ بھی ڈرائیور لے کر آیا کرتا تھا۔ رہی بات ایک شاہی لباس کی، یہ دیکھ — یہ دیکھ — میں نے یہ ڈریس بنوائی تھی تمھارے زیورات نقلی ہیں اور یہ دیکھ میں اپنی ماں کی اصلی جیولری لائی ہوں اور اب میں مہارانی جودھابائی کا رول کروں گی۔ اور تمھیں یہ پھٹے کپڑے پہنوا کر ہی رہوں گی۔"

"ہاں، یہی تو چکر چلا رہی ہو تم۔ آخر دل کی بات زبان پر آہی گئی نا۔ ایک رقاصہ ہندوستان کی ملکہ بن جانا چاہتی ہے۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ ڈائیلاگ میرا ہے۔" اکبر کا رول کرنے والا نوجوان اُبل پڑا۔

"اکبر سچ بول رہا ہے۔ مسز اکبر! مجھے اکبر کے سارے ڈائیلاگ یاد ہیں" راجا مان سنگھ کا

کردار ادا کرنے والا نوجوان بول پڑا۔

''مسز اکبر نہیں۔ مہارانی جودھا بائی۔ آپ کو اپنے مکالمے یاد ہیں'' اُس نے عاجز ہو کر پوچھا۔''ہاں! مجھے سارا ڈرامہ یاد ہے۔ سلیم کے ڈائیلاگ سنا دوں۔''

وہ تب پہلی بار گرین روم میں چلا کر بول پڑا تھا'' اپنے اپنے ڈائیلاگ باڈی لنگویج کے ساتھ سناؤ تاکہ ہم اسٹیج پر ہی فائنل ریہرسل کر پائیں۔''

''سر! اُردو زبان آپ نے سکھا دی لیکن یہ جسمانی زبان آپ نے...'' اس سے پہلے کہ سلیم کا رول ادا کرنے والا نوجوان اپنا جملہ پورا کر پاتا انارکلی نے سلیم کو ٹوک کر کہا تھا:

''ایکشن اور ری ایکشن! چہرے کے تاثرات سے، آنکھوں کے اشاروں سے، جسم کے دوسرے حصوں کی حرکتوں سے۔''

''جیسے ہم ری مکس گانوں میں دیکھتے رہتے ہیں''۔ 'داروغہ زندان' کا کردار کرنے والا نوجوان اپنے سونے کی گھڑی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جب بول پڑا تب اُس پر گویا بادل پھٹ کر گر پڑے تھے اور وہ بے بس ہو کر بہہ رہے پانی کے ساتھ منزل کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر اُس جگہ کی طرف جا رہا تھا جہاں سے اس نے ایک دشوار سفر شروع کیا تھا۔ مگر اُس وقت انارکلی نے اُس کا ہاتھ تھام کر بچا لیا تھا۔

دراصل ڈرامہ نگار، گیت کار، سنگیت کار، اداکار اور ہدایت کار کو اس کے ڈرامے کے ایک کلیدی کردار نے یہ بات سمجھا دی تھی کہ مکمل اسکرپٹ کو ریکارڈ کر کے کرداروں کو اپنے پسندیدہ مکالمے ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہر کردار نے اپنے پسندیدہ کردار کی پوشاکیں بھی تیار کی تھیں۔ حالانکہ یہ سبھی آرٹسٹ جان گئے تھے کہ شاردا ہی وہ واحد آرٹسٹ تھی جو کتھک رقص کرنے کے ساتھ ڈرامے کا واحد نغمہ بھی ریکارڈ کرا چکی تھی پھر بھی جودھا بائی کا کردار ادا کرنے والی لڑکی نے انارکلی کے کاسٹیوم تیار رکھ لیے تھے۔ آخری مرحلے پر اپنے قلعے کی کمزور دیواریں دیکھ کر ہدایت کار نے اپنا بچاؤ کرنے کی خاطر یہ فیصلہ کیا تھا کہ تمام کردار اپنے اپنے طے شدہ رول کے گیٹ اپ میں بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے جبکہ اُن کے مکالمے پس منظر ٹیپ پر سنائے جائیں گے جبکہ شاردا اسٹیج پر اپنی ہی آواز میں ریکارڈ کیے گئے نغمے پر کتھک رقص کر کے شو کو کامیاب بنانے کی کوشش کرے گی۔ سبھی آرٹسٹوں نے اس لیے ہاں کر دی تھی کیونکہ وہ ناظرین کے سامنے آنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے

دن بھر ٹیپ چلتا رہا اور انار کلی رقص کرتی رہی۔

اسٹیج پر جانے سے پہلے ہدایت کار پر ایک بار پھر آسمان ٹوٹ پڑا۔ دو دو سلیم، دو دو انار کلی، دو دو اکبر دیکھ کر وہ گھبرا گیا لیکن اپنے فلمی تجربے کی بدولت اُس نے لائٹ اِفیکٹس کے ماہر کو یہ ہدایات دیں کہ وہ روشنی کے دائرے میں فقط انار کلی کے رقص کو رکھ دے۔

پردہ اُٹھتے ہی انار کلی کے رقص کی شروعاتی موسیقی سنائی دی۔ پھر ترانہ بھی ناظرین نے سنا اور دیکھا مگر اچانک ایک تازہ ترین فلمی گیت گونج اُٹھا اور دوسری انار کلی نے شاردا کو دھکیل کر روشنی کے دائرے سے باہر نکال کر ری مکس اسٹائل میں ناچنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر ڈرامے کے سبھی کردار مغلیہ دور کے گیٹ اپ میں مغربی طرز کا ڈانس کرتے ہوئے جھومنے لگے۔ جس کے شور کو سن کر یا دیکھ کر ہال میں بیٹھے بیشتر لوگ لطف اندوز ہوتے رہے۔ وہ اُس کے اُردو ڈرامے پر ہو رہی نوحہ خوانی کے مانند تھی۔

پھر باہر پھیلی دھندلی روشنی میں نہ اُس نے انار کلی یعنی اپنے محسن کی بیٹی شاردا کو دیکھا اور شاید انار کلی نے بھی اپنے ڈرامہ نگار و ہدایت کار کو کھسک کر نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔

یہ سب ایک فلیش بیک کی طرح اُس کو آج گرین روم کے ایک کونے میں بیٹھ کر کھلی آنکھوں کے سامنے آتا رہا اور پلک بند ہوتے ہی آنسو کے چند قطروں کے ساتھ ڈھل کر غائب ہوتا رہا۔

اچانک اُس کے کانوں میں اپنے مرحوم دادا کا ایک نغمہ گونجنے لگا۔

آغا حشر کے لکھے ہوئے اشعار وہ اکثر گنگنایا کرتے تھے:

تم اور فریب کھاؤ بیانِ رقیب سے
تم سے تو کم گلہ ہے، زیادہ نصیب سے

وہ بھی دبے دبے لہجے میں غزل کے اور اشعار گنگناتے ہوئے جب فرش پر گرے بکھرے پڑے اپنی اسکرپٹ کے اوراق اُٹھا رہا تھا تب بار بار اُس کا موبائل بجتا رہا۔ اُس کا محسن مایوس تھا جبکہ سبھی جانے پہچانے، انجانے لوگ پروگرام دیکھ کر بہت خوش تھے کیونکہ پرانے فلمی گانوں کے ری مکس دیکھ دیکھ کر جب لوگ اوب جائیں گے تب نئے گانوں کو تواریخی گیٹ اپ میں دیکھنا ناظرین پسند کریں گے۔ وہ اُس کے نئے تجربے کو تاجرانہ کسوٹی پر پرکھ کر اُس کو بے شمار کانٹریکٹ پیش کر رہے تھے۔ مگر وہ گرین روم میں تنہا بیٹھا رہا اور گنگناتا رہا۔

برباد دل کا آخری سرمایہ تھی اُمید
وہ بھی تو تم نے چھین لیا مجھ غریب سے!

وہ موبائل بند کر چکا تھا اس لیے وہ تنہائی میں تنہا بیٹھا فرش سے سمیٹے ہوئے اوراق کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اُس کی گود میں ایک مردہ بچہ تھا۔ جانے کیا سوچ کر اُس نے اوراق کو پھر فرش پر رکھ دیا اور پنکھے کی ہوا سے وہ سارے کمرے میں بکھر گئے مگر پنکھا چلانے والے نے پنکھا فوراً بند کر دیا اور چار ہاتھ اوراق کو سمیٹنے لگے۔ اُس نے سوچا شاید صفائی کرنے والے ملازم ہوں گے۔

دراصل اشکوں کی وجہ سے اس کی نظر دھندلا گئی تھی۔ اسکرپٹ کو اکٹھا کر کے ترتیب دینے والا اُس کا محسن تھا جو اپنی بیٹی شاردا کے ساتھ اُس کو تلاش کرتے کرتے گرین روم میں پہنچ گئے تھے۔ تینوں خاموش تھے اور فرش پر بیٹھے ہوئے گویا ایک ریلوے پلیٹ فارم پر تینوں ایک ہی مقام پر جانے کے لیے ریل گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔

اور تینوں کی کیفیت ایک جیسی تھی۔ یعنی اُمید کے ساتھ ایک بہت ہی کٹھن سفر کا احساس! کچھ کر پانے کا جذبہ اور ناکامیابی کا خدشہ۔ تینوں گئی رات تک گرین روم میں بیٹھے رہے!!

OO

کریش کورس

ہمارے اس مخصوص کریش کورس میں شامل ہوئے تمام حاضرین کا میں خیر مقدم کرتا ہوں!
ہندو کو رام رام، مسلمان کو سلام—— وغیرہ وغیرہ نہیں کروں گا کیونکہ یہ نہ تو گروکل ہے اور نہ کوئی مدرسہ! یہ ایک کوچنگ سنٹر ہے جہاں مقصد کی خاطر مطلب کی باتیں بتائی یا سمجھائی جاتی ہیں اور پھر اپنی منزل پالینے کی خاطر صحیح راستہ دکھایا جاتا ہے۔ یعنی تدبیر کی مدد سے اُس چوراہے تک لے جاتے ہیں جہاں تقدیر انگلی پکڑ کر خوش بخت لوگوں کو اُن کی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے! اب کس کو کیا ملتا ہے وہ مقدّر کی بات ہے! نہ میں کوئی چمتکاری بابا ہوں اور نہ کوئی کرشماتی تانترک ہوں۔ میں ایک آئینے میں معاشرے کے جو عکس دیکھتا رہتا ہوں وہی دیکھ کر مختلف کریش پروگرام بناتا رہتا ہوں۔ ایک حجام کو ہیئر ڈریسر، ایک درزی کو ڈریس ڈیزائنر یا ایک باورچی کو کسی پانچ ستارہ ہوٹل میں صاف وشفاف کپڑے پہنا کر فائیو فگر سیلری دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔

اس بار عام روش سے ہٹ کر یہ سیاست کے بارے میں کریش کورس آپ کے ہی پُرزور اصرار پر شروع تو کیا ہے مگر یہ میں کہنا چاہوں گا کہ میں نہ ارسطو ہوں نہ کنفیوشش ہوں اور نہ چانکیہ پنڈت ہوں! میں آپ کی طرح ایک انسان ہوں۔ ہاں فرق یہ ہے کہ میں ایک غرض مند انسان ہوں جبکہ آپ سب خودغرض انسان ہیں! اپنے دشمن کو، رقیب کو، حریف کو یا حلیف کو کسی کو بھی جائز یا ناجائز طریقے سے، عیاری سے، مکّاری سے، شاطر بن کر یا قاتل بن کر اُس کا وجود مٹانے کی سعی کرتے رہتے ہیں اور میری بدبختی ہے کہ میرے شاگرد کوروں بھی ہیں اور پانڈو بھی! لیکن میں دُرون آچاریہ نہیں ہوں کیونکہ میں کوروں کا ساتھ دے کر کوروکھیتر کے میدان میں کود کر اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے دکھاتے ممبر پارلیمنٹ یا منسٹر بن کر خودکشی نہیں کرسکتا! میں عام لوگوں کو روزگار دلانے کے لیے اپنا یہ اسکول بند تو نہیں کرسکتا نا؟

جی ہاں، تھوڑی چالاکی بھی کرتا رہتا ہوں۔ آپ لوگ ایک ہی ہال میں بیٹھ کر، اسمبلی یا پارلیمنٹ میں پہنچنے سے پہلے، یعنی جنگ سے پہلے ایک دوسرے کو پہچان نہ سکیں اس لیے ہال میں اندھیرا ہے۔ ہاں! آواز سے انسان کی پہچان ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کریش کورس کے اس حصے یا سیگمنٹ میں نہ کوئی بولے گا اور نہ کسی تازہ ترین سیاسی سانحے کا حوالہ دے کر مجھے ٹوکے گا! کیونکہ جو کوئی بھی پہچانا جائے گا وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی چلائے گا۔ پھر ایک پارٹی کو، حسبِ ضرورت یا واقعات کے مدنظر چھوڑنا پڑے تو؟ تو کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟ نہیں! کیونکہ آپ کی شخصیت پر ایک داغ بلکہ دھبہ لگ جائے! ہاں پہلی مجلس کے خاتمے پر سبھی اپنے اپنے سوال لکھ کر میز پر رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے ملازم تمام کاغذ کے اوراق جمع کر کے مجھے دیں گے اور میں سوال پوچھنے والے کا نام خفیہ رکھ کر دوسرے سیگمنٹ میں ہر سوال کا جواب دوں گا۔

ہاں، کریش کورس شروع کرنے سے پہلے میں آپ سے اس بات کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو نقاب پہن کر آنا جانا پڑا ہے اور شاید پڑے گا۔ میں مانتا ہوں کہ کورو اور پانڈو نقاب پہن کر ایک دوسرے کے قریب سے گزرنے میں گریز نہیں کیا کرتے تھے لیکن اُس زمانے میں سورج کے غروب ہوتے ہی کوئی کسی پر حملہ نہیں کیا کرتا تھا، جبکہ آج کل سبھی اُس سمے کا انتظار کرتے رہتے ہیں جب وہ حملہ کر کے اپنی جیت کا اعلان کر سکیں! آج کل تو لوگ جنازوں اور ماتمی جلوسوں پر بھی تاک میں بیٹھ کر حملے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں یا پھر سیاست کی کوئی چال کھیل بیٹھتے ہیں۔ کیوں؟ اپنے فائدے کے لیے! جیت کے لیے! جمہوریت میں جیت نصیب ہوئی تو سمجھ لیجیے کہ جنت میں داخلہ مل گیا اور عیش و عشرت کے ساتھ عزت، شہرت اور بے تحاشہ دولت مل جاتی ہے! تاجرانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو لگائی ہوئی رقم موٹی موٹی رقوم لے کر آتی رہتی ہے۔ گویا کانٹا و جیل مچھلی کو بھی پھانس کر لے آتا ہے! نرالا کھیل جو ٹھہرا!

جی ہاں! سیاست ایک کھیل ہی تو ہے مگر انوکھا کھیل! نہ بساط کی ضرورت اور نہ چہروں کی نقل و حرکت پر نگاہیں مرکوز رکھنے کی ضرورت! بلکہ شطرنج کے کھیل کے گھوڑے کے ڈھائی قدم سے ڈرنے کی ضرورت!

سیاست کا کھیل کھیلنے کے لیے حدود محدود نہیں ہیں۔ چاہو تو دنیا کو اپنا میدان بنا لو۔ چاہو تو ایک وسیع میدان کو سمیٹ کر اپنی مٹھی میں بند کر لو! یا پھر اپنی انگلی رموٹ پر رکھ کر ایک کھوئی ہوئی

جیت کو ایک دہشت گرد کی آنکھ سے دیکھ لو!

سیاست کے کھیل میں کوئی رولز نہیں ہوتے اس لیے کسی ریفری یا امپائر کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کسی بھی قسم یا طریقے کے تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! کھیل سے باہر نکالنے والا کوئی نہیں تو! پھر! لگے رہو۔ لگے رہو۔ سبکدوش ہونے کی ضرورت نہیں! ہاں اگر مر گئے تو؟ اچھے باغبان خوبصورت گلاب کی قلمیں پہلے سے ہی زرخیز زمین میں لگا کر رکھتے ہیں اور باغبان کے قدردان کونپلوں میں ہی اپنے قائد کا نیا جنم دیکھ کر اپنے آپ کو بے سہارا نہیں سمجھتے! بیٹا باپ کی جگہ لے تو کیا بُرا ہے؟ جلال الدین اکبر کے بعد نورالدین جہانگیر یعنی ولی عہد ہی تو ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا تھا نا؟ ارے بھائی یہ تو حکومت کرنے والے صدیوں سے کرتے آئے ہیں! اور پھر آزمودہ فارمولے ہی تو مشکل کشا ثابت ہوتے آئے ہیں۔ اب آپ لوگ پوچھ سکتے ہو کہ کیا بھگوان شنکر کے انتقال کے بعد ان کا جانشیں گنیش ہوگا یا کارتک؟ تو جواب ہے کوئی نہیں! کیونکہ بھگوان خود مرتا نہیں ہے اور اگر وہ مر جاتا تو اپنے بیٹوں کا گدّی کے لیے سنگرام دیکھ کر دنیا کے تمام انسانوں کے دماغ میں حکمران بن جانے کی خواہشات کا گرے میٹر میں نہیں ڈالتا۔ ہٹلر کے دماغ میں ضد کا وہ بیج نہیں ڈالتا جس کی وجہ سے اُس نے اپنی کتّے کی کاٹ کھائی ٹانگ پر بعد میں مرہم پٹی کروائی تھی اور پہلے اپنے گھر جا کر اپنی بندوق لا کر اُس کتّے کو گولی ماری تھی جس نے اس کو لہولہان کر دیا تھا! سکندر، نیپولین اور جارج بش کو فاتحِ عالم بن جانے کی قلمیں تو دنیا بنانے والے نے خود ہی تو اُن کے دماغ میں لگادی تھیں بلکہ اُن کی پیدائش کے ساتھ ان کی ہاتھوں کی لکیروں میں یہ حقیقت نمایاں کی تھی! سیاست کی کہانی ایک ہی ہے۔ نجومی ستاروں کی گردش دیکھ کر بیان کر دے۔ داستان گو حکایتوں کا سہارا لے کر بیان کر دے یا کوئی بے بس تماشائی اپنی حقیقی زندگی کا عبرت ناک تماشہ بیان کر کے عیاں کر دے۔ یہ سیاست ایک دلچسپ کھیل ہے۔ ٹام اور جیری جیسا بچوں کا ایک کارٹون شو مگر سیاست دانوں کے لیے ایک رہنمائی کرنے والا شو! چوہا اور بلّی جب دوست بن جاتے ہیں، وقتی طور پر ہی، چوہا اپنے نوکیلے دانتوں سے دشمن کی مضبوط پھاٹکیں کُتر کُتر کر قلعوں کے اندر جانے کے راستے بنا دے گا جبکہ بلّی اندر جا کر اُتھل پتھل کر کے گھر والوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر اپنا مشن پورا کرے گی! ہندو اور مسلمان جاہل انسان بن کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو کر فسادات کو جنم دیں گے۔ سرحدوں کے جھگڑے ہوں گے، جنگیں ہوں گی۔ ان آخری

جملوں پر بھی شر کا خاص دھیان دیں تو یقیناً فائدہ ہوگا۔

کہتے ہیں کہ موم کے پَر لگا کر کوئی اُڑ نہیں سکتا، کیونکہ سردیوں میں پَر اکڑ کر حرکت نہیں کر سکتے۔ اس لیے پرندوں کی طرح انسان اُڑ نہیں سکتا۔ گرمیوں میں موم پگھل کر اُڑان کے قابل ہی نہیں رہتے۔ گرمیوں میں موم پگھل کر اُڑان کے قابل ہی نہیں رہتے اس لیے آپ خود پَر لگا کر شاہین بن جانے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ کوروں کی طرح موم کا ایک محل بنا کر پانڈوں کو زندہ جلانے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ آج کل تو موم کا محل بنانے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ فدائین کو اندر دھکیل کر آہنی دیواروں کو مکھن کی طرح پگھلتے ہوئے دیکھ کر ہمیں خود بھی یقین نہیں آتا ہے کہ ہسٹری بدل گئی ہے یا جغرافیہ۔ یا پھر ہمیں ہی فوجی قیدیوں کی طرح کسی بیاباں میں ٹھہرایا گیا ہے! وہ بھی پوچھ تاچھ کے لیے یا پھر اذیتوں کے ایک نئے دور کے لیے!!

ایک عقیدے سے تعلق رکھنے والے مفکروں کا فرمانا یہ ہے کہ کسی گنہگار کو سزا دینا ایک گناہ ہے۔ یعنی It is a sin to call a person a sinner یعنی جب کسی کنڈلی میں لکھا ہے کہ بچہ دوسرا چنگیز خاں بنے گا تو وہ وہی کرے گا نا جو کرنے کے لیے دنیا بنانے والے نے اس کو جنم دیا۔ اس لیے اگر کوئی سیاست داں اپنی رکھیل کو قتل کرتا ہے تو پھر اس نے خود کچھ بھی تو نہیں کیا بلکہ اس کا جنم ہی اسی لیے ہوا تھا۔ لیکن ذی ہوش انسان اوتاروں اور پیغمبروں کے حوالے دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ گنہگار شیطان ہوتے ہیں۔ ایک آدم خور کو گناہ کرنے سے پہلے بھگا دو یا موت کے گھاٹ اُتار دو، کیا معلوم شیطان کو ختم کرنے کے لیے کائنات کی حفاظت کرنے والے نے آپ کو دھرتی پر بھیجا ہو۔

آپ اپنے آپ سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کا جنم کس لیے ہوا ہے؟ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے اس کا فیصلہ کرنے کی خاطر زندگی دینے والے نے ہر انسان کو سوچنے سمجھنے کے لیے ایک دماغ سے نوازا ہے۔ اگر ایک درخت میں بھی دماغ ہوتا تو شاید وہ اشاروں سے لکڑہارے سے اپنی زندگی کی بھیک مانگتا!

خیر میں چونکہ اپنے اصولوں کا غلام ہوں اس لیے تمہید باندھ کر اپنا یہ مخصوص سیاسی کریش پروگرام بلکہ کورس اب شروع کرتا ہوں۔ اس لیے آپ کا اجرت کا میٹر شروع ہوتا ہے۔

ایک سیاست داں بننے کے لیے، چاہے آپ کسی اونچے عہدے سے سبکدوش ہو کر آئے

ہوں، نوکری، اچھی یا بُری، چھوڑ کر آئے ہوں، یونیورسٹی یا کسی پروفیشنل کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے ہوں، کسی لوور کلاس یا اَپر کلاس کی تنظیم کے اہم رکن ہوں یا شوقیہ سیاست میں حصہ لینے آئے ہوں یا پھر جیسے کسی فلمی ایکٹر کا بیٹا کسی ایکٹنگ اسکول میں داخلہ لے کر، ایک مہینے کا کریش کورس کرنے کے بعد ہیرو بن کر پہلی بار اسٹوڈیو میں جاتا ہو۔ ویسے ہی آپ کسی جانے مانے لیڈر کے بیٹے ہوں اور بدیش میں رہنے کی وجہ سے ہم سے کچھ ٹپس لے کر اعتماد کے ساتھ سیاست میں قدم رکھنا چاہتے ہوں تو غور سے اپنے کوچ کی باتیں سنتے رہو تو یقیناً فائدہ ہوگا۔

لباس آج کل کے دور میں ایک پہچان ہے۔ ٹی وی پر اگر مشہور و معروف چیف بھی آتا ہے تو وہ فخر سے باورچیوں کا لباس پہن کر آتا ہے۔ ماضی میں یہ لوگ اپنے گھر والوں کے بھی سامنے اپنے مخصوص لباس میں آتے ہوئے احساسِ کمتری کے بوجھ کے نیچے دبے دبے سے نظر آیا کرتے تھے اس لیے آپ سب سفید رنگ کا کُرتا پہنا کریں۔ پاؤں میں چپل، سر پر ٹوپی، چہرے پر واقعات سے مطابقت رکھنے والے تاثرات!

بغل میں ایک اخبار اور کندھوں پر لٹک رہا ایک معمولی بیگ، جس میں اگر آپ چاہیں تو ساتھ چلنے والوں کے کپڑوں سے آرہی پسینے کی باس سے بچنے کی خاطر ایک عطر کی اسپرے بوتل بھی رکھ سکتے ہیں، چند ٹافیاں رکھ سکتے ہیں جو وقتاً فوقتاً منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کام آئیں گی۔

جب آپ کسی گاؤں میں جائیں تب جان بوجھ کر کیچڑ سے اپنے کپڑے اور خاص طور پر چپل پر لگی ہوئی گندگی کا مظاہرہ کریں تاکہ آپ گاؤں کی خستہ حالت کے بارے میں اپنے پریس سکریٹری کی لکھی ہوئی تقریر جذباتی انداز میں پڑھ سکیں یا رٹ کر بول پائیں اور یوں اپنے مسیحا ہونے کا اعلان کریں! لوگوں سے میل جول بڑھانے کی خاطر بستی کے چند بہت ہی گندے کپڑوں میں ملبوس بچوں کو گود میں اُٹھا کر اُس کی بہہ رہی ناک اپنی رومال سے صاف کریں اور اس دوران اپنی اُبکائیوں پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ کامیاب نہیں ہوئے تو تھکان کی آڑ میں اپنی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کریں اور یوں اپنا عکس ہر ذہن پر چھوڑ کر لوٹیں مگر جاتے جاتے دو چار پس ماندہ گھروں میں گھس کر گاؤں والوں کو اپنائیت کا احساس دلا کر ساتھ ساتھ چل رہے میڈیا کے لوگوں کو اپنے عزم کی بلندی کا یقین دلائیں۔ یہ بہت ضروری ہے! دراصل یہ بناوٹ اور اُس کی دکھاوٹ ہی آج کی سیاست کا اصلی رنگ ہے۔ جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تب ماسٹر جی نے بتایا تھا کہ

پانی کا اپنا کوئی رنگ نہیں، کوئی رُوپ نہیں، اونچائی سے گر جائے تو آبشار کہلاتا ہے، پہاڑی علاقے میں ندی کے چھوٹے بڑے پتھروں سے ٹکراتا، اُچھلتا، شور مچاتا بہتا رہتا ہے اور پھر میدانی علاقے میں سست رفتار سے بہتا رہتا ہے۔ گویا جوانی کا جوش ٹھنڈا ہو کر بوڑھاپے کے ساتھ ہم قدم، ہم نفس اور ہم نوا ہو گیا ہو۔ یہ ایک فطری عمل ہے مگر آج کی سیاست میں قدرت کی اس جان بخش نعمت کا بھی استعمال کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے کیونکہ پانی کے بغیر اناج پیدا نہیں کیا جا سکتا اور پانی کے بغیر کھانا پکایا نہیں جا سکتا۔ پانی پئے بغیر پیاس بجھائی نہیں جا سکتی! پانی کے بغیر مُردوں کا انتم سنسکار بھی تو نہیں کیا جا سکتا! خیر چھوڑو ان فلسفوں کی باتوں کو اور اس پریکٹیکل سوچ کے تحت پانی پر قابض ہو کر عوام کو ایک کٹوری میں لے کر ایک چمچے سے امرت پلاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بیماریوں کے گرداب میں پھنس جائے تو گٹر کے پانی سے ان کو یعنی مریضوں کو پلا کر اَرتھی پر بٹھا دیں۔ ہاں مگر ان کی استھیاں گنگا کے پانی میں ڈال کر جانے والوں کو جنت جانے کی ٹکٹوں کے علاوہ غیر معیاری ویزا بھی دے دیں کیونکہ یہی سیاست ہے۔

ہاں ہاں! ایسی باتیں مجھے خفیہ طور پر کرنی چاہیے تھیں۔ مگر دوڑ میں حصّہ لینے والوں کو بھی تو ایک ساتھ دوڑنے کا اشارہ دیا جاتا ہے۔ پھر جو ریس جیت کر تاج پہن لیتا ہے وہی تو سکندر کہلاتا ہے۔ پانی پر کوئی لکھ نہیں سکتا ہے اس لیے چلّو بھر پانی میں ڈوبنے والے بھی اہلِ ساحل کو حقیقت بتا نہیں سکتے؟ ہاں ان کے لہو سے پانی کا رنگ لال ہو جائے تو انقلابیوں کے شہید ہونے کی اطلاع کہہ کر اپنی پارٹی کے شہدا کے اعداد و شمار میں شامل کر کے اپنے دشمنوں پر قتلِ عام کے الزامات لگاتے رہو! عوام کنفیوز ہو جائے گی لیکن ووٹ دینے کے بعد! تحقیقاتی کمیشن بھی کنفیوز ہو جائے گا کیوں کہ چشم دیدہ گواہ مقتول ہوں تو قاتلوں کی شناخت کون کرے گا؟ خیر عقل مندوں کو اشارہ دے چکا ہوں مگر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کرو، سوچ سمجھ کر کرو۔ کسی اسکرین پلے رائٹر کو اعتماد میں لے کر کرو۔ وہی تو بتا سکے گا کہ واردات کے بعد کیا کیا ہو سکتا ہے۔ اس لیے کچھ کرنے سے پہلے امکانات کو سامنے رکھ کر اپنی سیاسی چالیں چلو! حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا کہ آپ کا اُستاد کون ہے؟ لقمان نے کہا تھا 'ایک بے وقوف! کیونکہ وہ جو کرتا ہے میں وہ نہیں کرتا ہوں'۔ اس لیے اگر کوئی لیڈر رشوت لیتے ہوئے کیمرے میں قید ہوتا ہے تو آپ رشوت لینے کا کوئی جدید طریقہ کھوج لیں یا پھر ایجاد کر لیں! اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا ہوں مگر ملک کی تازہ

ترین سیاسی پارٹیوں میں داخلے کے لیے اور بعد میں وہاں جمے رہنے کی خاطر جیسی چاپلوسی اور شخصیت پرستی کی ضرورت ہے اس کے لیے ہم ایک اور کریش کورس شروع کر رہے ہیں۔ضرورت مند ممبران ہم سے فوراً رابطہ قائم کر لیں۔ یقیناً ہمارے ایجاد کیے ہوئے قصیدوں سے ان کو فائدہ ہوگا۔آپ سب شائستگی کو نظرانداز کر کے یا تو سرگوشیوں میں باتیں کرنا سیکھ لیں اور آپ کو پارلیمنٹ میں یا اسمبلی میں بآواز بلند چیخنا یا چلّانا ہے تو اس کے لیے کسی ہل اسٹیشن، جہاں آپ اکثر تفریح کے لیے جاتے رہتے ہیں، وہاں صبح سویرے پہاڑوں تک اپنی آواز پہنچانے کا ریاض کرتے رہیں۔ ہو سکے تو اپنی تہذیب کو مسخ کر کے بیہودہ کلام بولنے کی مشق کرتے رہیں۔آج کل لنگویج ہی ایسی چل رہی ہے، نہ بولو گے تو لوگ سمجھیں گے کہ آپ مرحوم لال بہادر شاستری کے دور میں چلے گئے ہو۔یعنی آپ کو وقتِ حاضرہ سے چالیس سال پہلے سیاست میں آنا چاہیے تھا۔ہاں آپ غنڈوں اور ڈونوں کے بغیر اپنے کارواں کو آگے کیسے لے جا سکیں گے جبکہ آپ کے سیاسی دشمنوں نے اپنے کارواں میں دوسری ریاستوں کے نامی قاتلوں اور بدیش میں پناہ لے کر اپنے دیش میں افراتفری و فسادات کرانے والوں کو اپنے کاروانوں کی حفاظت کے لیے اپنی پارٹیوں میں شامل کیا ہے بلکہ غریبوں کے ہمدردوں و یکسانیت کے حامیوں نے بھی لال انقلاب کے لیے بندوق والوں کی حمایت حاصل کی ہے۔یعنی جہاں جوشیلی تقریریں بے کار ثابت ہوں وہاں آگ کارآمد ہو سکے۔ ہاں اگر آپ میں کوئی ان کے خیالات سے متاثر ہوں، میرا مشورہ ہے کہ اپنی یکسانیت کے خیالات کا مظاہرہ کرنے کے لیے سفید پگڑی کو بے ترتیب ڈھنگ سے باندھنے کی بجائے عوام کو لادینی کا پیغام دینے والی پگڑی کو ترک کر دیں جیسے مرحوم بمبودھری پد نے اپنا جنیو جلا ڈالا تھا اور جب انسان کو انسان سمجھتے ہیں تو اقتصادی برابری کی بجائے ریزرویشن کی وکالت نہ کریں۔

آخر میں اپنے کریش کورس میں شامل تمام ممبران کو یہ رائے دینا چاہوں گا کہ وہ سب وہی غلطیاں نہ کریں جو موجود سیاست داں اب تک کر چکے ہیں۔مثلاً خود کو ایک غریب گوالا بتانے والا اگر ایک ڈیری فارم کھول کر دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی بن جاتا ہے تو اُس کی ریاست میں اور کتنے لوگوں نے دودھ بیچ کر کروڑوں کما لیے ہیں۔کیا ان کی سرکاری ڈیری فارموں نے بھی ریاست کو کروڑ پتی بنا دیا ہے؟ اس لیے اگر یہ سوچ کر سیاست میں آنا چاہتے ہیں کہ اگلے چند برسوں میں وہ بھی کروڑ پتی بن جائیں گے تو ان کو چاہیے کہ وہ آج سے کہنا شروع کر دیں کہ ''پدرم سلطان بود''

یعنی ہم آزادی سے پہلے ہی لکھ پتی تھے یا ہمارے پڑدادا انگریزوں کی حکومت میں ایک جیلر تھے!

ہمارے کریش کورس کا پہلا حصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ تین گھنٹے بعد کورس کا دوسرا سیشن شروع ہو جائے گا۔ ابھی سبھی کو حفاظت سے بغیر ایکسپوزر کے ایک ایک کر کے ہال سے باہر لے جانے کا انتظام کیا گیا ہے تا کہ بڑا بھائی نہ جان سکے کہ اُس کی بہن — بیٹا نہ جان سکے کہ اس کا بارسوخ باپ — کرشن نہ جان پائے کہ اگلے الیکشن میں سُداما اس کو کانٹے کی ٹکر دے رہا ہے۔

اگلے سیشن میں شرکت کرنے کے لیے کوئی نہیں تھا تو کوچ گئی رات تک سوچتا رہا کہ اس بڑے ملک کی سیاست کی اتنی سی کہانی ہے!

○○

انوکھا پیار

سچ تو یہ ہے کہ نریندر پنڈت نہ تو میرا بائی کا گردھر گوپال تھا اور نہ ستی ساوتری کا ستیہ وان۔ وہ ایک مریض ہے۔ جس کا ہر سانس ایک کشمکش کا محتاج ہے۔

اس کی وفاداری بیوی نرملا اُس کی کشمکش کو آسان کرنے کی خاطر پچھلے پانچ سال سے اپنی عقیدت کے بل بوتے پر گویا ملک الموت سے ایک جنگ لڑ رہی ہے۔ وہ بھی پچھلے چند مہینوں سے ایک بلند عزم کے ساتھ دن رات پوجا پاٹھ کی طاقت سے ایک تنہا تیر انداز کی طرح اپنے ترکش میں رکھے تیروں کو استعمال کر چکی ہے۔ جو تنہا تیر اُس نے بچا کر رکھا تھا، آج اُس کا استعمال کر کے علی الصبح زبردست برف باری میں ننگے پاؤں چل کر اُس آشرم میں پہنچ گئی تھی جہاں کئی دنوں سے ایک کراماتی سنیاسن ست سنگ کرتی رہی تھی، چونکہ اُس کی نظریں سنیاسن کے گیروی وستروں پر جمی تھیں اس لیے وہ اپنے بچپن کی سہیلی سرلا کے چہرے کو نہیں دیکھ پائی تھی مگر سرلا ماں نے اُس کو پہلی ہی نظر میں پہچان کر نام لے کر آواز دی تھی۔

نرملا اِسے سنسنی خیز واقعہ سمجھ کر اپنی عقیدت کی دھند میں سرلا کا چہرہ دیکھنے کے بجائے سنیاسن کے پیر پکڑ کر اپنے پتی پرمیشور کی صحت یابی کے لیے سسک سسک کر فریاد کرتی رہی اور جب کرشماتی سنسیاسن، جو چھو کر تاثیر مسیحائی روح تک پہنچانے کے لیے مشہور ہے، نے فوراً اُس کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی تب نرملا کو اپنی جیت کا بگل سنائی دیا اور وہ دُشوار سفر کے باوجود سرلا کی اذیت ناک حالت کو نظر انداز کر کے ویسے ہی باتیں کرتی رہی جیسے وہ تیس سال پہلے کیا کرتی تھی اور یوں نریندر کے بارے میں ایک پہاڑی ندی کی روانی کی طرح بغیر رُکے بولتی رہی۔ سرلا کچھ پوچھ بھی لیتی تو وہ ندی کے شور کی طرح اُس کی آواز کو دبوچ لیا کرتی تھی۔

تب سرلا نرملا کی باتیں سنا کرتی تھی فقط اس لیے کہ گفتگو کے دوران اُس کی نظریں نریندر پر جمی رہتی تھیں یا پھر اُس کو تلاش کیا کرتی تھیں۔

تینوں ایک ہی کالونی میں رہا کرتے تھے۔ نرملا کے گھر میں دولت کی بہتات تھی جبکہ سرلا کے گھر میں علم کا نور تھا اور نریندر کے والد ایک افسرِ اعلیٰ تھے۔ فنونِ لطیفہ کے قدردان جن کے گھر میں فلمکار، چتر کار، صداکار اور ملک کے مایۂ ناز فنکار بطور مہمانِ خصوصی آیا کرتے تھے اور نریندر کی زندگی میں ہلچل مچایا کرتے تھے۔

نرملا نے پہلی ہی نظر میں نریندر کو اپنے سپنوں کا راجکمار سمجھ لیا تھا۔ جب بھی کوئی رامائن پڑھا کرتا تب وہ اپنے آپ کو سیتا اور نریندر کو رام سمجھ بیٹھتی تھی اپنی دادی سے دھارمک و طلسمی کہانیاں سنتے سنتے کبھی وہ اپنے آپ کو رادھا سمجھنے لگتی، کبھی شکنتلا اور کبھی سفید پروں والی پری سمجھ کر اکثر نریندر کے اِرد گرد منڈلاتی رہتی تھی۔

ایسا کرنا اُس کے کسی عیب کا تاثر تو نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ ایسی بچکانہ حرکتیں وہ اپنے ہی بنائے ہوئے دائرے میں رہ کر عادتاً کیا کرتی تھی۔ دراصل وہ بچپن ہی سے اپنی دادی کی سنائی ہوئی کہانیوں میں اپنے آپ کو نہ صرف ایک کردار سمجھ بیٹھی تھی بلکہ وہ کردار اُس کی سوچ سمجھ پر بھی حاوی رہا کرتا تھا۔ ایسی ہی کیفیت کے زیر اثر وہ نریندر کی لمبی اور جان لیوا بیماری کے دوران خود کو ساوتری سمجھنے لگی تھی۔

یوں تو نریندر اکثر نرملا کے گھر جایا کرتا تھا مگر فقط اُس کے گھر میں ہو رہے بھجن کیرتن یا جگ راتوں میں شامل ہونے والی اپنی بیمار ماں کا ساتھ دینے کی خاطر! اُس کو نرملا سے زیادہ سرلا میں دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ دُور دُور بیٹھے ہوئے بھی وہ آنکھوں آنکھوں میں سوال وجواب کیا کرتے تھے بالکل ویسے ہی جیسے وہ پاس پاس بیٹھ کر پڑھائی کی آڑ میں ایک دوسرے کے دل کے تاروں کو چھو کر ایک دوسرے کو بے ساز و آواز چاہت کے نغمے سنایا کرتے تھے۔

دونوں ایک ہی قابل سائنس ٹیچر جانکی ناتھ کے پاس صبح سویرے پرائیویٹ ٹیوشن لینے کی خاطر جایا کرتے تھے کبھی جاڑے کی کڑکتی سردی میں اور کبھی زبردست برف باری میں دونوں ساتھ ساتھ بیٹھا کرتے اور ایک ہی کانگڑی پر ہاتھ رکھ کر انگاروں کی تپش سے زیادہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو چھو کر پیدا ہوتی سہانی آنچ سے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں کی تھرتھراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ سرلا کا باپ مرکزی سرکار کا ایک اعلیٰ آفیسر تھا اور وہ کالونی کے سرکاری بنگلے میں رہا کرتے تھے اس لیے دو ذہین اسٹوڈنٹس کے درمیان اجنبیت کا فاصلہ اپنائیت کے احساسات کی تیز گامی نے بہت جلد طے کیا کر لیا تھا، مگر وہ دل کی باتیں مختلف سبجکٹس کی آڑ میں کیا

کرتے تھے کیونکہ ماسٹر جی کی نظریں راڈر کی طرح گردوپیش کا جائزہ لیا کرتی تھیں۔اس لیے پہلا پہلا پیار وہ رنگ کبھی نہ لا سکا جو عام طور پر کالج کے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو متاثر کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔

دونوں اپنی پڑھائی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیا کرتے تھے کیونکہ سرلا ڈاکٹر بننا چاہتی تھی جبکہ نریندر اپنے باپ کی طرح آئی اے ایس افسر بننا چاہتا تھا اس لیے وہ چار سال ایک ساتھ رہنے کے بعد بچھڑ تو گئے تھے لیکن پھر سے ملنے کی خاطر کیوں کہ وہ سمجھ بیٹھے تھے کہ منزل، راستہ ایک اور ہم سفر، ہم نفس، ہم نوا ایک... دونوں کا پیار انوکھا تھا لیکن...

سرلا کے ابا کے تبادلے کے ساتھ ہی دونوں گویا کھو گئے۔ کھلے آسمان کے نیچے دور دور تک پھیلی زمین پر۔ کچھ اپنی غفلت کی وجہ سے اور کچھ بدلتے حالات کی وجہ سے اور پھر پانچ سال بعد جب سرلا نے امریکہ جانے سے پہلے نریندر کے بارے میں نرملا کو فون کیا تھا تو کسی نے اُسے بتا دیا تھا کہ نریندر کی بارات نرملا کے گھر پہنچ گئی ہے۔

یہ تقریباً تیس سال پہلے گزری ایک ایسی کہانی تھی جس کے بارے میں نہ کسی نے تب کسی سے کچھ کہا تھا اور نہ اب نریندر کو کچھ یاد تھا۔اگر کسی بزرگ کو ایک دسویں فیل لڑکی اور ایک آئی اے ایس آفیسر کی غیر متوقع شادی کے بارے میں یاد تھا تو فقط اتنا کہ اِندرلوک سے اُتری ایک اپسرا کو جب اُس کا من بھایا راجکمار نہیں ملا تب اُس نے راجکمار کی تصویر سینے سے لگا کر خود کو شعلوں کے حوالے کرنے کی خواہش یہ کہہ کر ظاہر کی تھی کہ بھگوان رام سیتا کو اپنانے سے پہلے اگنی پریکشا لینا چاہتے ہیں۔ضدی بیٹی کے امیر باپ نے جیسے تیسے اُس کی یہ خواہش پوری کرنے سے پہلے اُس کی ضد پوری کی تھی۔

نرملا آج بھی ویسی ہی ہے جیسی وہ پہلے تھی یعنی کتھارسز کی شکار — بہت ہی خوبصورت، باوقار، باتونی۔ بات سے بات جوڑ کر ایک نئی بات پیدا کر کے اپنی خوبصورتی کا ذکر کرنا۔ اگلے کی ہر بات کاٹ کر اپنی باتوں کو تمہید باندھ کر جاری رکھنا، واقعات، حالات، حسرت یا صدمات کا اپنے نقطۂ نگاہ سے جائزہ لینا وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ سرلا اُس کی باتیں سن کر ہوں ہاں، اُف آہ وغیرہ ہی کیا کرتی تھی کیونکہ وہ اُس کی بہت ہی پیاری سہیلی تھی اور آج وہ سرلا کو یہ احساس دلاتی رہی کہ وہ اپنے شوہر کے علاوہ اگر کسی سے محبت کرتی تھی یا جس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے تو وہ سرلا ہے۔

سرلا اپنی پیاری سہیلی کی ذہنی کیفیت تب بھی بھانپ لیا کرتی تھی اور اب اتنا سمجھ رہی تھی کہ

نرملا صرف اپنے آپ کو مرکز مان کر اپنی خواہشات کی دوری پر ایک قوس لگانے کی عادی ہے۔ پھر قوس جب ایک دائرہ بن جاتا تو وہ اُس میں خود سما جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک پیاری سہیلی ہوتے ہوئے بھی وہ نرملا کو کبھی یہ نہ بتا سکی کہ وہ نریندر سے بہت پیار کرتی ہے اور وہ بھی اُس سے پیار کرتا ہے۔

شاید نرملا، سرلا سے یہ بھی نہ پوچھتی کہ وہ جوگن کیوں بن گئی ہے، اگر وہ خود اپنی زندگی کی کہانی چند سطور میں نہ سنا دیتی۔ نرملا نے جونہی اُس کو نریندر کی بیماری کے بارے میں بتایا تو وہ جوگن ہوتے ہوئے بھی یوں چونک پڑی گویا اُس پر بجلی گر پڑی ہو۔ اس میں کسی کو کوئی شک نہیں کہ نرملا اپنے شوہر کی بہت سیوا کیا کرتی تھی۔ تن، من دھن سے یہاں تک کہ جب ایک تانترک نے اُس کو اپنے پتی کی صحت یابی کے لیے دس دن تک روز سحر اور شام کا ایک گھنٹے کے لیے ٹھنڈے پانی میں رہ کر کچھ منتروں کا جاپ کرنے کے لیے کہا یا شدّت کی گرمی میں ننگے پاؤں چل کر کسی پہاڑی پر واقع مندر میں بھوکی پیاسی رہ کر پوجا کرنے کے لیے کہا تو اُس نے وہ بھی کیا۔

کسی فقیر نے کہا کہ اپنے شوہر کے اِرد گرد ایک ہزار ایک سو گیارہ بار چکر لگا کر خدا سے یہ دُعا مانگے کہ میں چاہے مر جاؤں لیکن میرا پتی زندہ رہے اور صحت مند رہے تو نرملا نے ویسا ہی کیا۔

نریندر پنڈت ایک بہت قابلِ آفیسر ہوا کرتا تھا بد قسمتی سے اُس کی کار ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی تھی۔ چشم دید گواہوں نے یہ کہا تھا کہ اُس نے اپنے پچھلے جنم میں اچھے کرم کیے تھے جو وہ بچ گیا لیکن جب وہ نہ چل پھر سکا اور نہ بول سکا تو انھی لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ سب پچھلے جنموں کے کرموں کا پھل بھگت رہا ہے۔ نرملا ساوتری کی طرح ستیہ وان کو مہا کال سے دُور رکھنے کی خاطر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھی۔

نرملا اپنے پتی کے لیے سب کچھ کیا کرتی۔ اُس کو خود نہلاتی، کپڑے پہناتی، سوٹ ٹائی پہنا کر اُس کو ویل چیئر پر گھمانے لے جاتی۔ یاروں، دوستوں اور رشتے داروں سے اُس کی ملاقاتیں کرواتی۔ اُس کے دبے دبے یا ذبح کیے گئے جملوں کو سمجھ کر سوالات کے جوابات دیتی مگر وہ اُس کی چند فرمائشیں پوری نہیں کرتی تھی مثلاً وہ اگر غزلیں سننا چاہتا تو وہ بھجن سنانے کی ضد پر قائم رہتی۔ وہ اخبارات، جرائد یا کتابیں پڑھنا چاہتا تو نرملا اُس کو کوئی روحانی سکون دینے والی کتابیں ہاتھوں میں تھما دیتی۔ ایسا تقریباً روز ہوتا۔

نریندر کورے کینوس کو سامنے رکھ کر جونہی اسٹروک لگاتا تو نرملا سمجھ جاتی کہ وہ عورتوں کے

نیوڈ خاکے بنانے جا رہا ہے اس لیے وہ آگ بگولا ہو کر حملہ کر دیتی۔ اُس کے ہاتھ سے برش چھین کر جاپ کے لیے ہاتھ میں مالا تھما دیتی اور دونوں کے درمیان گھمسان کا یدھ شروع ہو جاتا۔ ایک دانشمند اور ایک بے وقوف کی ٹکرار یا پھر ایک احمق اور دانشور کا ٹکراؤ، طعنے، شکوے، شکایتیں، احسانات، احسان فراموشی کے الزامات، خودکشی کرنے کی دھمکیاں بلکہ کوشش کرنے کے واقعات اور پھر پاس ہو کر بھی قربت کا فقدان۔

ایک بے بس بیمار کی شکست اور ایک ضدی حملہ آور کی جیت مگر ایسی جیت جس کے نتائج دیکھ کر فاتح کو جشن کے بجائے ماتم کی دستک سنائی دے۔

ایسے تلخ تجربات نے نرملا کو ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زخمی شیرنی بنا ڈالا تھا اس کے اپنے بھی اُسے غیر سمجھنے لگے تھے۔ اُس کے ہمدرد بھی اُس سے ڈرنے لگے تھے لیکن اچانک دونوں میں تبدیلی آ گئی۔

نریندر دن کو نرملا کے چہرے، اُس کے باوقار جسم اور پرکشش آنکھوں کو دیکھتا رہتا اور رات بھر اُس کے جسم سے لپٹ کر سو جایا کرتا جن کے لیے نرملا جوانی میں ترستی رہتی تھی۔

یہ باتیں نرملا، سرلا کو سناتی رہی اور سرلا اُس کی باتیں یوں سنتی رہی جیسے وہ ایک بیمار کی کیس ہسٹری سن رہی ہو مگر شروع شروع میں کیونکہ بعد میں وہ نریندر کو بحیثیت ایک نیورولاجیکل مریض کے، نریندر کو بحیثیت ایک انسان کے، جس کی نس نس سے وہ واقف تھی، کے بارے میں سوچتی رہی اور اپنی سہیلی کی نان اسٹاپ باتیں سنتی رہی۔ دل ہی دل میں یہ خیال آتا رہا کہ نریندر کیا اس عمر میں بھی وہ کر سکتا ہے جو وہ تب بھی نہ کر سکا تھا جب کئی لڑکیاں، چاہے وہ اُس کے کالج یا اسکول میں ہم جماعتی تھیں، اس سے عمر میں دو سال چھوٹی یا چار سال بڑی محلے کی لڑکیاں!

دبے پاؤں کمرے میں داخل ہونے سے پہلے نرملا نے سرلا کو بتایا تھا کہ پچھلے ایک مہینے سے نریندر کی بدلی بدلی حالت دیکھ کر اُس کو یقین ہو چکا ہے کہ ساوتری نے ستیہ وان کو اپنی بھگتی سے مہاکال کی مضبوط گرفت سے چھڑا لیا تھا اور اچھا کیا تھا جو ایک مہینے سے دوائیاں دینا بند کر دیا تھا۔ وہ خوش تھی کہ اُس کا پتی پوجا پاٹھ نہ سہی بھجن اعتقاد سے آنکھیں بند کر کے سنتا رہتا ہے اور جب آنکھیں کھولتا ہے تب اُس کے چہرے کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہتا ہے۔

نرملا کہے جا رہی تھی: ''پہلے خود کھانا کھانے کی ضد کرتا تھا، میں کبھی کھلانے کی کوشش کرتی تھی تو ناراض ہو جایا کرتا تھا بلکہ غصہ کا اظہار کیا کرتا تھا لیکن جب میں نے دوائیاں بند کر کے ایک سوامی

کے مشورے پر منتروں کا جاپ کرنا شروع کر دیا تب سے لیٹے لیٹے وہ سب کچھ کھا لیتا ہے جو میں منہ میں ڈال دیتی ہوں۔ شام کو میں گیتا پڑھ کے سناتی ہوں تو وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر سو جاتا ہے۔ صبح سویرے جب آنکھیں کھولتا ہے تب ہاتھوں سے ایسی کوئی شریر حرکت کرتا ہے جیسے ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہو۔ اب تم آشیرواد دو گی تو مجھے یقین ہے کہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گا۔"

یہ ساری باتیں بتا کر نرملا نے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے سرلا کو سرگوشیانہ لہجے میں مسکراتے ہوئے یہ کہہ دیا "دیکھ لینا آنکھیں کھول کر وہ مجھے..."

نرملا نے شریر نگاہوں سے سرلا کو دیکھ کر جب نریندر کو جگانے کی کوشش کی تو اُس کی آنکھیں کھلی تھیں اور مٹھی میں سرہانے کا ایک کونہ تھا اس لیے وہ اپنی ہنسی کو نہ روک پائی اور سرلا کے کرشماتی لمس کا انتظار کرتے ہوئے پُر اُمید نظروں سے سرلا کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

سرلا نے جب نریندر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو اُس کو جھیل کی عمیق گہرائیوں کے بجائے ایک سوکھے تالاب کی تہہ نظر آئی۔ وہ نریندر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چیخ پڑی۔ پھر وہ نریندر کو دیکھتے ہوئے سسکنے لگی، اُس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ آنسو بہتے رہے۔ ایک جوگن کے ذہن میں دفن کی ہوئی یادیں یوں اُبھر کر آئیں جیسے بیج ایک پودا بن کر زمین کی تہیں کاٹ کر نظر آتا ہے۔

نرملا یہ سوچتی رہی کہ سرلا اپنی سہیلی کی حالت دیکھ کر یہ بھول گئی ہے کہ ایک سنیاسن کے لیے اونچے پربت اور گہرے ساگر دونوں ایک ہی سطح پر نظر آتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی یا بوجھ پاتی نرملا کی کیفیت بھانپ کر سرلا نے اپنے آپ پر قابو پا کر کچھ منتر پڑھ کر جب نریندر کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اُس کی آنکھیں بند کیں تب نرملا یہ جان گئی کہ اُس کا دیپک بجھ چکا ہے۔ پہلے وہ اپنے آپ کو اور سرلا کو کوسنے لگی اور پھر ایک چیخ کے بعد یوں گر گئی جیسے ایک بہت بڑا آئینہ، جس میں نرملا اپنا عکس دیکھا کرتی تھی، ایک کنکر سے ٹوٹ کر فرش پہ گر جاتا ہے۔

سرلا کو یوں لگ رہا تھا گویا وہ لب سی کر کانچ کے ٹکڑوں پر ننگے پاؤں چل رہی ہو۔

OO

مقصد

پھر وہی ڈفلی، پھر وہی رات، گاؤں کے اس پار اور اُس پار والے دونوں کے لیے رنگ بدلتے واقعات سے رونما ہوئے حالات اور حالات کی پیداوار، سیاست کے اُبال سے گاؤں پر چھانے والے بادلوں کی گرج، بن موسم برسات کے یوں عادی ہوگئے گویا وہ ڈرگس کھا کر جھومنے کے عادی ہوگئے ہیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ جس اجنبی کو ہم سفر بنا کر انجانی راہوں پر زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں وہ سہانا ہے یا کٹھن ہے۔ ان کو اپنی منزل کے بارے میں علم نہیں ہے بلکہ تصور بھی نہیں ہے۔ ہاں، وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک مقصد کے لیے زندہ ہیں اور اُسی مقصد کے لیے مر مٹنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مگر گاؤں میں اس پار بھی اور اُس پار بھی چند سمجھدار لوگ ہیں جو بدلتے حالات کی ہر کروٹ کے ساتھ حالات کو اپنے نظریے سے دیکھ کر یہ جاننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ایسا کب ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ آخر اس کروٹ کا مقصد کیا تھا۔ حالانکہ اُن کی آواز عام لوگوں کے نعروں کے شور میں یوں دب جاتی ہے گویا ایک پُر جوش جلوس میں ماں سے بچھڑ چکے بچّے کی رونے کی آواز۔ اُن ہی لوگوں میں چند لوگوں نے گاؤں کے دونوں حصوں کے درمیان سرحد کی حیثیت کا احساس دلانے والی سوکھی ندی میں پانی کی ایک پتلی سی لکیر دیکھ لی تو تجسس نے تشویش بن کر تذبذب کے دلدل میں ڈال دیا۔ وجہ یہ کہ ندی کے کناروں کو جوڑنے والا صدیوں پرانا مٹّی کا بنا ہوا ایک باندھ ہے جس میں اَن دیکھے کئی چشموں کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے۔ برسات کا پانی بھی ایک مصنوعی جھیل میں جمع ہو جاتا ہے اور باندھ کے دوسرے حصّے میں ندی خشک رہتی ہے۔ ہاں کبھی بارش میں سوکھی ندی میں تھوڑے سے وقفے کے لیے اتنا پانی بہتا ہے جس میں بچے کاغذ کی کشتیاں بنا کر کھیلا کرتے ہیں۔ آخر باندھ پر ایک تازہ تازہ پانی کے بہہ جانے کی لکیر دیکھ باندھ کی وہ جگہ دیکھنے میں کامیاب ہوگئے جہاں باندھ میں ایک پتلی سی لکیر کرید کر یہ منصوبہ بنایا گیا تھا کہ چونکہ ایک پُرسکون جھیل کا پانی نکاسی کے لیے پورے زور و شور کے ساتھ چٹانوں کو

بھی ہٹا دیتا ہے۔ مٹی کو وہ نگل کر سوکھی ندی کے کناروں کو کاٹ کر، دھان کی کھڑی فصل کو اُجاڑ کر گاؤں کو اکھاڑ کر اُس پار اور اِس پار گاؤں کو کیچڑ کا کفن اوڑھا کر دفن کرنے کا منصوبہ کس کی سوچ اور پھر سوچ پر عمل نہ ہونے کے عذاب کو ثواب کا کام کیا باندھ کے نگہبانوں نے کیا ہوگا؟

سمجھ دار لوگ کھوج میں اپنے دماغ کا استعمال کرتے رہے جبکہ اِس پار اور اُس پار کے لوگوں نے باندھ کے دامن میں کیچڑ کے نیچے دو جانے پہچانے چہروں کو نیم عریاں حالت میں دیکھتے ہی ایک دوسرے کے خلاف نعرے لگائے۔ سیاست کی باتیں کر کے گویا دہکتے انگاروں میں بارود ڈال کر دھماکے کرتے رہے، لڑکی اِس پار کی تھی اور لڑکا اُس پار کا تھا جن کو ایک دن پہلے غصّے اور طنز کے ملے جلے تاثرات سے سوہنی اور مہیوال کا نام دے کر سرکاری چال باز کہہ کر نہ صرف گاؤں والوں نے بلکہ اپنے گھر والوں نے بھی دہلیز پار کرنے کا موقع بھی نہ دیا تھا۔

خبر چونکہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی اس لیے سوکھی ندی اُس پار اور اِس پار کے لوگوں سے بھر گئی۔ سکوت کا عالم ایک بلند نعرے نے توڑ دیا۔ ”بے شرم اور بے حیا سوہنی کو بے نقاب کر دیا۔ اُس پار کے لوگوں کی ترجمانی ہوگئی۔ ان کے دعوے کی تصدیق ہوگئی؟“

نعرہ یوں گونج اٹھا گویا بادل پھٹ گئے جس کا تاثر یہ ہوا کہ ایک دوسرے سے کندھے ملا کر کھڑے لوگ الگ ہو کر دو حصّوں میں یوں کھڑے ہوگئے گویا سرحد پر مقابلے کے لیے تیار فوجی، جن کو اجنبی لوگ کمانڈ کر رہے تھے۔ نعرے کے جواب میں ایک بار پھر بادل پھٹ گئے۔ ”آستین کے سانپ کا انجام تو دیکھو! ڈنک مارنے سے پہلے ہی کچلا گیا!“ پھر فسادات کے سلسلوں کا خوفناک منظر اور ایک ہی نعرے کی گونج ”چشمے ہمارے ہیں تو پانی بھی ہمارا ہے۔“

صدیوں پہلے گزری مگر سنی سنائی سوہنی مہیوال کے عشق کی داستان سن کر اِس دور میں بھی لوگ آہیں بھر کر یہ سوچتے رہتے ہیں کہ کاش! سوہنی محبت کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر کچے مٹکے کے سہارے دریائے چناب پار کرنے کے لیے اپنے آپ کو موجوں کے سپرد نہ کرتی تو مہیوال بھی اس کو بچانے کی خاطر دریا میں کود نہ پڑتا۔ مگر آج جن کو گاؤں والوں نے نفرت سے یہ نام دیے ہیں ان کی کہانی تو آنکھوں دیکھی کانوں سنی کہانی ہے۔

دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہاں لڑکی ندی کے اِس پار کے ایک رئیس باپ کی بیٹی ہے جبکہ لڑکا اُس پار کے ایک قوم پرست لیڈر کا بیٹا ہے۔ دونوں نے اپنے بچوں کو گاؤں کی سیاست سے دور رکھ کر پہلے بورڈنگ اسکولوں میں ابتدائی تربیت دی اور بعد میں بہت بڑی رقوم

دے کر ایک ہی میڈیکل کالج میں داخلہ دلا کر خوش بھی تھے اور ڈرے سہمے بھی۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چرانے والوں کے بچے اپنے وطن کی خوشبو سونگھ سونگھ کر ایک دوسرے پر اعتماد کرتے کرتے چاہت کے غنچوں کو محبت کے شاداب مہکتے چمن میں بدلنے میں کامیاب ہوئے تھے، دونوں ابتدائی رومانی دور میں اپنے گاؤں کی پُرکشش خوبصورتی کی باتیں کیا کرتے تھے، نظریاتی اختلاف سے پہلے اپنے والدین کی دوستی کی باتیں کیا کرتے تھے، پھر رفتہ رفتہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتے تھے جس کی اطلاع وہ وقتاً فوقتاً اشارتاً اپنے والدین کو دیتے رہے۔

پھر جب دونوں نے عدالت میں شادی کر کے مصلحتوں کو نظر انداز کر کے اپنی ایک الگ دنیا بسانے کی خاطر ایک باندی کے اُس پار اور اِس پار اپنوں سے ملنے کی خاطر تحائف لے کر گاؤں کے جس دروازے پر دستک دیتے رہے ان کے لیے بے صدا ثابت ہوا۔ کچھ اجنبی حاکموں نے ان کو چالباز کہا تو کچھ نے اپنوں کی جڑیں کاٹنے والے سرکاری ایجنٹ کہا۔ والدین اپنی لاعلمی ظاہر کرتے کرتے اپنی اہمیت کھو بیٹھے تو دونوں کاٹھ کے ٹکڑوں کی کناروں کے قریب یوں پڑے رہے گویا وہ اپنے نمود کی بجائے اپنے وجود کے لیے خود اپنے لیے ایک سوال بن گئے تھے۔ رو پہلی رات گزار کر صبح کا انتظار کرنا اور پھر چند سمجھ دار لوگوں کے اشاروں پر گاؤں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر پردیش میں رہنا تو صدمہ تھا مگر لوٹ کر اپنے وطن نہ آنا دونوں کے لیے جذباتی طور پر، ثقافتی طور پر، بلکہ تواریخی حوالوں سے منطقی طور پر ایک سانحے کا بے شمار خانوں والا ایک خاکہ جو اگر ایک ہی رنگ سے پُر کیا جائے تو آکاش کی طرح باوقار ہو سکتا تھا مگر مختلف رنگوں کے پُر ہوتے ہی باریک لکیروں کو دراڑوں اور پھر دراڑوں کو خطرناک کھائیوں میں بدل سکتا ہے۔

سوکھی ندی میں چلتے چلتے جب گھٹن ہونے لگی تو دونوں باندھ پر چڑھ کر لمبی سانسیں لیتے ہوئے، چہل قدمی کرتے رہے اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے تھے کہ باندھ کے نگہبانوں، اُس پار کے اور اِس پار کے بھی، نے ان کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا بھی تھا اور ان کی آوازیں اور باتیں بھی سن کر نہ ٹوکا تھا نہ روکا تھا۔ یہ ساری جانکاری ان دو سمجھ دار بزرگوں کو باندھ کے نگہبانوں کے ہاتھ پاؤں کھول کر اور اُن کے منہ میں زبردستی ٹھونسا گیا کپڑا نکال کر دستیاب ہوئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ دو اجنبی اُس پار کے نگہبان اور اِس پار کے نگہبان کو ملے تھے اور دونوں کو انھوں نے ایسی میٹھی میٹھی باتوں میں اُلجھا کر بہت ہی ہنرمندی سے باندھ کر، منہ بند کر باندھ میں لوہے کی سلاخ سے ایک چھوٹی سی لکیر ڈال کر پانی کو باندھ کے آر پار کا راستہ اس لیے دیا تھا کہ جوں جوں پانی نکلتا

رہے گا لکیر شگاف بنا کر جہلم کے پانی کو تیز رفتار سے نکلتے ہوئے صدیوں پرانے باندھ کو روند کر گاؤں کے دونوں کناروں کو تباہ و برباد کر دے گا، پھر نہ گاؤں ہوگا نہ گاؤں کے آپس میں جھگڑنے والے لوگ ہوں گے اور نہ چشموں کا تنازعہ عالمگیر مسئلہ بن جائے گا یعنی اُن کا مقصد پورا ہوگا۔

وہ دو اجنبی جب چلے گئے تو سوہنی مہیوال نے پانی سے باندھ کو کٹتے دیکھا۔ دونوں نے اپنا سامان اٹیچیوں سے نکال کر ایک زبردست کوشش کے بعد پانی کی نکاسی کو اچھی طرح بند کرنے کی خاطر اپنے کپڑوں کے علاوہ بطور تحائف لائے گئے بچوں اور بڑوں کے کپڑوں کا استعمال کیا۔ وہ جب تک کامیاب ہوئے کچھ پانی سوکھی ندی میں جا چکا تھا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہی وہ کیچڑ میں پھسل کر تقریباً پچاس فٹ اونچے باندھ سے سوکھی ندی میں گر کر دم توڑ گئے! لیکن اب وہی لوگ جو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تھے، وہی سرگرم تھے اور فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ سمجھدار لوگوں نے اس پار اور اُس پار کے لوگوں کو ایک قیامت خیز سانحے کو روکنے والوں کو اس بارے میں بتانا چاہا تو چند اجنبیوں نے بآوازِ بلند اُن کو بھی سازش میں شامل ہونے کا مجرم قرار دے کر اُن کو بھی کیچڑ میں دفنا دیا۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کا دعویٰ کر کے پھر وہی نعرے لگائے ''جس حصے میں چشمے ہیں، پانی پر ان کا ہی حق ہے۔ باندھ رہے یا نہ رہے، اپنا حق لے کر رہیں گے اور اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہیں گے!''

دونوں کناروں کے نگہبانوں نے اُن دونوں اجنبی چہروں کو پہچان تو لیا تھا جنھوں نے باندھ کو اُڑا دینے کی سازش رچی تھی مگر دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے اُس پار اور اِس پار کی نمائندگی کرتے ہوئے دیکھ کر وہ سکتے میں آ گئے تھے۔ گویا وہ سانسیں لے رہے پتھر تھے!!

OO

بس ایک بار

وہ مجھے شروع شروع میں ایک عام نوکرانی کی طرح احترام سے گڈ مارننگ سر کہہ کر صبح سویرے ایک کپ چائے دیا کرتی تھی لیکن رفتہ رفتہ ہمارے پیار محبت اور اپنائیت کے احساسات کی وجہ سے مجھے 'بابا' کہا کرتی تھی اور اور علی الصبح وہ میرے پاؤں دبایا کرتی تھی پھر گھر کا کام کاج کرنے کے بعد او کے بابا کہہ کر جانے کی اطلاع دیا کرتی تھی مگر اس روز نہ اس نے جاتے وقت پلٹ کر دیکھا تھا اور نہ ہاتھ ہلاتے ہوئے گھر جانے کے لیے دروازہ کھولا تھا۔

پھر تو تب سے اب تک یعنی چھ مہینے کے لمبے وقفے کے بعد بھی جب کال بیل کی آواز سنائی دیتی ہے میں چونک پڑتا ہوں۔ یاسمین آئی ہوگی؟ شروع شروع میں یاسمین کے بارے میں بولتا رہتا تھا اور تنگ آ کر میری بیوی نے سخت لہجے میں کہا تھا کہ وہ نہ تو ہماری رشتے دار تھی اور نہ ناطے دار تھی۔ ایک بہت اچھی نوکرانی تھی کہیں مادی میں رہنے والے کسی اور نے زیادہ تنخواہ دی ہوگی اس لیے دوسرے گھر میں کام کر رہی ہوگی! آخر مادی میں کروڑ پتی لوگ اپنے بنگلوں میں رہتے ہیں یا انھوں نے بیرونی ممالک سے آئے ہوئے مختلف ممالک کے سفیروں یا اونچے عہدوں پر فائز انٹرنیشنل کمپنیوں میں کام کرنے والے اعلیٰ افسروں کو کرائے پر دے رکھے ہیں۔ مگر میرا دل کچھ اور محسوس کرتے ہوئے اکثر اپنے ہی خیالات یا پھر اپنی خواہشات میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے بابا یعنی پیارے بزرگوار کہنے والی تقریباً چالیس سال کی کنواری عورت جو مجھ اپاہج کی مشکل کشا تھی وہ میری پُر خلوص خدمت کرنے کے لیے لوٹ کر آ جائے بشرطیکہ اس نے شادی کر کے اپنا گھر نہ بسا لیا ہو تو۔

ہم لوگ پچھلے دو سال سے مصر کی راجدھانی قاہرہ کے مادی علاقے میں رہتے ہیں اور یہاں ہر گھر میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے والی عزت دار مذہب پرست اوسط درجے کی عورتیں، پردے میں رہ کر گھریلو کام کرنے کی خاطر ہر بنگلے میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ضرورت اقتصادی

بحران کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہاں شادیاں صحیح عمر میں نہیں ہو پاتی ہیں اور اس کی وجہ ہمارے ملک کی طرح لڑکوں کی طرف سے جہیز کی مانگ نہیں ہے بلکہ یہاں کے رواج نرالے ہیں۔ شادی کے بعد بیٹا اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہ سکتا ہے اس لیے شادی سے پہلے اپنا گھر بسانے کے لیے اپنا گھر خریدنا پڑتا ہے۔ گھر کی تمام ضروری چیزیں، جن میں ٹی وی، فریج جیسی سہولیات بھی شامل ہوا کرتی ہیں اور عام طور پر مصر میں مقامی بے روزگاری کی وجہ سے شادی کرنے کے لیے یہ لوازمات پورا کرتے کرتے بیس سال کی لڑکی کو چالیس سال کا شوہر ملتا ہے اور یاسمین جیسی ذہین لڑکی کو چالیس سال کی عمر میں من چاہا شوہر نہیں مل پایا۔ اس طریقۂ کار کو ایک مناسب ضرورت سمجھا جاتا ہے، عیب نہیں۔ دنیا کے کسی ملک میں ایسا چلن ہو تو وہاں بدچلنی عروج پر ہو سکتی ہے لیکن یہاں اسلامی قوانین اتنے سخت ہیں کہ عورتوں کا پیچھا کرنے والے مردوں یعنی Eve teasers کو چھ سال کی قیدِ بامشقت کی سزا ملتی ہے۔ اس لیے یہاں کی لڑکیوں یا پھر عورتوں کو بھی برقعہ پہن کر یا اپنے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے علاوہ جسم کو مکمل طور پر ڈھک کر گئی رات تک بھی بے خوف چلنے پھرنے پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ خاص بات یہ ہے کہ ہر عمر کی لڑکیوں یا عورتوں کے بال بالکل نظر نہیں آنے چاہئیں۔ جس لڑکی یا عورت کے بال چھپے نہ ہوں اس کو غیر مسلم سمجھ کر تنگ نہیں کیا جاتا ہے۔

یاسمین بھی شروع میں ہمارے گھر کے اندر برقعہ پہنا کرتی تھی لیکن خدا جانے رفتہ رفتہ وہ ہم سب سے گھل مل کر، اپنے آپ کو ہمارے گھر کی فرد سمجھ کر صرف اپنے بالوں کو مکمل ڈھک کر اور اپنی گردن اور سینے کو ایک اسکارف سے لپیٹ کر پہلے میرے دو پوتوں کی کیر ٹیکر بن گئی تھی پھر ہم سب کی وہی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔

میری دیکھ بھال کے لیے میرے بیٹے نے ایک ایسے پیشہ ور آدمی کو رکھا تھا جو مجھ اپاہج (جو بدبختی سے بول بھی نہیں پاتا) کو لیٹنے میں، لیٹ کر بٹھانے میں، بیٹھ کر لکھنے میں، وہیل چیئر پر بٹھانے میں اور پھر غسل خانے میں لے جانے میں میری مدد کیا کرتا تھا، لیکن انگریزی زبان جاننے کا دعویٰ کرنے والا میری انگریزی میں لکھی تحریر پڑھ کر میرے سلجھے ہوئے کام کو اُلجھا دیا کرتا تھا۔ یعنی میں قلم مانگتا تو وہ میری بے بسی کا فائدہ اُٹھا کر میرے سامنے رکھا خطوط لکھنے کا پیڈ ہٹا کر مجھے لٹا دیا کرتا تھا۔

یاسمین اس کو عربی زبان میں سمجھا تو دیا کرتی تھی لیکن وہ تھا لکیر کا فقیر! ایک روز میں نے اس

کا ایک انوکھا رُوپ دیکھا۔ جب خدمت گار نے کروٹ بدلنے کے لیے مجھ پر طاقت کا استعمال کیا تو میری درد بھری چیخ سن کر یاسمین میرے درد کی شدّت کم کرنے کے لیے مجھ سے لپٹ گئی اور عربی زبان میں بار بار 'بابا' لفظ کہہ کر اُسے اتنا ڈانٹا کہ وہ میری بیوی سے اپنی اجرت لے کر گیا تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ میرے گھر والے میری خود مدد کرنے کی کوشش کرتے یاسمین اپنے اونچے قد اور طاقتور جسم کی بدولت مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر بالکونی میں لے جا کر چائے بھی پلا چکی ہوتی۔

میری بیوی نے تب یہ دیکھ کر یاسمین کا ماتھا چوم لیا تھا جب یاسمین نے میرے Walkman پر میری پسندیدہ غزلوں کا کیسٹ لگایا تھا۔

میری بیوی نے جب یاسمین سے اس کے حیرت انگیز کارنامے کے بارے میں پوچھا تو اُس نے اپنی ٹوٹی ہوئی انگریزی میں یہ سمجھایا کہ وہ خود ہی بابا کا سارا کام کر لیا کرے گی اور یوں یاسمین ہمارے گھر کی ایک فرد بن گئی تھی۔

میری بیوی نے یاسمین پر ایک ہی پابندی عائد کی تھی، وہ یہ کہ صفائی کرنے کے بعد وہ نہایا کرے گی اور پھر کچن میں جائے گی۔

یاسمین مجھے آسائش کا احساس دلانے کی خاطر بلا جھجک کروٹ بدلتے وقت میرے سینے سے لپٹ جاتی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ ایک بیٹی باپ سے لپٹ گئی ہے۔

قربتوں نے ہم دونوں کو اشاروں سے ایک دوسرے کی باتیں سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ یاسمین پاس ہوتی تھی تو مجھے چار سو پھیلی خوشبو کا احساس اور سکونِ روح ثابت ہوتی تھی۔

یاسمین میرے دونوں پوتوں کو اچھی لگتی تھی۔ بہو اور بیٹے دونوں کے لیے احساسِ راحت ہوا کرتی تھی جبکہ میری بیوی کو یاسمین پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے معذور شوہر کو، جس کو وہ دہلی میں اپنے قریبی رشتے داروں کے سہارے ایک گھنٹے کے لیے بھی چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی تھی، ایک مصری لڑکی جس کے بارے میں اس کے گھر کا پتا بھی نہیں تھا، کی دیکھ بھال میں چھوڑ کر اپنی بہو کی کار میں خرید وفروخت کے لیے مارکیٹ جاتی تھی بلکہ ہندوستان اور پاکستان سے مادی میں رہنے والی عورتوں کے ساتھ دل کھول کر باتیں کرنے جایا کرتی تھی۔

جب گھر میں صرف میں اور یاسمین ہوا کرتے تھے تو میں سویا رہتا تھا یا لکھتا پڑھتا اور غزلیں

سنتا رہتا تھا اور یاسمین آس پاس رہ کر گھر کے چھوٹے موٹے کام کیا کرتی تھی اور بچوں کے کھلونوں سے کھیلا کرتی تھی۔

اُس روز جو ہوا اُس کو سانحہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ میری بیوی کی پاکستانی سہیلی نسیم کو آنکھ کے آپریشن کے لیے ڈیٹ مل گئی تھی، میری بیوی کیٹرایکٹ یعنی موتی بند کا آپریشن دہلی میں کرا چکی تھی اس لیے وہ میری بیوی کو ذاتی تجربے کی وجہ سے بحثیت ایک صلاح کار ساتھ لے گئی تھی یا پھر پردیس میں کسی اپنے کو ایک ہمدرد جان کر لے گئی تھی۔ کار چونکہ میری بہو نے ہی ڈرائیو کرنی تھی اس لیے اس کا ساتھ جانا لازمی تھا اس لیے گھر میں میرے ساتھ صرف یاسمین تھی۔ مجھے دوائی دینے کے بعد جب میں معمول کی طرح سو گیا تھا تب اُس نے گھر کی صفائی کی تھی اور کچن میں جانے سے پہلے غسل کرنے گئی تھی! میں تب بھی اور اب بھی عادتاً ایک کروٹ لے کر آنکھیں بند کرتا ہوں پھر دوائی کے اثر سے دو تین گھنٹے سو جاتا ہوں بشرطیکہ کوئی مجھے جگا نہ دے یا میرے بازو یا ٹانگ بیماری کی وجہ سے اکڑ جائے اور درد کی شدت جگا نہ دے۔ ایسی صورتِ حال کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے اور اِس عذابِ شدید کا واحد حل یہ ہے کہ میری ٹانگیں پلنگ سے گھسیٹ کر، پلنگ کے سہارے ٹکا کر مجھے سینے سے لگا کر بہت ہی احتیاط سے کھڑا کرنے کے بعد ہی ٹانگوں کو الگ کیا جا سکتا ہے۔ میں درد کی شدت کو برداشت کرتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا یاسمین دوسرے مددگار کے بغیر یہ مشکل کام نہیں کر پائے گی اس لیے درد کی شدت میں جو چیخ نکلی وہ یاسمین نے سن لی اور وہ کھلے بٹن والی قمیض پہنی ہوئی میرے قریب آئی اور پلنگ پر پڑی چادر سے اپنی ننگی ٹانگوں کو چھپا کر میرے جسم کا جائزہ لے کر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں میری پیٹھ سے لپٹ کر Pain yes Pain yes بڑبڑاتی رہی۔ میں سر نیچے کر کے لیٹا تھا اور اپنی ٹانگوں کو الگ کرنے کی ناکام کوشش میں میری ناک سرہانے سے یوں چپک گئی تھی گویا ہر سانس روئی سے کھینچ کر آ رہا تھا اور ہر سانس کو آخری سانس سمجھتا رہا۔ اچانک جھٹکا لگا اور میں سیدھا ہو گیا۔ یاسمین مجھ سے لپٹی رہی اور خوش ہو کر کہتی رہی Wait-Wait یا رب، یا رب! کیونکہ ایک بار ایسی ہی صورتِ حال سے میں گزر چکا تھا اور اُس روز میرے مددگار کے علاوہ میرا بیٹا، بیوی اور بہو نے مل کر مجھے اس آزار سے آزاد کیا تھا لیکن اس بار نہ جانے کیسے یاسمین نے مجھے گلے لگا کر اٹھا لیا تھا پھر میرے جسم کو یوں کس لیا تھا کہ میرے جسم میں گویا نئی روح داخل ہو گئی۔ یاسمین میری آنکھوں میں خوشی تلاش کر رہی تھی جبکہ میری صحت یاب نگاہیں یاسمین کے سنہرے بالوں سے ٹپک رہے پانی کے قطروں پر جمی رہیں۔ پھر اُس کی صراحی

دار گردن سے سرک کر یاسمین کے پُرکشش سینے کے اُبھار پر رُک گئیں، جانے مجھ میں وہ قوت کہاں سے آ گئی کہ میں نے یاسمین کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور یوں محسوس کرتا رہا کہ مارک انٹونی نے قلوپطرہ کو گلے سے لگایا ہے۔ ان چند لمحات کے دوران میں نے غیر دانستہ طور پر کون سی ایسی نازیبا حرکت کی کہ وہ میری گرفت سے نکل جانے کی کوشش کرتی ہوئی رو رہی تھی۔ وہ روز کی طرح مجھ سے لپٹ کر خوشی کے آنسو بہا رہی تھی یا پھر ہمدردی کی اشک باری تھی اور یا پھر وہ افسردگی کی بارش تھی؟

دوائیوں کے اثر سے میں گہری سوچ میں ڈوبنے کی بجائے نہ چاہتے ہوئے بھی پھر سو گیا۔ یاسمین نے معمول کی طرح مجھے آرام سے سو جانے کے لیے میری ٹانگوں پر کمبل ڈال کر اے سی آن کیا تھا اور وہ اپنا برقعہ پہن کر جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ میری بیوی اور بہو یاسمین کے اچانک گھر میں بھی برقعہ پہن کر کچن میں کام کرنے کی وجہ پوچھنے کی بجائے مجھے جگانے کی کوشش کرتی رہیں تا کہ میں وقت پر دوپہر کا کھانا کھا کر دوائی لے سکوں۔ میں جاگا اور یاسمین کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو مجھے بتایا گیا کہ وہ صحت خراب ہونے کی وجہ سے آج اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔

میرے دل میں چور تھا اس لیے یاسمین کو آواز دے کر جونہی بلایا وہ سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی کی بجائے غمزدگی کے تاثرات تھے۔ یوں نظر آ رہی تھی جیسے ایک بجھے ہوئے دِیے کی اَدھ بجھی لَو باقی ہو۔

میں نے کہا کہ کڑاکے کی گرمی میں یہ برقعہ پہن کر سفر کرنا مشکل ہوگا مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہی اور چلی گئی اور پھر لوٹ کر نہیں آئی۔

یاسمین کے جانے کے بعد ہمارے گھر میں ایک عیسائی نوکرانی آئی، چونکہ وہ کسی سفیر کے گھر کام کر چکی تھی اس لیے اپنے آپ کو ہاؤس کیپر سمجھتی تھی۔ انگریزی روانی سے بولتی تھی حالانکہ وہ بھی یاسمین کی طرح قاہرہ کی رہنے والی تھی۔ پھر ایک دن گویا مجھ پر بجلی گر پڑی۔

ہماری ہاؤس کیپر جس کا نام ہمیں معلوم نہیں تھا، نے میرے کاغذات میں ایک صفحہ دیکھ لیا جس پر عربی میں کچھ لکھا تھا۔ میرے انکار کرنے پر کہ نہ یہ صفحہ میری کسی کہانی کا حصّہ ہے اور نہ مجھے عربی زبان آتی ہے، اس نے تحریر پڑھ لی تھی۔ مجھ سے، میرے بیٹے کے اشارے دے کر اس کے بہت اچھے کردار سے مطمئن ہو کر سنجیدگی سے عبارت پڑھ کر مجھے اُس کا مفہوم سمجھا دیا۔ تحریری یاسمین کی تھی، یہ اُس نے پہلے بتا دیا تھا۔

بابا کے حوالے سے یاسمین نے لکھا تھا کہ مرد سولہ سال کا ہو یا ستر سال کا، عورت کے کھلے

بال اور عریاں گردن، چھاتی اور جسم دیکھ کر انسان سے شیطان بن جاتا ہے۔ لڑکپن میں جنسی خواہشات کی چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں، جوانی میں جنسی لذت کی خواہش ایک جنگل کی آگ جیسی شدت اختیار کر لیتی ہے جبکہ بوڑھاپے میں جنسی خواہشات ایسی ہوائیں پیدا کرتی ہیں جو راکھ کے نیچے دبے ادھ بجھے انگارے تلاش کرتی ہیں، اس لیے بابا کہتے ہیں کہ برقعہ شیطان کو دُور رکھتا ہے۔

میں نے چونک کر کہا تھا کہ یاسمین کو میں نے یہ باتیں کبھی نہیں بتائی تھیں۔ وہ مجھے بابا کہتی تھیں۔ لیکن جب میں یہ جان پایا کہ یاسمین نے اپنے بابا یعنی ابا کے حوالے سے لکھی ہیں اور وہ مجھے باپ سمجھ کر بابا کہا کرتی تھی تب میں شرمندگی کے احساس سے زمین میں دب گیا۔ تب سے اب تک زمین کی تہیں کاٹ کاٹ کر پاتال کی آگ کی تپش محسوس کر رہا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ ایک بار یاسمین میرے پاس آ جائے تاکہ میں اس کے سامنے بحثیت ایک مجرم کھڑا ہو کر خود ہی عادل بن کر بلوامنگل کی طرح اپنی آنکھیں نوچ کر سورداس بن جاؤں۔

لوٹ کر آ جاؤ یاسمین!

اپنے بابا کے پاس!

بیٹی! بس ایک بار!!

OO

چوہا

جس کے چہرے پر کسی نے مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی، اس کو بلاوجہ قہقہے لگاتے ہوئے دیکھ کر اِرد گرد کھڑے لوگ بول پڑے، اُجالا پہلے نیم پاگل تھا اب پورا پاگل ہو گیا! اُجالا نہ تو اُس کا اصلی نام ہے اور نہ تخلص ہے کیونکہ وہ شاعر بھی نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی قابل جج جس کو اُس کے مداحوں نے اُجالا کا لقب دیا ہے وہ اس لیے کہ قانون کی آنکھوں پر لگی پٹی کے باوجود وہ سچ کی اُجلی کرنیں دیکھ کر انوکھے فیصلے سنا کر ان لوگوں کے چہروں سے جھوٹ کا نقاب اُتار دیتے ہیں جو دولت کی طاقت سے سچ کو جھوٹ کے منوں تودوں کے نیچے دبا دیتے ہیں، اُن کو یعنی اُجالا صاحب کو پسند کرنے والے زیادہ ہیں اور ناپسند کرنے والے بہت ہی کم ہونے کے باوجود اتنی مشکلیں پیدا کر چکے ہیں کہ ہر تین ماہ کی تبدیلیوں کی وجہ سے نہ گھر کے رہ گئے ہیں نہ گھاٹ کے اور یوں اب مقدموں پر بحث سننے کی بجائے ایک سینوٹوریم (دِق کے مریضوں کا مخصوص اسپتال) میں ہر وارڈ میں آتے جاتے یا تو کھانسی کی کھن کھن کی آوازیں سنتے رہتے ہیں یا پھر ایک چوہے کا بار بار ذکر سناتے رہتے ہیں، وہ بھی ایسے جیسے بھی چوہے کے کارناموں کے ستائے ہوئے ہیں۔

مریضوں کی دوائیاں کون کھا جاتا ہے؟ وہی موٹا چوہا!!

اُن رحم دل لوگوں کے دیے مریضوں کے لیے پھل کون کھا جاتا ہے؟ وہی موٹا چوہا!!

اُجالا نے اپنی بیماری کی شدت برداشت کر کے اپنے خرچ پر مریضوں کو دوائیاں، پھل، صاف ستھرے ماحول میں رہنے کے لیے بیڈ شیٹ منگوا دیے۔ میڈیا والوں نے خبر کو سرخیاں بنا ڈالا تو انھوں نے، ایک قابل جج نے، جو خود ہی ملزم بھی تھا، اپنے بچاؤ کے لیے دلیلیں اور قوانین کے حوالے دینے والے وکیل پر، ان کے نیک اعمال کو روکنے کی خاطر، ایک سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر، سیاست میں قدم رکھنے کا ایک چالاک اور مکار منصوبے کا ایک بلیو پرنٹ بتا کر سرکاری مدد سے روکنے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکامیاب ہو کر چوہے کو رنگے ہاتھوں وٹامن کی گولیاں

چراتے پکڑ لیا تو مریض ہنسنے کی وجہ سے سینے میں جلن محسوس کرتے ہوئے بھی خوشی کا اظہار کرتے رہے کیونکہ اُن کے ہی بچھائے جال میں چوہا پکڑا گیا تھا۔ اُجالا دوڑ کر چوہے کو دیکھنے گیا تب وہ سکتے میں آ گیا کیونکہ وہ بلی سے ڈرنے والا چوہا نہیں تھا بلکہ اسپتال کا ایک ملازم تھا۔ اُجالا یہ دیکھ کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔

اُجالا نے تاریکیوں میں روشنی دیکھی مگر اس بار وہ سکتے میں آ گیا کیونکہ اس کو ایک اپنا پرانا واقعہ یاد آیا۔ اس نے ایک باعزت بری ہوئے اسٹور کیپر سے ذاتی طور پر پوچھا تھا کہ 'یہ تو اب بتا دو کہ وہ لوہا جو تمھارے اسٹور میں پایا گیا تھا وہ آخر گیا کہاں؟' اسٹور کیپر نے اعتماد سے کہا تھا کہ 'لوہے کو چوہے کھا گئے'۔ پھر ہنس کر کہا تھا کہ 'چوہوں کو پکڑنے کے لیے سرکاری بلیوں کی ضرورت ہے'۔ یہ سن کر تب وہ ناراض ہوا تھا مگر اب وہ قصہ یاد آیا تو بے ساختہ قہقہے لگاتا رہا!!

○○

سلطانِ جمہور

آج کا دن اُس کے لیے حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ قہر انگیز بھی ثابت ہوا خاص کر اس لیے کہ وہ معمول کی طرح صبح سویرے اپنے اُس دوست سے ملنے آیا تھا جو اپنے آپ کو جمہوری نظام کا ایک خدمت گار سمجھ رہا تھا لیکن جب اُس کو حکومت کے سربراہ کے در پر اور کئی ملنے کے خواہش مندوں کے ساتھ اندر داخل ہونے کی خاطر ایک لمبی قطار میں کھڑا رہنا پڑا تھا، تب اُس کی توقعات کو لگی ٹھیس سے وہ ذہنی طور پر ایک عام انسان کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا اور شاید اس کا منطق اس کو اپنے ذرّے سمیٹنے میں مدد کر لیتا لیکن جس کمرے کو وہ اپنے دوست کا ڈرائنگ روم جیسا سمجھ رہا تھا وہ ایک شہنشاہ کے دربارِ خاص جیسا تھا۔

اور دربارِ شاہی میں سلطانِ جمہور کے حق میں قصیدے پڑھنے والوں میں، فریاد کرنے والے کم اور حق سے مانگنے والے زیادہ تھے۔ یعنی چند اعتماد دلا کر اقتدار میں حصّہ مانگنے والے دل بدلو سیاست داں، حمایت دے کر سودا طے کرنے والے تاجر، مکمل تعاون کی پیش کش کر کے چند اہم محکمے مانگنے والے افسران، برسوں پہلے دنوں کی یادیں تازہ کر کے ڈاکٹری، انجینئرنگ، وغیرہ شعبوں میں سیٹوں کے طلب گار یا نوکریاں حاصل کرنے کے خواہش مند بآوازِ بلند اپنے اُن ذاتی تعلقات کا ذکر کر رہے تھے جن کے بارے میں اگر وہ کچھ نہیں جانتا تھا تو اس کے سائے میں رہنے والا، سیاسی گرہن کا شکار ہو کر عوام و انتظامیہ کے علاوہ سماجی چہل پہل سے بچھڑے ہوئے ایک لیڈر کو کیسے فرضی ڈرامائی کہانیاں یاد آتیں؟

اُس کو یقین تھا کہ جھوٹ کی بدبو سے غصّہ ہو کر سچ کی خوشبو سونگھنے کی خاطر وہ اِرد گرد لوگوں کے دائرے کے محیط کو توڑ کر اس کے پاس آئے گا یا پھر اپنے ڈرائیور کے پاس جا کر معمول کی طرح اُس کو گلے لگا کر اُس کو اپنے ساتھ چائے پلائے گا کیونکہ وہی تو ایک سرکاری ملازم ہے جس نے اپنی وفاداری کے جذبے کے تحت نہ صرف نوکری چھوڑ دی تھی بلکہ اقتدار سے ہٹ جانے کے بعد

اپنے نیک وغریب پرور مالک کی ذاتی کار چلا کر دہشت گردوں کے ایک حملے میں ان کی جان بچاتے بچاتے گرینڈ کو اٹھا کر دُور پھینکتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ قربان کر دیا تھا اور کبھی اُف تک نہ کی تھی بلکہ وہ یوں ظاہر کیا کرتا تھا گویا اپنے صاحب کی سلامتی کے لیے ایک کالے رنگ کا مرغا قربان کر دیا ہے۔ اس کا بیٹا ایک مجاہد نہ ہوتا تو اُس کو تخریب کاروں نے وقتاً فوقتاً کی مار پیٹ کی بجائے بارہ سال پہلے اوروں کی طرح مار کر کسی درخت پر لٹکا دیا ہوتا۔ کیونکہ وہ بھی تو آج تک اپنے آپ کو ایک کامریڈ یعنی روٹی کپڑا اور مکان کے لیے کی جا رہی جدوجہد کا ایک نڈر سپاہی سمجھتا ہے اور آج محلے والوں کو یہ یقین دلا کر آیا ہے کہ کیونکہ اب ایک غریب نواز نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے اس لیے مان لو تمھاری ساری مشکلیں حل ہو گئیں۔ بقول اس کے سلطان زین العابدین یعنی بڈشاہ بادشاہ کا سنہری دور پھر ریاست میں شروع ہوا ہے۔

بے چارے ڈرائیور بڈشاہ کو چاپلوسوں نے جب سلطان جمہور کا لقب دیا تو وہ کہنیاں مار کر چاپلوسوں کا دائرہ توڑ کر اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہو گیا تب وہ اپنے مالک کی تُرش آواز سن کر سکتے میں آ گیا۔ کیونکہ اس کے مالک نے اُس کے محلے والوں کی شکایات سننے سے پہلے اُس کو یہ بتا دیا کیونکہ وہ کار چلا نہیں سکتا اس لیے وہ اپنے بیٹے کو ہتھیار ڈالنے کی ہدایات دے تا کہ حکومت اس کو ایک کنڈکٹر بنانے پر غور کر سکے! بے چارہ کچھ کہنے سے پہلے سردیوں کے موسم میں اپنے حلق کو تر کرنے کی خاطر پانی کی تلاش کرنے چلا گیا تھا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا تھا!

یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو کر اس کی تلاش میں ہال سے نکلنے والا ہی تھا جب وہ یہ دیکھ کر گھبرا گیا کہ سلطان جمہور بیشتر لوگوں کے کام اپنے سکریٹری کو نوٹ کرا کر چند چنندہ لوگوں کو ساتھ والے کمرے میں گفت وشنید کے لیے لے گیا تھا اور وہ ہال میں اکیلا رہ گیا تھا کیونکہ باقی لوگ ہنسی خوشی جا چکے تھے۔

سکریٹری نے اس کو دیکھ کر اپنی فراخ دلی اور حکمران کی عوام پرستی کا ایک ساتھ مظاہرہ کر کے اس سے اپنی درخواست دینے کے لیے کہا تو اس پر گویا بجلی گر گئی۔

وہ اپنے دوست کی بے رُخی کو برداشت کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو تو گیا تھا مگر وہ جو بات اس کو بتانا چاہتا تھا وہ ان لوگوں کے بارے میں ہی تو تھی جن کو حکومت کو پچیس سال کے عرصے کے بعد حاصل کرنے والا، خفیہ طور پر بات کرنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں لے گیا تھا۔ سکریٹری سے ان کے بارے میں سرسری تفصیلات لے کر وہ اُن دیکھے چہروں کی شناخت

کرنے کے بعد اپنے دوست کے انجام کے بارے میں سوچ کر خوفزدہ ہو گیا! ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ چلا گیا ہوتا۔ اس نے انتظار کرنے کے لیے اصرار کیا تو سکریٹری نے حکمراں سے پوچھ کر اجازت بھی دی اور اس بار عزت بھی۔ اس کے لیے چائے بھی آ گئی اور وہ یہ تو جان گیا کہ حکمراں اپنے محسن کو بھولا نہیں ہے!

حکمران بھول بھی کیسے سکتا تھا۔ وہی تو وہ واحد آدمی تھا جو ایک ٹمٹماتے چراغ میں تیل بھی ڈالتا رہا۔ بتّی بھی بدلتا رہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے لَو کو بجھنے سے بچاتا رہا۔ اقتصادی طوفانوں سے بھی اور سیاسی آندھیوں سے بھی!

وہ مہاراجا چندر گپت موریہ کو راج پاٹھ دلانے والا چانکیہ پنڈت ہونے کا دعویٰ نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ مغل بادشاہ ہمایوں کو شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد اُس کو پناہ دینے والا وہ ثقہ تھا جو ہمایوں سے ایک دن کی بادشاہت مانگنے آیا تھا۔ بلکہ وہ بھگوان کرشن کے بچپن کا یار غریب سدماتھا جس کو بھگوان درشن دے کر مالا مال کرتا۔

وہ تو حکمران کا ایسا دوست تھا جو اُس کو کھلا کر خود کھانا کھایا کرتا تھا۔ اپنی زمین اور باغات بیچ کر اُس کے سیاسی پودوں کو سینچا کرتا تھا گویا وہی تو تھا جو اپنی حکمتِ عملی سے ایک ہارے ہوئے بادشاہ کے وفادار ساتھیوں، فوجیوں اور فرض شناس اہل کاروں کو ایک دوسرے سے ملایا کرتا تھا اور یوں وہ شہنشاہ ہمایوں کی طرح سلطان شیر شاہ سوری سے چھنی ہوئی سلطنت اُس کے جانشینوں کو ہرا کر پھر سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

کوئی تو اُس سے پوچھتا کہ وہ ایک ہارے ہوئے حکمران کا ساتھ کیوں دیتا رہا تا کہ وہ یہ تو بول دیتا کہ وہ ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ ایک ایسا شخص تھا جو گاؤں کو شہر بنانا چاہتا تھا۔ علم کے نور سے اپنی ریاست کو روشن کرنا چاہتا تھا۔ امیری اور غریبی کے فاصلے کو کم کرنا چاہتا تھا۔ انسانی رشتوں کو بہتر بنا کر فرقہ پرستی کا حال بدتر کرنا چاہتا تھا۔ ہر نوجوان کو ایک دہقان کی طرح محنتی بنانا چاہتا تھا۔ ایک بیج کو سربہ فلک درخت بنتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ کلاشنکوف سے نکلی بھیانک آوازوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو رہی دردناک نوحہ خوانی کی آوازیں سننے کی بجائے کھیتوں میں کام کرنے والوں کے گیت سننا چاہتا تھا۔ رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی دھماکوں کی آوازوں کی بجائے آبشاروں کی سریلی آواز سننا چاہتا تھا۔ سڑکوں پر افراتفری کا شور و غل سننے کی بجائے کھیل کے میدان میں بچّوں کا شور سننا چاہتا تھا۔ وہ فرشتوں کی نگری میں مندر کی گھنٹیوں اور اذان کی گونج سننا

چاہتا تھا۔ اپنے امن پسند ہم وطنوں کی طرح۔ اچانک اس کے احساسات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مہمانِ خصوصی جا چکے تھے۔ حکمران کا سکریٹری بھی جا چکا تھا۔

ہال میں وہ تھا اور اُس کے سامنے حکمران تھا جو مسکرا رہا تھا اور اپنے محسن کو یہ بتا رہا تھا کہ اس کے ساتھ اب ۸۰ فیصدی ایم ایل اے کے علاوہ بیوروکریسی کے دونوں دھڑے اس کے ساتھ ہیں اس لیے اس کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

دوست دوست کی باتیں سن کر خاموش رہا مگر ہال سے نکلتے نکلتے وہ بڑبڑاتا رہا — ارے یہی تو وہ لوگ ہیں جن سے دور رہنے کے لیے میں تمھیں بتانے آیا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کشتی میں چھید کر کے خود تو اُتر جاتے ہیں مگر حکمران کو کنارے پر بیٹھے سواگت کرنے والوں سے بہت دُور لے جا کر کشتی کو ڈبو دیتے ہیں۔

حکمران اپنی کامیابی پر خوش تھا اور اپنے آپ کو سلطان جمہور سمجھ کر اپنے محسن کو بھول گیا تھا جو بوجھل قدموں سے، جب حکمران کے آہنی گیٹ کے باہر آیا تو اس نے حکمران کے اُس کارکن کو دیکھا جو دور ایک پہاڑی گاؤں میں اپنے مخالفین کے عتاب کے باوجود اپنے آپ کو اپنے لیڈر سے الگ نہیں کر پایا تھا مگر آج وہ اس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا جب لیڈر دوڑا دوڑا آ کر اپنے محل میں ویسے ہی لے جائے گا جیسے وہ لیڈر کو کندھے پر اُٹھا کر ندی پار کر کے اپنے گھر لے جایا کرتا تھا۔

OO

دیوانگی

یوں تو ایک دشوار سفر طے کرنے کے بعد اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا ہی کامیابی کی شناخت ہے اور کامیاب انسان فخر سے اپنی کامیابی کی خوبیوں کا ذکر کرتا ہے، مگر یہ شخص اپنی کامیابیوں کی خامیوں کے بارے میں یوں سوچتا رہتا ہے گویا سمندر میں وہ سیپ ڈھونڈ رہا ہو جس میں اس کا مطلوب موتی ہو۔

یہ شخص بچپن سے ہی اوسط سے بہت زیادہ ذہین ہے۔ لڑکپن سائنس کی ایجاد کے بارے میں سوچ سوچ کر گزرا ہے اور رفتہ رفتہ جوانی میں وہ ایسی باتیں سوچتا رہا جسے دانشور تو کیا عام لوگ بھی ایک اچھے سائنس داں کی دیوانگی سمجھنے لگے تھے۔ پھر ناسا میں اپنی ایجادات یا چاند سیاروں پر زندگی کی معلومات کرنے کی بجائے زمین پر زندگی کو تروتازہ وشاداب اور پُرکیف بنانے کے لیے تجاویز دینے لگا تو دنیا کو ٹکنولائی ترازو پر ملی گراموں سے اپنی طاقت کا پلڑا بھاری دکھا کر دنیا کو اپنا غلام بنانے والوں نے اس کو اپنی عجیب وغریب فطرت کا غلام ہونے کے سبب ایسے حالات پیدا کیے کہ ایک مشہور اور معروف سائنس داں کو دنیاداری سے بیزار ہو کر جنگلوں میں زندگی بسر کرنے والا ایک زاہد بنادیا۔ گویا عادت عیب بن گئی، جنگلوں میں رہ کر بھی اُس کے زرخیز ذہن میں کائنات افروز پودے اُگتے رہے، یعنی کیسے جنگلوں کی مدد سے اُس حرارت کی سطح کو زمین کے قریب آنے سے روکا جائے جس سے برف کے پہاڑ، گلیشیر کو پگھلا کر سمندروں میں پانی کی سطح اتنی بڑھ جانے کا خدشہ ہے کہ آب زمین کو دبوچ لے گا۔ چڑھ رہا پانی اُبل کر آبی جانوروں کو جھلسا کر مار دے گا جبکہ زمین پر رہنے والے جاندار گرم پانی کا کفن اوڑھ کر پانی میں دفن ہو کر فنا ہو جائیں گے۔ لیکن ایسی آرزوئیں حسرتوں میں یوں بدلتی رہیں جیسے پانی کے بلبلے بود ہوتے ہی نابود ہوتے ہیں۔

ایک روز رامائن پڑھتے ہوئے اچانک ایک خیال منجھی ہوئی چٹکی سے نکلا، تیر دماغ میں اتنا گہرا اُتر گیا کہ نکال پھینکنے کو جی نہیں چاہا۔ ایک عام سی بات اس کے لیے خاص بن گئی اس لیے نہیں

کہ ڈارون نے یہ کیسے ثابت کیا تھا کہ انسان پہلے بندر تھا بلکہ اس لیے کہ جب ہم بندروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکے تو رام کے لشکر میں شامل بندر اور انسان ایک ساتھ راون کی فوج کے ساتھ کیسے لڑ پائے تھے۔ پھر کیا تھا، ایک پروجیکٹ کی شروعات ہوئی۔

پہلی بار اُس نے بندر کے ساتھ دوستی کی لیکن پورے اعتماد سے اُس نے اپنے دوست، جس کا نام اُس نے ہنومان رکھا تھا، کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو ہنومان اُس پر یوں ٹوٹ پڑا گویا ایک بلی نے چوہے کو دبوچ ڈالا تھا۔ پھر اس نے بندروں کی طرح درختوں کی شاخوں پر اچھل کود کر کے اپنے جسم کو لہولہان کر دیا، بلکہ بندروں کی طرح اپنے جسم کو ناخنوں سے کھرچتا رہا، پلٹیاں بھی مارتا رہا جو دیکھ کر بہت سارے بندر بھی اس کے دوست بن گئے، وہ سمجھتا رہا کہ بندروں سے اس کی دوستی ہو گئی مگر ایک روز جب اس نے ہنومان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مشکلاً اپنی آنکھیں بچا پایا۔ ایک ضدی سائنس داں نے ہوابازوں کی پوشاک پہن کر ہنومان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا۔ اُس نے معمول کی طرح چنے، کیلے، پھل اور روٹیاں اپنے آشرم کے اِردگرد پھینک دیے تا کہ بندر قریب آجائیں۔ پھر بھی وہ خوش تھا کیونکہ اُس نے ہنومان کی آنکھوں میں جھانک کر خوف کے تاثرات دیکھ لیے تھے۔ یہ اس کی کامیابی کے عکس تھے۔ یعنی خوبی تھی! مگر حسبِ عادت اُس نے کامیابی میں خامی بھی دیکھ لی اس لیے اپنی فطرت کا غلام اپنے آقا کے حکم پر ایک سائنس داں کی طرح سوچ میں ڈوب گیا اور ایک خط لکھ کر ناسا والوں کو یہ اطلاع دی کہ ہو سکتا ہے چاند پر زندگی ہو لیکن بندروں کی طرح ہمارے چاند پر جانے والے ایسٹروناٹس کی پوشاک دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چھپ جایا کرتے ہوں! اس کے بارے میں غور کرنے کی ضرورت ہے، نہ کہ تیل سے بھرے صحراؤں میں بموں کی بارش کرنے کی اہمیت ہے!

کسی نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا۔

گویا پہلی بار اس کو نہ اپنی منزل مقصود میں خوبیاں نظر آئیں اور نہ خامیاں۔ آہ بھر کر اُس نے اپنی کاوشوں کو دیوانگی کا نام دے کر اپنے آپ کو آشرم میں بند کر کے ایک کھنڈر بنا دیا۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا کی طرح!!

OO

فغاں کیوں؟

ہم دونوں کی منزل ہمارے سامنے ہے مگر نوجوان بہت خوش ہے اور میں مایوس! زبردست بارش کی وجہ سے وہ بھی میری طرح پریشان تو ہے مگر بارش کے تھم جانے کا انتظار نہایت بے فکری سے کر رہا ہے جبکہ میرے لیے ہر لحہ قیامت خیز ہے! حالانکہ برگد کے پیڑ کو دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے! اَن گنت شاخیں! کچھ آسمان کو چھو لینے کی کوشش کر رہی ہوں گویا! کچھ زمین کے متوازی، بارش سے بچنے کی کوشش کر رہی ہوں گویا۔ کچھ لٹک رہی ہوں یا زمین کو چوم چوم کر ایک ساتھ جڑیں پکڑ کر ناظرین کو بھگوان شنکر کی جٹاؤں کے درشن دے رہی ہوں! ایک عقیدے کے مطابق برگد کے پیڑ کی جڑوں میں برہما براجمان ہوتے ہیں۔ گویا میرے سامنے جنم اور مَرن کے سلسلے کا ایک ایسا منظر ہے جس کے بارے میں، میں نے سنا تھا۔ یعنی پیدا کرنے والے برہما اور ابدی نیند سُلانے والے شیو شنکر بھولے ناتھ۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک جسم میں جان ڈال دیتا ہے اور دوسرا جسم سے روح الگ کر کے مٹی کو مٹی سے ملا دیتا ہے۔

میرے نوجوان ہم سفر کو نہ ایسے فلسفوں کے بارے میں معلومات ہیں اور نہ اساطیری جانکاریوں کے بارے میں تجسّس! بلکہ اس کا رویہ بھی تذبذب کے مختلف رنگ دکھا رہا ہے۔ مگر خدشات کا بھاری بوجھ ذہن پر برداشت کرنے کے علاوہ میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا ہوں نا؟

نوجوان کا چہرہ شناسا تو ہے مگر نہ جانے وہ ایک اچھی طرح میری دیکھ بھال کرنے والا ہم سفر ہوتے ہوئے بھی مجھے اجنبی سا لگتا ہے! وہ مجھے اتفاقاً تب ملا تھا جب میں ایک طویل عرصے کے بعد ایک مٹی کی مورتی بنا کر یہ سوچ رہا تھا کہ اس مورتی کو آگ سے ہرگز ہرگز نہیں گزاروں گا! وجہ یہ کہ مورتی بھگوان شنکر کی ہے اور بھگوان کی مورتی مجھ سے یہ مانگ نہیں کر سکتی کہ جسم بنانے والے مجھے روح دو؟ اور مجھے زندہ رہنے کا حق دو؟ کیونکہ مجھے ماں کی بات آج بھی یاد ہے۔ میری عمر تب تقریباً آٹھ نو سال تھی۔

سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ میری ماں مجھے سردیوں میں اپنے کمرے کے دروازے کے باہر بلا اجازت جانے نہیں دیا کرتی تھی۔ مگر میں کسی نہ کسی بہانے وقفے وقفے کے بعد اپنے گھر کے بہت بڑے صحن کے چکر لگایا کرتا تھا اور نہ جانے کیوں شیشے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے والا بزرگ مجھے ہر بار دیکھ کر اپنے کمرے میں جانے کی ہدایات دیا کرتا تھا، کبھی پیار سے اور کبھی غصے سے!

اپنی عادت سے مجبور میں ایک صبح جب گھر سے باہر نکلا تب برف باری شروع ہوئی تھی! پھر میں دن بھر اپنے اَدھ کھلے گھر کے دروازے سے برف کو دیکھتا رہا۔ برف باری تھم گئی تھی اور میں نے ٹھٹھر رہے ہاتھوں سے پہلے برف کو چھوا تھا اور پھر خوش ہو کر اس کو سمیٹ کر ایک گولہ بنایا تھا۔ بزرگ کی آواز سن کر میں اندر تو جایا کرتا تھا مگر اپنی ماں کو چکمہ دے کر بار بار پھر باہر آ کر گولے کے اوپر اور برف کے گولے رکھ دینے کی خاطر۔ گولے ایک دوسرے پر رکھتے ہی سرد ہواؤں کی وجہ سے جڑ رہے تھے۔ یوں شام تک گولے ایک دو فٹ کے منفرد شکل میں جڑ گئے تھے۔ رات کو پھر برف باری ہوئی تھی۔

صبح سویرے جب میں نے عادتاً اَدھ کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا تھا تب میں نے دوڑ کر اپنے گھر کے پوجا کے کمرے سے ایک تصویر نکال کر اپنی ماں کو دکھا دی۔ جب ماں نے بتایا کہ تصویر برف کے بنے ہوئے بھگوان شنکر کی تصویر ہے تب میں نے اس کو آنگن میں لا کر یہ بتایا کہ ماں میں نے بھی بھگوان بنا دیا!

میری ماں نے میرے منہ پر ایک زور کا طمانچہ رسید کر کے کہا۔ 'بے وقوف! انسان بھگوان کو نہیں بنا سکتے۔ بھگوان انسان کو تو کیا دنیا کو بنانے والے ہیں!'

جب بھی کسی بوڑھے کو بچپن کی یاد آتی ہے تب کوئی ایسا گزرا لمحہ، جو اُس وقت کے لمحات سے جُڑ کر ذہن میں کوئی اَمٹ تاثر چھوڑ جائے تو وہ غیر دانستہ طور پر بھی یادداشت کا حصہ بن جاتا ہے۔ پھر جب بھی یاد آتا ہے ایک نئی کہانی کا بھی حصہ بن جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو زندگی کے سفر میں شریک ہو کر سوچ سمجھ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ آج مجھے بھی اپنی زندگی کے سفر میں چند گزرے واقعات یاد آ رہے ہیں وہ بھی تقریباً نصف صدی میں گزرے واقعات!

میری عمر تب تقریباً چودہ سال تھی۔ میں اپنی انگلیوں سے کھڑکیوں کے شیشوں پر لگی کہرے کی تہہ پر لکیریں لگاتے ہوئے اپنی کھینچی ہوئی تصویر کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ میں اپنے والد صاحب کو اپنی تخلیق دکھانا چاہتا تھا۔ میں ان کو آوازیں دیتا رہا لیکن جب تک وہ

میرے کمرے میں آتے تصویر چند پانی کے قطرے بن کر بہہ گئی تھی۔ میرے والد صاحب کو ہنسی آ گئی تھی اور انھوں نے مجھے یہ بات سمجھائی تھی کہ پانی، ہوا اور آگ پر لکیریں نہیں لگائی جا سکتی ہیں۔ میرے اندر جھانک کر انھوں نے میری تخلیقی صلاحیتوں کو دیکھ لیا تھا اس لیے انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے آنگن میں جمع تازہ گری ہوئی برف کے چھوٹے چھوٹے گولے بنا کر دے دیے تھے اور مجھے وہ مجسمہ بنانے کے لیے کہا تھا جس کو میں نے پانی کی لکیروں سے بنایا تھا۔ میں نے ایک اَن دیکھے انسان کا مجسمہ تیار کر دیا تو محلے والے میری تخلیق کو دیکھنے آئے تھے۔

کھڑکی سے جھانک رہا ہمارا بزرگ پڑوسی یہ منظر دیکھ کر چلا آیا تھا۔ 'یہ گناہ ہے! یہ مجسمہ اگر تم سے روح مانگ لے تو کیا تم دے سکو گے؟' پھر دن میں بھی رات کا سناٹا چھا گیا تھا! مگر بزرگ نے تھوڑی دیر بعد خاموشی توڑ کر کہا تھا: 'اس مجسمے میں ہوا ہے نہ پانی ہے۔ نہ مٹی ہے اور نہ اس نے آگ سے گزرنا ہے! دُھوپ سے پگھل جائے گا۔ ہوا ہوا کے ساتھ مل جائے گی اور پانی بہہ جائے گا۔'

وہ بات یاد آ گئی تو جوانی کی باتیں یاد آتی رہیں۔ خاص طور پر جو میری تخلیقی صلاحیتوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ میں تیس برس کا تھا اور اپنے فنونِ لطیفہ کے شوق کی بجائے اپنے پیشے میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔

ایک دن میں نے ایک کمہار کو ایک پہاڑی سے مٹی نکالتے دیکھا۔ اس کو دیکھنے کی دلچسپی تب پیدا ہوئی تھی جب میں نے اس کو کام کرتے گیت گنگناتے ہوئے سنا تھا۔

اپنے گیت میں وہ یہ بتا رہا تھا کہ اس مٹی کو کاٹ کر اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ وہاں میں پہلے خشک مٹی کو کوٹ کوٹ کر چکّی میں پیسے ہوئے آٹے کے موافق بناؤں گا۔ پھر اس کو پانی سے نم کر کے اپنے دونوں پاؤں سے روندوں گا۔ پھر چھوٹے چھوٹے مٹی کے تودوں کو پوری طاقت سے ایک بھاری لکڑی سے پھر کوٹوں گا۔ پھر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اپنے چکر پر رکھ کر نرم مٹی کو پیار سے تھپکیاں دوں گا۔ پھر پیار اور احتیاط سے اپنے ہاتھوں اور انگلیوں سے اپنے ہنر کی بدولت طرح طرح کے برتن بناؤں گا۔ ان کو ہوا اور دُھوپ میں سکھا کر صرف مٹی کو آگ میں ڈال دوں گا۔

اے میرے خدا تم بھی تو ایسا کرتے رہتے ہو! کسی کو آگ سے گزار کر زندگی اور موت دیتے ہو! میرے بنائے ہوئے برتنوں کو یہ شرف کیوں عطا نہیں فرماتے؟

میں نے کمہار سے تھوڑی مٹی لے کر ایک ایسا بُت بنا دیا جو امن کی علامت تھا اور کمہار سے کہا کہ امن کے اس فرشتے کو بھی اپنے برتنوں کے ساتھ آگ میں پکا دو۔

کمہار نے بُت کو غور سے دیکھا تھا اور آہ بھر کر بولا تھا۔ 'اے نیک انسان! میں جانتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو اور کیوں ایسا چاہتے ہو! میں تمھاری مدد کروں گا لیکن اپنے امن کے فرشتے کے لیے روح کہاں سے لے لاؤ گے!'

'ہاں دیوی دیوتاؤں یا دُنیا بنانے والے بھگوان کی تینوں شکلوں کو تم بنا سکتے ہو۔ مگر وہ بھی پتھر کے یا دھات کے، کیونکہ بھگوان تم سے روح نہیں مانگے گا! وہ خود جس میں داخل ہو جائیں وہی جاندار ہے۔ کیچڑ سے میں برتن تو نہیں بنا سکتا مگر وہ چاہے تو کیچڑ میں کمل کا پھول اُگا کر خود اُس پر براجمان ہو کر روح کو ایک جسم سے نکال کر دوسرے جسم میں ڈال سکتے ہیں'۔

کمہار کی باتیں سن کر تب میں نے اپنی بنائی ہوئی مورتی اُسی تیز رفتار ندی میں بہا دی تھی جس میں میں نے اپنی دادی کی راکھ بہائی تھی۔ اور مورتیاں بنانے کے شوق کو اپنے دل و دماغ میں قید کر دیا تھا۔

تب سے اب تک شیطانی تخلیقی ذہن والوں نے بُت کی بجائے بم بنا دیے کیونکہ وہ روح کے بغیر بھی کام کر سکتے ہیں۔ میں عقیدت پرست بن کر خوب مطالعہ کرتا رہا کہ شاید مجھے خدا ملے اور یہ بتا دے کہ میں اپنے تخلیق شدہ امن کے فرشتے کے لیے روح کہاں سے لاؤں! آخر کسی اساطیری کتاب سے جب یہ پتہ چلا کہ برگد کے پیڑ کی جڑوں میں برہما، تنے میں وِشنو اور شاخوں میں شنکر بھگوان رہتے ہیں تو میں نے جو مٹی کا مادھو بنایا تھا وہ ساتھ لے کر اپنے ہم سفر، اجنبی دوست کے ساتھ بارش تھم جانے کا انتظار کر رہا ہوں۔

بارش تھم گئی ہے اور میرا ہم سفر جلدی جلدی برگد کے پیڑ کی جڑوں اور کھوکھلے تنے سے چھپائے ہوئے ہتھیار نکال کر جا چکا تھا۔ میں نے جب پوجا پاٹھ ختم کر دی اور میں نے اپنے ساتھ عقیدت کے پھولوں میں لپٹے اپنے مٹی کے مادھو میں بھگوان کو داخل ہونے کے لیے تقریباً تقریباً راضی کر لیا تب میں نے دیکھا کہ میری بنائی ہوئی مورتی کی مٹی برگد پیڑ کی جڑوں میں ہوا اور پانی کے ساتھ چلی گئی تھی — گویا میرے نوجوان ہم سفر کو سحر انگیز جزا اور مجھے قہر انگیز سزا مل گئی — تو پھر فغاں کیوں —؟

○○

عزم

دونوں کا عزم اتنا بلند ہے کہ وہ کنجشک کو بچانے کے لیے اونچی پرواز کرنے والے شاہین کو پکڑ سکتے ہیں لیکن کچھ کرنے سے پہلے ہی ناکامیابیوں کے بادِ صرصر سے مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال پاتے ہیں، وہ بھی اپنے عزم کی بلندی کی وجہ سے!

وہ اپنی ناکامی سے خوف زدہ ہونے کی بجائے اپنی خوبیوں سے اپنی خامیوں پر توجہ مرکوز کر کے کسی بہتر تجویز پر غور کرتے ہیں، لیکن آج مشرق کو مغرب، شمال کو جنوب سے الغرض ساری دنیا کو ایٹمی توانائی سے پیدا ہوئی حرارت کی اُس سطح کو روکنے اور صدیوں پرانے گلیشیروں کو پگھل کر سمندروں کی سطح تک بڑھ جانے کے معقول سیمینار میں حصّہ لینے کی خاطر آئے تھے تاکہ سات سمندروں کے ایک ہو جانے سے زمین کو ڈوب جانے سے بچایا جا سکے۔ یعنی زمینی جان داروں کو بچایا جا سکے، بلکہ اُبل رہے سمندروں کے پانی سے پانی میں رہنے والے جانداروں کو بچایا جا سکے۔

اُن کی تجویز یہ تھی کہ ایٹمی قوت سے بجلی پیدا کی جائے نہ کہ آگ!

اس سے پہلے کہ امن پسند ممالک کے سائنس داں ان کے مشورے پر کچھ کہہ پاتے، ایٹمی طاقت کے بل بوتے پر خاقانِ جہاں بننے والوں نے نہ صرف تجویز کو مسترد کر دیا بلکہ ان کے حکم پر حکومت نہ کرنے والوں کو یوں دبا دیا گویا چیونٹیوں کو میخ دار جوتوں سے کچلنے کے اشارے دِیے گئے ہوں۔

دونوں سائنس داں اس بار اس قدر لڑکھڑاتے رہے گویا غم کو شراب میں یوں ڈبو دیا تھا جیسے ایک گہری جھیل میں ٹوٹے گلدان لرزتے ہوئے مہکتے پھولوں کو اپنی گود سے پھینک کر پانی کی تہیں کاٹ کاٹ کر اپنی آخری منزل ڈھونڈ رہے تھے۔

دراصل دونوں نے بہت شراب پی لی ہے اور وہ ایک انجانے راستے پر چلتے چلتے باتیں کرتے ہوئے ایک بے شکل کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اچانک ایک سائنس داں کے قدم تھم گئے اور وہ چونک کر چلاّنے لگے — ''دیکھ، دیکھ —

اِدھر اُدھر دیکھ، چار سو دیکھ! سمندروں، جھیلوں، کنوؤں، چشموں، ندی نالوں اور دریاؤں کا سارا پانی ایک پرندہ پی گیا! اب پیاس لگے تو کیسے بُجھائیں؟''

دوسرا ہنس پڑا اور اعتماد سے بول پڑا — ''شبنم سے! بارش سے! برف سے!''

پہلا بوکھلا کر بول پڑا — ''سمندر نہیں تو بھاپ نہیں۔ بھاپ نہیں تو آکاش میں بادل نہیں۔ بادل نہیں تو نہ بارش ہو سکتی ہے اور نہ برف باری!''

دوسرا ہنس پڑا اور بول پڑا — ''دو حصے ہائڈروجن کے اور ایک حصّہ آکسیجن کا۔ دونوں کو ہوا سے نکال دیں گے اور ہم پانی بنا دیں گے۔ اور ہوا پر کسی ملک کا دعویٰ نہیں۔''

پھر وہ دونوں بڑبڑانے لگے ''ہمارا عزم بلندی پر ہے مگر ہمارے پیر زمین پر کیوں ہیں؟''

اچانک پہلا خوشی سے اُچھل کر بول پڑا — ''آواز سن رہے ہو۔ پرندہ ہمارے عزم سے ڈر کر پانی اُگل رہا ہے۔ پھر سمندروں میں پانی جمع ہوگا۔ یہ پانی کی لکیر ہی ندی بن جائے گی۔ ندی دریا، دریا سمندر میں ہی تو گر جائے گا نا۔''

دوسرا بول پڑا گویا اپنے عزم کی بلندی بتا رہا ہو۔ ''پانی کی لکیر دیکھ لوں گا، مگر پیشاب تو کرنے دو۔ میرے ہم نفس، میرے ہم نوا!''

OO

اَن کھی محبت کی داستان

مقطم قاہرہ میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے دریائے نیل کے کناروں پر بسا سارا شہر یعنی مصر کی راجدھانی یوں نظر آرہی ہے جیسے مغل بادشاہ شاہجہان کو آگرہ کے قلعے سے جمنا کے کنارے اپنی معشوقہ کی یاد میں بنایا ہوا تاج محل نظر آیا کرتا تھا۔ ویسے ہی مجھے مقطم سے 'فیروز' کے بنائے ہوئے پریمیڈس نظر آرہے ہیں۔ دونوں ہی دنیا کے عجوبوں میں شامل ہیں۔

تاج محل دو پیار کرنے والوں کا مقبرہ ہے جبکہ پریمیڈس میں صدیوں پرانی ممیز (Mummies) رکھی گئی ہیں۔ وہ اس لیے کہ مصر کے قدیم باشندے 'فیروز' (Pheros) کے عقیدوں کے مطابق موت کے بعد بھی زندگی جاری رہتی ہے اس لیے مرنے والے کی تمام پسندیدہ چیزیں ساتھ رکھ کر مردہ یعنی بے جان جسموں کو نایاب دوائیاں لگا کر صندوقوں میں بند کیا جاتا تھا جو صدیوں بعد بھی بے جان جسموں کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ آج کل وہاں سب سے اونچے پریمیڈس میں ایک نمائش ہوتی ہے جس میں 'فیروز' کے بارے میں اہم معلومات کے علاوہ تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ممی (Mummy) رکھی گئی ہے۔

دوسرے سیاحوں کی طرح میں بھی اس کرشمے کو دیکھتا رہا۔ اچانک ایک آواز میرے کانوں میں گونج اُٹھی۔

''تم ہندو ہو نا! تمھارے عقیدوں اور ہمارے عقیدوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے! تم بھی آفتاب اور دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہو اور ہم بھی۔ تم سمجھتے ہو کہ روح غیر فانی ہے اور جسم فانی ہے! ہم سمجھتے ہیں کہ جسم فانی نہیں ہے۔ اور اس میں روح رہتی ہے! تم مردہ جسموں کو جلا ڈالتے ہو جبکہ ہم جسم کی حفاظت کرتے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتا ممی کے ہونٹ تواریخ کے اوراق کی طرح ہلتے رہے اور ایک آواز میرا تعاقب کرتی رہی۔

''تم یہ تو جان گئے ہو کہ ان پریمیڈس کو بنانے کے لیے دریائے نیل کو پار کر کے کشتیوں میں پتھر لانے والوں میں میرا محبوب بھی تھا۔ وہ ایک شاہی خاندان کا غلام تھا جو پتھروں کو گھسیٹتے ہوئے مرگیا تھا۔ وہ آس پاس یہیں کہیں دفن ہوا ہے۔

تمھارے عقیدوں کے مطابق روح جسم بدلتی رہتی ہے۔ کیونکہ تمھارے خدوخال میرے محبوب سے ملتے جلتے ہیں۔ کہیں تم وہی تو نہیں ہو؟ اور اگر تم وہی ہو تو یا تو تم بھی ممی (Mummy) بن جاؤ یا پھر مجھے اپنے عقیدوں کے مطابق میری تڑپ رہی روح کو ایک نیا جسم دو۔''

مقطم میں کھڑا ڈوبتے سورج کو دیکھ کر وہ چاندنی رات یاد کرتا رہا جب میں پُرکشش تاج محل کو دیکھتے دیکھتے سوچتا رہا تھا کہ محبت کے اس یادگار عجوبے کے پاس یا آس پاس کتنی محبوباؤں کے محبوب دورانِ تعمیر سنگِ مرمر لاتے ہوئے دفن ہوئے ہوں گے جن کا ذکر کہیں نہیں کیا گیا ہے۔

OO

یادش بخیر

میں! ہاں میں۔ ایک بے روح کمرے میں ایک بے رُوح زندگی گزار رہا ہوں! ہاں زندہ تو ہوں کیونکہ سانسیں چل رہی ہیں — مگر اکثر جب بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں تب یوں محسوس کرتا ہوں جیسے کمرے کی مانوس چھت کی بجائے نیلے آسمان کو دیکھ رہا ہوں۔ تیرتے ہوئے یادوں کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا ہوں۔ بادلوں سے بنتی بگڑتی تصویریں دیکھ رہا ہوں۔ کچھ دل کو لبھانے والی تصویریں۔ اور کبھی ڈراؤنی تصویریں۔ کبھی یوں محسوس کرتا ہوں گویا کوئی شناسا، پیارا سا چہرہ نظر آتے ہی چار سو خوشبو بکھیر کر کچھ لمحوں کے لیے تازگی بخش دیتا ہے۔ خوشبو بول اُٹھتی ہے اور بچپن کی سہانی یادوں کا ذکر چھیڑ کر لڑکپن کی شرارتوں، جوانی کے الھڑ پن اور رفتارِ وقت کا احساس دلا کر میری زندگی کے سفر کی داستان مجھے ہی سنا دیتی ہے — مگر کیوں؟ اور وہ بھی اب جب زندگی کی شام کروٹ بدل کر رات کے پہلے پہر میں داخل ہو رہی ہے۔ کون جانے اس رات کا سویرا ہو یا نہ — !لیکن آج شام ٹیلی ویژن بند کرنے سے پہلے اچانک میری نگاہیں ایک نئی اداکارہ کے چہرے پر رُک گئیں کیونکہ چہرہ تصوّر سے اُبھر کر نہیں آیا تھا بلکہ میرے سامنے تھا اور کوئی اُس کا انٹرویو لے رہا تھا۔ چہرہ شناسا سا تھا، ہاں لباس مختلف تھا۔ کیا یہ میری سارہ (سائرہ) کی ماں ہے؟ نہیں، نہیں وہ میری ماں کی عمر کی تھی! کیا یہ سائرہ ہے؟ نہیں نہیں۔ وہ میری ہم عمر تھی اور پینسٹھ سال کی عمر میں وہ اتنی نازک بدن اور پتلی کمر والی نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ تو اُس کی پوتی یا نواسی ہو سکتی ہے۔ یعنی میری سارہ کی ہم شکل! لیکن حق صاحب کے خاندان کی کوئی فرد کیا ایک ماڈل و اداکارہ بن سکتی ہے؟ — یہ سوچنا تو ایک بہانہ بن گیا یادوں کے ایک سلسلے کی شروعات کے لیے۔ اور جبکہ میری بیوی یہ سوچ کر سو گئی ہے کہ لائٹ آف کرتے ہی دوائیوں کے اثر سے میں گہری نیند سو جایا کرتا ہوں۔ یادوں کی تاثیر کی وجہ سے میں کروٹ کے ساتھ کبھی سائرہ، کبھی سرسوتی، کبھی موہنی، کبھی راحت کے

ساتھ گزارا وقت یاد کرتا رہا۔ کچھ محسوس کر کے سوچتا رہا۔ کبھی سوچ کر کچھ سمجھتا رہا اور یوں کبھی قربت کی سہانی آنچ محسوس کرتا رہا اور کبھی دوریوں کی دردناک شدّت محسوس کرتا رہا۔

سائرہ میری پہلی دوست یا محبوبہ تھی۔ وہ میرے گھر سے دور سہی مگر میرے ہی محلے میں رہا کرتی تھی۔ چونکہ اُس کے والد محترم محلے کے بچوں کو شوقیہ اُردو کی خطاطی کا ہنر مفت سکھایا کرتے تھے میں بھی واحد ہندو لڑکا تھا اس لیے حق صاحب مجھ میں ذاتی دلچسپی دکھایا کرتے تھے۔ یوں سائرہ اور میں زیادہ وقت ایک ساتھ گزارا کرتے تھے۔ چونکہ میں باتونی تھا اس لیے وہ میری باتیں خاموشی سے سنا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی پیارے سے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ مسکراہٹیں بے ساختہ ہنسی اور قہقہوں میں بدل گئیں مگر میرے دس جملوں کے جواب میں وہ مسکرا کر یا آنکھوں کے تاثرات کی مدد سے صرف ایک جملہ کہہ کر میری بولتی بند کیا کرتی تھی۔ مگر روز وہ ایک سیب، بتاشے، کھجور دیا کرتی تھی۔ ایک روز میری ناک سے خون بہتے ہوئے دیکھ کر زبردست برف باری میں ننگے پاؤں محلے میں رہنے والے ایک کمپاؤنڈر کو اپنے ساتھ لے آئی تھی اور جب خون رُک گیا تھا وہ بے ساختہ رو پڑی تھی، اور مجھے میرے درد کی شریکِ کار کا احساس دلانے کے لیے وہ بار بار گرم گرم دودھ پلاتی رہی تھی۔ وہ بھی تب جب ان کے بڑے مکان میں ہم دونوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

ہمارے ماما جی ہمیں ہر جمعرات کو فلم دیکھنے کے لیے Free Passes دیا کرتے تھے اس لیے کم عمری میں ہی میری سوچ پر فلمی رنگت چڑھ گئی تھی اس لیے میں اپنے آپ کو راج کپور اور سائرہ کو نرگس سمجھ کر چاہت کے جذبے کو محبت سمجھ کر تصور میں اُس کے ساتھ فلمی گانے گایا کرتا تھا کیونکہ اُس کے والدین کے سامنے میں خود بھی گنگنانے سے گریز کیا کرتا تھا۔ پھر ایک دن جب ہم دونوں ایک دوسرے سے نیم چپک کر ایک ہی کمبل اوڑھ کر اور اپنے پاؤں اپنی اپنی کانگڑی پر رکھ کر اکثر اپنے ایک پیر سے دوسرے کے پیر کو چھیڑ کر خوش ہو جایا کرتے تھے اور یوں ایسا عمل ہمارا معمول بن چکا تھا اس لیے اُس منحوس دن بھی ہم میرا اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک فلمی میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے بہت خوشی کا اظہار کر رہے تھے جب یہ منظر دیکھ کر سائرہ کے ابا نے نہایت حلیمی سے کہا کہ کیا بھائی بہن ایسی نازیبا حرکتیں کرتے ہیں؟ چونکہ فلموں میں ایسا نہیں ہوا کرتا تھا۔ میں شرمندہ ہو کر وہاں سے نکل کر اتنی تیز رفتار سے دوڑ کر اپنے گھر میں گھس گیا تھا گویا

ایک ملزم کو چھپ جانے کے لیے ایک محفوظ جگہ مل گئی تھی۔

میرے مرحوم والد ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ چونکہ اپنے والدین کے سائے سے کم عمری میں ہی محروم ہو کر رہ گئے تھے اس لیے وہ سری نگر میں اپنی بڑی بہن کے گھر کے فرد بن گئے تھے۔ چونکہ وہ ہمیں دادی کا پیار دیا کرتی تھی مگر ہم پھوپھی کے مکان میں رہ نہیں سکتے تھے اس لیے اکثر کرائے پر لیے ہوئے مکانوں میں رہنے کے لیے محلے بدلتے رہتے تھے۔ اس بار بھی ہمیں سائرہ کا محلہ چھوڑنا پڑا تھا اور یوں سائرہ کے لیے چاہت کا جذبہ محبت اور پھر عشق میں تبدیل نہ ہوسکا۔ ہوا ہوتا تو شاید ہم ایک دوسرے سے والہانہ پیار کرنے کے باوجود فلموں کے انجام سے کوسوں دور رہ کر ایک دوسرے کو گنہگار بنا کر معاشرے کے علاوہ سیاست کے شکار ہو کر بدنام ہو جاتے۔ 'رسوائی' ایک ہندو لڑکے اور مسلم لڑکی کی محبت کا عنوان بن جاتا۔ اپنے اُردو کے ٹیچر حق صاحب گویا ایک فرشتے ثابت ہوئے تھے۔ غالباً وہ ہم دونوں کی قربتوں سے زیادہ اُن دوریوں کے بارے میں فکر مند تھے جو ناطوں کو رشتوں میں بدلتے وقت مذہب کو رُکاوٹ بنا لیتی ہیں۔ محبت ہَوا اور پانی کی طرح بے رنگ ہے۔ مگر پھر بھی تضاد کیوں؟ ہاں اگر فتنہ گروں کو موقع ملے تو پانی میں بھی آگ لگا دیتے ہیں جو حق صاحب نے ہونے نہیں دیا۔

اور یوں میرے پہلے پیار کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ تقریباً دو سال ایک دوسرے کے دل سے قریب رہ کر، یہ احساس دلا کر کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک ہندو، دوسرا مسلمان، جو ایک جیسے ہو کر بھی الگ الگ ہوتے ہیں! اب تقریباً پچپن سال بعد مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے وہ میرے لیے ایک سانحہ اس وجہ سے بن گیا تھا کیونکہ ایک قہر آلود حادثے کا شکار ہوا۔ ایک ہرا بھرا شاداب درخت اس لیے سوکھ گیا تھا کیونکہ اُس کی جڑیں اس وجہ سے کاٹ دی گئی تھیں کہ میں ہندو اور سائرہ مسلمان تھی۔ کاش مجھے یہ بات تب سمجھا دی گئی ہوتی جب میں حق صاحب کے گھر میں داخل ہوا تھا۔

سائرہ مجھے ایک بار ملی تھی۔ وہ بھی ایک مغل باغ میں۔ ہم دونوں تیرہ سال کے تھے اور اپنے اپنے اسکول کے ساتھ نشاط باغ کی بہار دیکھنے آئے تھے۔ میرے دل میں چور چھپا بیٹھا تھا جو اپنے ہی چھین لیے انمول موتی کو چُرا لینے کی ضد پوری کرنے کی خاطر کوئی تباہ کن قدم اُٹھا کر سیاست کے چنگل میں پھنس نہ جاتے، میں نظریں چراتا رہا مگر سائرہ خود ہی میرے سامنے کھڑی ہو کر مسکرا کر پوچھ بیٹھی تھی کہ: 'ماں کیسی ہے؟ ملنے آتی لیکن ابا بھی نہیں جانتے کہ تم کس محلّے میں

رہتے ہو؟ سنا ہے تم نے اسکول بھی بدل لیا ہے؟ خیر، پڑھائی پر دھیان رکھنا۔ اور ہاں ماں باپ کو دکھ نہ دینا۔ اپنے تمام سکھ قربان کرکے۔ میری طرح —!' میں ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے پایا تھا لیکن ہر سوال سن کر یہ احساس ہوا تھا کہ بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوریاں سوال و جواب کیے بغیر سمجھ جاتی ہیں۔ اور سمجھوتے کرتی رہتی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ کیا سائرہ کو کبھی ان دنوں کی یاد آتی ہوگی؟ مجھے کیوں یاد آتے رہتے ہیں وہ بیتے ہوئے دن؟

میری زندگی میں جو دوسری لڑکی آئی وہ اُس گھر میں رہتی تھی جہاں ہم کرایہ دار تھے۔ نام موہنی تھا اور شکل وصورت سے وہ ایک پری تھی۔ اتنی گوری تھی کہ پانی پیتے وقت اس کی نسوں سے پانی کا بہاؤ نظر آیا کرتا تھا۔ وہ اکثر میرے سامنے اپنے بال کھلے چھوڑ کر مجھے کسی فلم کا پُرکشش منظر یاد دلایا کرتی تھی۔ اُن دنوں عام گھروں میں ٹوتھ پیسٹ کا استعمال نہیں ہوا کرتا تھا اور کریم پاؤڈر یا خوشبودار تیل کا استعمال بھی نہیں ہوا کرتا تھا لیکن موہنی کے دانت موتیوں کی طرح چمکتے رہتے تھے۔ جسم سے کچی مٹی کی خوشبو آتی تھی۔ سیدھے سادے میلے کچیلے کپڑوں میں باس نہیں آیا کرتی تھی۔ وہ بہت کم بولا کرتی تھی اور اپنے نئے گھر میں وہی تو تھی جو دیکھتی کم تھی اور گردوپیش کا جائزہ زیادہ لیا کرتی تھی۔ موہنی چونکہ اپنی بے پناہ خوبصورتی کی وجہ سے جہاں بھی جایا کرتی تھی ناظرین کی دلچسپی کا موضوع بن جایا کرتی تھی اس لیے وہ اپنی تعریفیں سن کر اپنی صورت سے اس قدر بیزار تھی کہ چیخ کر کہا کرتی تھی کہ میں بدصورت کیوں نہیں ہوں؟

موہنی کو فلمی اسٹائل میں، میں نے پہلی ہی نظر میں دل دیا تھا، ہاں مگر وہ میرے ساتھ فلمی گانے گانے کی بجائے پہلے دن سے ہی کسی نہ کسی بہانے اپنے سینے سے لگا کر کہا کرتی تھی کہ یہ رادھا کا کرشن کہاں سے آ گیا؟ شروع شروع میں مجھے اس کا بے وجہ لپٹنا اچھا تو نہیں لگتا تھا مگر پھر ایسی مزیدار عادت پڑ گئی تھی کہ اس کی پہل سے پہلے میں ہی اس کے ساتھ لپٹ جایا کرتا تھا۔ میرے گھر والے اور اُس کے بھی گھر والے ہمارے بھائی بہن کے رشتے کو شہ دے کر خوشیوں کا اظہار کیا کرتے تھے۔ میرے گھر والے اس لیے خوش تھے کیونکہ ہمارے اٹوٹ رشتے کی وجہ سے میری ماں کو مکان مالکن سے کچھ سننا نہیں پڑتا تھا۔ یعنی سیڑھیاں صاف نہیں کیں؟ دروازہ کھولنے میں دیر کیوں کی؟ اتنے سارے مہمان — کیا یہ گھر ہے یا سرائے؟ وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ اُس کے گھر والے اس وجہ سے خوش ہوا کرتے تھے کیونکہ بقول اُن کے میں نے ایک نیم مردہ میں نئی روح

پھینک دی تھی۔

موہنی عمر میں مجھ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھی اور وہ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی ایک Grasswidow تھی یعنی اُس کا شوہر اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایکٹر بننے کے لیے بمبئی گیا تھا اور یوں ایک رنگین و دلفریب خواب کی موہنی کو چند دنوں کی خوشیاں دے کر ایک روز آنکھ کھلتے ہی توڑ کر چلا گیا تھا، اس کے تمام زیورات اپنے ساتھ لے کر۔ سولہ سال کی عمر میں شادی کر کے وہ انیس سال کی عمر میں شوہر کے بغیر اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی اور پہلے سال گئی رات بھی قدموں کی آہٹ یا دستک کی آواز سن کر اپنے والدین کو جگا کر یہ کہا کرتی تھی: 'جموں سری نگر کا راستہ بند تھا نا۔ اب کھل گیا ہوگا'۔ پھر آہیں بھر بھر کر، جاگ جاگ کر، کروٹیں بدل بدل کر راتیں گزارنے کی عادی ہو چکی تھی اور دن بھر وہ اون منگوا کر اپنے شوہر کے لیے سوئٹرز بناتے بناتے اس فن کی ماہر ہو گئی تھی۔ میرے گھر میں آتے ہی وہ درجنوں سوئٹرز کھول کر دن بھر اون کے گولے بنا کر میرے لیے دلکش ڈیزائنوں میں سوئٹرز بناتی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ موہنی سے لپٹ کر ایک چودہ برس کے اسکول جانے والے کو موہنی کے لمس اور سائرہ کے چپک کر ساتھ بیٹھنے میں فرق محسوس ہوا تو اسکول سے آتے ہی موہنی سے مقناطیس کی طرح مل جایا کرتا تھا۔ پھر جب میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تب موہنی کے گھر والوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ بھی بطور ایک پرائیویٹ طالبہ کے میٹرک پاس کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کی کوشش کرے گی۔ چنانچہ بہ اتفاق رائے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ میں موہنی کے کمرے میں اِس کو پڑھایا کروں۔ ہم دونوں خوش تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کر پاتی اس نے ایک شناسا سا آواز سن لی اور دوڑتی ہوئی اپنے والدین کے پاس گئی۔ انھوں نے جب اُس کی باتوں پر یقین نہیں کیا تب وہ مجھے ساتھ لے کر پھاٹک تک گئی اور جونہی ایک آدمی ہاتھ میں اٹیچی لے کر صحن میں داخل ہوا تو جب موہنی اُس کے ساتھ لپٹ گئی تب مجھے مندر کے پجاری کی بات یاد آئی کہ موہنی ذہنی طور پر بیمار ہے اور جس پر اس کا دل آجائے اس کو اپنے بس میں کر لیتی ہے اور ڈائن بن جاتی ہے۔ اُس نے ہمیں کچھ دن پہلے مندر کے احاطے میں بات بات پر قہقہے لگا کر ایک دوسرے سے لپٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ ایک فتنہ گر حسد کی آگ میں جل کر بھڑاس نکال کر انگاروں پر پانی ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر موہنی کو ایک اجنبی، جس کی صورت بھی نہیں دیکھی جا سکتی تھی، سے لپٹ گئی تو مجھے بھی دال میں کچھ

کالا نظر آیا تھا۔ یوں لگا تھا گویا فلموں میں جیسے ایسی عورتیں خون چوس لینے کے لیے بوسہ دیتی ہیں۔ میں خوش تھا کہ موہنی نے کبھی مجھے بوسہ نہیں دیا تھا۔ موہنی اجنبی کو لے کر جونہی اپنے کمرے میں گئی تو میں نے موہنی کے والدین کو جگا دیا تھا مگر موہنی کی ماں نے نہایت چالاکی سے میرا اچھا ہوا بستر گول کر کے مجھے اپنے والدین کے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور کچھ دیر بعد وہ بھی میرے والدین سے سرگوشیانہ گفتگو کے ساتھ آنسو بہاتے رہے۔ دوسرے دن گویا گھر میں جشن تھا۔ میں نے معمول کی طرح صبح سویرے جب موہنی کو گلے سے لگایا تو میرے شانوں پر ایک وزنی گھونسہ پڑا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو گالوں پر طمانچوں کی بوچھار ہوتی رہی۔ موہنی نے آہستہ سے کہا کہ میرا منہ بولا بھائی ہے۔ موہنی کا شوہر گرج کے بول پڑا کہ ایسا بدتمیز لڑکا میرا سالا نہیں ہوسکتا ہے۔

موہنی نے میری طرف داری نہیں کی بلکہ گھر کے داماد اور اکلوتے وارث نے چند دنوں میں ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ہمیں دوسرے محلے میں کرائے کے مکان میں رہنا پڑا تھا۔ ہمارا اپنا گھر دریائے جہلم سے نکالی گئی ایک شاخ کنارے پر تھا۔ اس گھر کی کئی خوبیاں تھیں۔ دامن میں ایک گھاٹ جہاں محلے والے آیا جایا کرتے تھے۔ کبھی نہانے کی خاطر، کبھی گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر رومنتر کی طرح خیالات کا تبادلہ یا حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ۔ عورتیں علی الصبح نہانے آیا کرتی تھیں اور دن کو کپڑے دھونے کے لیے آ کر ایک دوسرے کی سکھ دُکھ کی باتیں کیا کرتی تھیں، پوشاک سے شناخت ہوا کرتی تھی کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان، جبکہ گفتگو کے موضوعات ایک جیسے ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ایک کنارے ایک مندر تھا اور دوسرے کنارے ایک مسجد۔ دونوں کناروں کو ملانے والا لکڑی کا پل تھا جس پر سحر سے گئی رات تک ٹریفک کا دباؤ رہتا تھا۔ پُرامن طریقے سے ہمارے گھر سے یہ سارا منظر نظر آیا کرتا تھا۔ ہمارے گھاٹ پر ایک کشتی لگی رہتی تھی جس میں ایک نہایت بدصورت شخص اپنی حد سے زیادہ خوبصورت بیوی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ دونوں میاں بیوی آپس میں جھگڑتے لڑتے رہتے تھے۔ انتہا یہ ہوا کرتی تھی کہ بیوی دوڑ کر میری ماں کے پاس آیا کرتی تھی اور جب دہکتا ہوا انگارہ راکھ بن کر اڑ جایا کرتا تھا تب واپس شوہر کے پاس جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی جب بیوی دوڑ کر پل سے کود کر جان دینے کے لیے اپنے شوہر کو للکارتی تھی تب شوہر اپنی بیوی راحت بیگم کا نام لے کر اُس کے کام کاج اور کردار کے قصیدے باندھ کر اس کو منا کر لے آتا تھا۔ موہنی نے میرے دل میں عورت کے لمس کی آرزو بلکہ ضرورت کے اتنے بیج بو ڈالے تھے

کہ میں راحت کے شاداب جسم سے لپٹنا چاہتا تھا اور بوسے کے کرشمات جان لینے کا خواہش مند یا طلبگار تھا۔ میں فلموں میں ہیرو کے نقشِ قدم پر چل کر ٹھوکریں کھا چکا تھا اس لیے ویلن کی طرح ہیروئن کو دبوچ کر حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے، اس موقعے کی تلاش میں تھا جب راحت میرے گھر آئے اور ماں گھر میں نہ ہو۔ آخر ایسا موقع مل ہی گیا تھا۔ راحت کے سینے کو اس کے شوہر نے اپنے ناخنوں سے کھرچ ڈالا تھا اور وہ میری ماں کے پاس مرہم لگانے آئی تھی کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اُس کے جاہل شوہر کو وحشی درندہ کہہ دے۔ یہ جان کر کہ وہ مجھ سے بات کر رہی ہے تو اُس نے زخم دکھاتے ہوئے اپنی عریاں چھاتی دکھا کر کہا تھا کہ چھوٹا بھائی بیٹا جیسا ہوتا ہے اور بڑا بھائی باپ جیسا ہوتا ہے، تو دوائی لگا دے۔ وہ وہاں پڑی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ٹنکچر آیوڈین لگاتے ہوئے ہاتھ اس لیے کانپ رہے تھے گویا درد کی شدّت میرے دل کو چھلنی کر رہی تھی۔ وہ ایک نیا احساس تھا دوائی لگا کر میں نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا تھا کہ وہ ایسے ظالم کو طلاق کیوں نہیں دیتی؟ تمھارا مذہب تمھارا محافظ ہے۔ راحت آہ بھر کر بول پڑی۔ کیا ایک ماں اپنے معذور بیٹے کو اپنی زندگی سے نکال دیتی ہے؟ نہیں نا؟ پھر میں اپنے نادان شوہر کو کیوں چھوڑ دوں؟ سمجھتا نہیں کہ یہ شکل وصورت خدا کے اپنے فیصلوں سے مل جاتی ہیں۔ کوے کا کالا رنگ اور کبوتر کو سفید رنگ خدا دیتا ہے۔ یہ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ کوئی خوبصورت کوئی بدصورت، کوئی لمبا، کوئی بونا، کوئی امیر کوئی غریب، کوئی طاقتور کوئی کمزور۔ ہندو گھر میں پیدا ہوا انسان خدا کی پرستش کرتا ہے۔ مسلمان کے گھر پیدا ہوا انسان عبادت کرتا ہے۔ مگر دونوں آدم زاد ہیں۔ یہ باتیں سمجھنے کی ہیں۔ میرا شوہر سمجھتا نہیں۔ اس لیے مجھے پنڈتوں کے گھروں میں کام کرنے سے روکتا ہے۔ مجھ پر تو نہیں ان لوگوں کی نیت پر شک کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ گہری باتیں کر کے مجھے گمراہ کرتے ہیں۔ اسی بات پر جھگڑا ہوتا ہے اور وہ بوکھلا کر مجھ پر بھی شک کرتا ہے۔ اس بار جھگڑا اس بات پر ہوا کہ تمھاری نیک ماں نے مجھے گرہن کے وقت چولہا جلانے، کھانا کھانے یا پانی پینے سے منع کیا تھا۔ وہ اس لیے کہ میں حاملہ ہوں۔ سمجھایا تھا کہ اپنی ہی ناؤ میں بیٹھ کر خدا کا نام لیتی رہوں۔ تسبیح بھی اُسی نے منگوا کر دی تھی۔ اور جب میرے شوہر نے مجھے چلم میں انگارے ڈالنے کے لیے کہا تو میں نے اپنے مجازی خدا کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اور اس نے شیر بن کر بکری کو دبوچنا چاہا مگر میں بکری نہیں ہوں، شیرنی ہوں اس لیے کوئی اور مجھے چھو کر تو دیکھے۔ چبا ڈالوں گی گاجر

مولی کی طرح۔ مگر اپنے شوہر کو کیا کروں۔ زخم دوں تو خود بھی تڑپ اُٹھتی ہوں۔ وہ درد سے چیخ پڑے گا تو میں کرب کی وجہ سے گھٹن محسوس کرتی رہوں گی نا؟ وہ نادان ہے۔ اگر میرا ہونے والا بچہ اپنے باپ جیسا ہوا تو کیا میں اس کو بھی چھوڑ دوں؟ یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ نرالے سہی! ایک اَن پڑھ عورت کی گہری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ لیکن جب سمجھ آ گئیں تب یوں لگا جیسے میرے مرحوم ابا، جو ایک شاعر بھی تھے اور اپنے دوستوں کے ساتھ فلسفیانہ باتیں کیا کرتے تھے۔ 'راحت' کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی چاول کی تھالی سے پتھر یا کچھ اور چُن چُن کر نکالتے ہوئے ابا مرحوم اور ان کے ہندو مسلمان ہم خیال دوستوں کی باتیں لفظ بہ لفظ سنا کرتی تھی۔ اور پھر مجھے اچانک یوں لگا تھا جیسے موہنی کی قربت کی وجہ سے جو چربی میرے دل و دماغ، ذہن، قول اور عمل پر حاوی ہو کر پیار و محبت کے جذبے کو دبا کر ایک عورت کے جسم کی خوبصورتی خاص طور سے سینے کے اُبھار اور اُس سے لپٹ کر دلکشی کے احساس کو بہت ہی تیز رفتار سے اپنا اثر بڑھاتی جا رہی تھی، وہ پگھل کر بہہ گئی تھی۔

راحت کے دونوں پستان میرے سامنے دو سفید بطخوں کی طرح پھڑ پھڑا کر چھو لینے کی دعوت دے رہے تھے مگر میں دوائی لگائے ہوئے حصّے کو دیکھتا رہا اور اپنے آپ کو عمر میں موہنی جتنی عمر سے فوراً ایک چھوٹا بچہ بن کر ماں کے زخم دیکھ کر بے ساختہ رو پڑا۔ راحت بھی ایک ماں کی طرح مجھ سے لپٹ پڑی حالانکہ وہ بھی مجھ سے پانچ یا چھ سال بڑی تھی مگر اُس کے ساتھ لپٹ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ پھر اگلی صبح جب مجھے میری ماں نے معمول کی طرح مندر جانے سے پہلے پڑھائی کرنے کے لیے جگایا تھا تو میں اَدھ کھلی کھڑکی سے جھانک کر دریا میں کپڑے اُتار کر پانی میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے اپنے مرمریں ہاتھوں سے اپنے شاداب سینے کو صاف کرتے ہوئے عورتوں کو دیکھنے کی بجائے پہلی بار پڑھائی کرتا رہا۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور میں بہت تیز دوڑ کر بھی منزل نہ پا سکا۔ اور فیل ہو گیا۔ والدین حیران تھے جبکہ میں اپنی ہی نظروں سے گر کر پشیمان تھا۔ میرے مرحوم والد نے میرا اسکول بدل دیا اور پڑھائی میں مدد کرنے کے لیے ایک مشہور اُستاد کے کوچنگ گروپ میں داخل کرا دیا۔

استاد کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ایک احمق کو بے وقوف بنا کر مطلب کا کام کراتے تھے جبکہ ذہین اسٹوڈینٹس کو بہتر سے بہتر بنا دیتے تھے۔ میری ذہانت کو بھانپ کر وہ خود بھی حیران

تھے کہ میں فیل کیوں ہوگیا تھا۔ ہمارے گروپ میں ایک ہی لڑکی تھی۔ سرسوتی پنڈت۔ وہ ہمارے استاد کی اِکلوتی اولاد تھی۔ اور اتفاقاً وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی تو مجھے لگا جیسے میرے جسم پر کسی نے ایک خوشبودار چادر ڈال دی ہو۔ غالباً سرسوتی کا بھی یہی حال تھا کیونکہ ہم دونوں بیک وقت ایک دوسرے کو کچھ گھبرا کر کچھ شرما کر دیکھتے رہے۔ گروپ میں وہی ایک طالبہ تھی جو جانتی تھی کہ میں فیل ہوا ہوں مگر وہ مجھے بات بات پر یہ احساس دلا رہی تھی کہ میں جینیس ہوں۔ شروع شروع میں اس کے قصیدوں میں طنز کی چاشنی ہوا کرتی تھی مگر اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے میں خاموش رہا کرتا تھا۔ جبکہ باقی لڑکے یوں باتیں کرتے رہتے تھے جیسے وہ کسی میلے میں ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے ہوں اور استاد کی آمد کے ساتھ ہی وہ سب معنی خیز نظروں سے مجھ پر اپنی نگاہیں جما کر مجھے ہی ملزم بنا ڈالنے کی سازش کیا کرتے تھے مگر سرسوتی میرا بچاؤ کرتی رہتی تھی۔ ایسی فلمی سچویشن تو دونوں کے پیار کو عیاں کر رہی تھی۔ سنجیدگی سے جب دونوں ایک دوسرے کے نوٹس پڑھنے کے لیے لے جایا کرتے تھے تب گروپ کے لڑکے ہمیں شک کی نظروں سے دیکھ کر من گھڑت کہانیاں ایک دوسرے کو سنا کر ہمیں کچھ کہنے کے لیے اُکسایا کرتے تھے مگر سرسوتی مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا کرتی تھی۔ ہم دوست تو تھے لیکن محبت کا اظہار نہ وہ کر رہی تھی اور نہ میں کر پا رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ فلموں میں اظہار کرنے کے لیے اتنی دیر تو نہیں لگتی۔

امتحان کے دوران ہم ایک دوسرے سے ملنے کے لیے اس قدر بے صبر ہوا کرتے تھے کہ اُس چوراہے پر ملنے کی خاطر نیم دوڑ کر پہنچ جایا کرتے تھے جہاں ہمارے امتحانات کے سینٹروں کے جانے والے راستے مل جایا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے جوابات ملا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ پھر وہ اپنے گھر جایا کرتی تھی اور میں اپنے گھر۔ اگر آپس میں بات چیت کرنے کا موقع مل جاتا تو موضوع اگلے دن ہونے والے پرچے کے بارے میں اندیشے اور چند مشکل سوالوں کے صحیح جوابات یا پھر ایک جلدی جلدی رِویژن جبکہ ہمارا پیچھا کرنے والے ہمارے ہی گروپ کے لڑکے یہ سمجھتے رہتے تھے کہ دو پیار کرنے والے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ ایک بار ایک فلمی منصوبے کے تحت زبردست بارش کی آڑ میں مندر کے احاطے میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہنا چاہا کہ اے دلربا! مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ مگر وہ ایسی لڑکی ثابت ہوئی جو پریکٹیکلز ختم ہوتے ہی مجھ سے ملے بغیر بلکہ اطلاع دیے بغیر اپنی نانی کے گھر چلی گئی۔

رزلٹ آؤٹ ہو گیا تو اتفاقاً دونوں کے نمبر ایک جیسے تھے۔ میں اپنے استاد کا شکریہ ادا کرنے ان کے گھر گیا تو اتفاقاً سرسوتی ہی ملی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑی اور کہنے لگی۔ 'ایک جیسے نمبر؟ تمھیں زیادہ نمبر لانے چاہیے تھے۔ After all you are a genius' میں نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا کہ 'میں جینیس ہوں، یہ کون کہتا ہے؟ تم یا تمھارے پاپا؟'

'پاپا کو میرے پرکھنے کا ہنر آتا ہے۔ تم جب ملے تھے تو ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ لڑکا ذہین ہے مگر خیالات میں آلودگی کی وجہ سے راستے سے بھٹک گیا ہے۔ شکر ہے کہ بھڑک نہیں اُٹھا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ امتحان کی تیاری کرو۔ ایک دوسرے کے نوٹس پڑھا کرو۔' میں چونک پڑا اور سرسوتی سے نہایت رومانی انداز میں پوچھا تھا 'گویا یہی مقصد، یہی مطلب ہمارے رشتے کی منزل تھی، میں سمجھا تھا دو ہم نفس، ہم نوا، ہمدم، ہمدرد ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ہم سفر بن جائیں گے، ایک نئی منزل تلاش کریں گے۔' سرسوتی دلچسپی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ایک لفظ سنتی رہی اور بے ساختہ ہنس پڑی اور بار بار کچھ بولنے کی کوشش کرتی رہی مگر چونکہ وہ اپنی ہنسی کو روک نہیں پا رہی تھی اس لیے بول نہیں پا رہی تھی۔ قہقہوں کو خوشی کا اظہار سمجھ کر میں بھی ہنس پڑا تو وہ بول پڑی۔ 'ارے واہ! تمھاری یہ ہنسی، بولنے کا انداز۔ میں یوں سمجھ بیٹھی گویا ایک فلم کا منظر دیکھ رہی تھی۔ تم ایک بہترین اداکار ہو! چھوڑ دو یہ پڑھائی اور بن جاؤ ایکٹر! تم بہت اچھے سنگر بھی ہو۔ میں نے تمھیں گنگناتے ہوئے سنا ہے۔'

تب میرا ماتھا ایک بار پھر ٹھنکا تھا کیونکہ یہ ایک فلمی سچویشن تھی۔ ہیروئن کا ہیرو کو چڑانا، ہیرو کا ناراض ہو کر منہ پھیر کر چلے جانا اور پھر ہیروئن کا ایک گیت گا کر لوٹ کر آنے کی التجا کرنا۔ اور پھر دونوں کے والہانہ محبت کا اظہار۔ یہ منظر ذہن میں اُبھرتے ہی میں ناراض ہو کر چلا گیا تھا یہ سوچ کر کہ شمع پروانے کو آواز دے کر کہہ دے گی کہ میں صرف تمھارے لیے جل رہی ہوں۔ لوٹ کر آؤ تا کہ دونوں اپنی منزل پا سکیں۔ لیکن سرسوتی نے نہ آواز دی اور نہ مجھے اپنے ٹوٹے ہوئے دل نے پلٹ کر دیکھنے دیا مگر میں یہ سمجھ گیا تھا کہ محبت ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی۔ فلموں کے نقشِ قدم پر منصوبہ بندی یا پہلی نظر میں پیار نہیں ہو جاتا ہے یہ بات مجھے سرسوتی کی جفا نے نہیں بلکہ اس کی سمجھداری نے سکھا دی تھی۔ سوچا تھا کہ ہم بچھڑ کر ملیں گے۔ اور ایک دھار مک میلے میں ہم مل بھی گئے تھے لیکن اس بار سرسوتی میری کیفیت بھانپ گئی تھی اس لیے ہاتھ میں ایک رتن دیپ لے کر

مجھے یہ احساس دلاتی رہی کہ دیپک سے دیپک جلایا جاتا ہے۔ چراغاں کیا جاتا ہے مگر کوئی نادان جوت کو پکڑنا چاہے تو وہ یا تو دیپک کی لَو کو بجھا دے گا یا پھر اپنے ہاتھ جلا ڈالے گا۔ دراصل اُس کو شاید خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اپنے پاپا کے چُرائے ہوئے مکالمے میں زندگی کا فلسفہ تھا مگر وہ جو کہہ گئی تھی، کئی برس بعد میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ تب میں نے سوچا تھا کہ سرسوتی کو اپنی پڑھائی کے علاوہ کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔

اگلے دو برس میں ہم نے دو محلے بدلے۔ پہلے نئے گھر میں ساتھ والے مکان میں رہنے والی ایک لڑکی، جس کی صورت ہالی ووڈ کی ایکٹریس ایوا گارڈنر سے ہو بہو ملتی تھی، اکثر میرے آگے پیچھے آ کر مجھ سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اور جونہی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا میں یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے پیار کرنے لگی تھی حالانکہ وہ مجھے بات بات پر ہنسانے والے ایک دوست کی حیثیت سے متعارف کیا کرتی تھی۔ میرا کمرہ مکان کے پچھلے حصّے میں تھا اس لیے ایک تنگ گلی کی دوسری طرف اکثر دو آنکھیں مجھے جھانکنے لگتی تھیں جب میں فلموں کے پُرسوز گانے گایا کرتا تھا۔ پھر محلے میں ایک شادی کی تقریبات میں حصّہ لینے والے محلّے کے لڑکے اور لڑکیاں آمنے سامنے کچھ نہ کچھ دلچسپ حرکتیں کر رہے تھے تب میرے گھر کے ساتھ والے گھر میں رہنے والی لڑکی نے مجھے تفریح کا انمول رتن کہہ کر سب کو میری ایکٹنگ یا یوں کہیے مانو ایکٹنگ دکھا کر ہنسایا تھا۔ پھر جوش میں آ کر وہ بھی میری کلاکاری میں حصہ لے کر خوب ہنستی رہی اور وہاں موجود ناظرین کو مستی کے عالم میں لے گئی۔ دراصل وہ کھل کر مجھے اپنا محبوب ظاہر کرنے کی جی توڑ کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی جذبات کی رَو میں بہہ کر کشور کمار کے مزاحیہ گانے گاتا رہا۔ لیکن اچانک میری نظریں ایک سفید رنگ سے ڈھکے سر پر رُک گئی۔ وہ مایوس تھی مگر غصّے سے اُس کے گالوں میں گلال کی رنگت کی بجائے انگاروں کی چمک تھی۔ وہ نظریں اٹھا کر مجھے دیکھ کر کہے سنے بغیر جانے لگی تو میں نے ہوا میں ایک مکالمہ پھینک دیا۔ چپ رہ کر مجھ سے چھپ کر اکثر میری آواز سننے والی میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ پھر جب ایک باوقار لڑکی نے پلٹ کر سرگوشیانہ لہجے میں مجھ سے پوچھا کہ کیا اس غیر سنجیدہ ماحول میں مسخرہ پن کو ٹھکرا کر ایک سنجیدہ ماحول پیدا کرنے کی خاطر کوئی پُرسوز، دل کی عمیق گہرائیوں میں اُترنے والا گانا گا سکتا ہوں؟ میں نے جب ہاں میں سر ہلایا تھا تب ایک موسیقی کے نکیتن میں سنگیت سکھانے والی اس لڑکی نے ہارمونیم پکڑ کر رات بھر میرے ساتھ کئی دوگانے گا کر

سبھی کا دل خوش کر دیا۔ اگلے روز دو لڑکیوں کا ایک ہی لڑکے کو اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھنا ایک ایسا مسئلہ بن گیا کہ ہم کو مجبوراً وہ مکان چھوڑ کر ایک نئے محلے میں جانا پڑا تھا اور جب میری ماں اپنا کچن بنانے میں مصروف تھی تب ایک لڑکی پرشاد دینے آئی۔ لڑکی کو دیکھ کر مجھے پہلی ہی نظر میں پیار ہو گیا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو یوں دیکھتے رہے گویا پل بھر کی پہچان سے یوں لگا جیسے ہم نے کئی جنم ایک ساتھ گزارے ہیں۔

وہ میرے گھر آ کر میری بیمار ماں کا خیال رکھا کرتی تھی۔ وہ نہ تو کوئی دانشمند تھی نہ دانشور تھی۔ فنونِ لطیفہ کے بارے میں اُس کو کوئی معلومات بھی نہیں تھی۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی مگر ذہین تھی۔ عقلمند تھی، دانا تھی، معصوم تھی اور بہت خوبصورت و خوب سیرت تھی۔ وہ کسی امیر کی بیٹی بھی نہیں تھی، ہاں مگر ایک اچھی ہم سفر ہونے کی جھلکیں دکھا کر مجھے چونکا بھی دیا کرتی تھی اس لیے پہلی بار مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہیر کا جنم رانجھا کے لیے ہوا تھا۔ ہم دونوں روز ایک ساتھ میلوں کا پیدل سفر طے کر کے باتیں کیا کرتے تھے۔

میں انجینئرنگ ٹریننگ کے لیے چلا گیا۔ وہاں ایک مسلمان گھر میں اُردو جرائد دستیاب ہونے کی غرض سے دوستی ہو گئی تھی۔ اور یوں گھر کا فرد ہونے کی وجہ سے اس خاندان کی اکیلی لڑکی ساحرہ سے دوستی کم اور پیار زیادہ ہو گیا تھا۔ نہ اُس کو اپنے مذہب کے بارے میں جانکاری تھی اور نہ مجھے اپنے مذہب کے بارے میں کچھ جانکاری تھی۔ یعنی وہ مسلم گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان تھی اور میں ایک سردست برہمن کے گھر پیدا ہونے کی وجہ سے ہندو تھا۔ ہم دونوں کو میری ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد اُس کی ایک رشتے کی بہن کی طرح بغاوت کر کے ان کے پاس امریکہ جانا چاہیے تھا اور یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ دل کے معاملات میں مذہب کا دخل نہیں۔ ہاں ساحرہ کے ساتھ فلم دیکھتے ہوئے مجھے سائرہ کی یاد آیا کرتی تھی۔ کالج کی گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے گھر لوٹ کر اپنی محبوبہ کو یہ بتانے آیا تھا کہ دوریوں کی وجہ سے اس کی شادی اگر ہو جائے تو روک نہیں پاؤں گا لیکن ہوا یہ تھا کہ جس دن میں نے گھر پہنچنا تھا اُسی روز میری محبوبہ نے اپنے گھر کے دروازے پر یہ اطلاع دی کہ میری شادی دس دن بعد ہونی ہے۔ میرے احتجاج کے باوجود میری ضدی ماں کی وجہ سے میری شادی ایک اجنبی لڑکی سے ہوئی تھی۔ تب میری عمر ۱۹ سال سے کم تھی اور میری بیوی کی عمر ۱۷ سال سے کم تھی۔

میری زندگی بدل گئی اور ایک رات نے ایک لڑکے کو ایک مرد بنا دیا۔ ۲۵ سال کی عمر میں، میں تین بچوں کا باپ بن گیا۔ ایک انجینئر ہونے کے ساتھ ایک افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور محفلوں میں چھا جانے والے اُردو کی غزلیں گانے والے ایک خوبرو نوجوان کی زندگی میں کئی لڑکیاں آتی جاتی رہیں لیکن بچوں کی خاطر میں نے ارمانوں کو آگ لگا کر آرزوؤں کی حسرتوں کی راکھ میں بدل دیا۔ زندگی تلخ بنتی گئی اور میں اپنی بیوی کو ہی ذمہ دار ٹھہرا کر اس کو نظر انداز کرتا رہا۔

لیکن آج ۶۵ سال کی عمر میں نہ میرے قریب سائرہ ہے نہ ساحرہ، نہ موہنی ہے اور نہ سرسوتی ہے۔ اور نہ میری شکل وصورت، ذہانت، فنکارانہ صلاحیتوں، رتبے یا وقار سے پیار کرنے والی وہ لڑکیاں یا عورتیں ہیں۔ میری طرح اُن سب کے پوتے نواسے ہوں گے۔ اپنی دنیا میں غم اور خوشی دونوں رنگ دیکھ رہے ہوں گے۔ زمین پر چل رہے ہوں گے۔ آسمان کو دیکھ رہے ہوں گے جبکہ میں ایک کمرے میں ایک اپاہج، نظریں اٹھا کر کمرے کی چھت دیکھتا ہوں۔ اپنے قریب ہر وقت اپنی وفادار بیوی کو پاتا ہوں۔ اپنے اِرد گرد اپنے بچوں اور دو پوتوں اور ایک نواسی کو دیکھ کر راحت محسوس کرتے ہوئے راحت کی باتیں یاد کرتا ہوں۔ خاص طور پر اُس کی یہ بات کہ اگر میرا بیٹا اپنے باپ پر گیا ہو تو کیا اس کو چھوڑ دوں؟ نہیں نا؟ پھر میں اپنے شوہر، اپنے مجازی خدا کو کیسے چھوڑ دوں۔ اگر وہ مجھے اذیتیں پہنچاتا ہے تب بھی نہیں۔

یہی میری بیوی کی کیفیت ہے۔ میں جب نظریں جھکا کر اپنے شرمندگی کا اظہار کرتا ہوں تب وہ میرے ہاتھ میں قلم تھما کر میرے سامنے کورا کاغذ رکھ کر پیار سے کہتی رہتی ہے بیوی کو تو موت ہی آپ سے الگ کر سکتی ہے۔ اپنی محبوبہ (یعنی لکھنے پڑھنے کے جنون) کو پکڑ کر رکھ لو، ورنہ ہاتھوں سے نکل جائے گی!

○○

ہمارے ملک میں چند تنظیمیں و ادارے اُردو زبان کو دوسری زبان کا درجہ دلانے کے لیے ملک گیر آندولن چلا تو رہے ہیں مگر اُردو ادب کو حیات بخشنے والے وہ سرکاری یا غیر سرکاری یا سیاسی جماعتیں نہیں ہیں بلکہ چند معیاری بین الاقوامی جرائد کے مدیران ہیں جو اُردو ادب سے جنون کی حد تک محبت کرنے والے قارئین کو تخلیق کاروں سے جوڑ دیتے ہیں۔

میں دل کی گہرائیوں سے دونوں کو سلام کرتے ہوئے ان کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں ۱۱ رستمبر ۱۹۴۰ء کو سرینگر کشمیر میں ایک اسکول ماسٹر آنجہانی پنڈت پریم ناتھ پٹواری کے یہاں پیدا ہوا، جو سرور کشمیری کے قلمی نام سے اپنے دَور کے جانے مانے شاعر اور نثر نگار تھے، اس لیے میں خوش بخت ہوں کہ مجھے تخلیقی صلاحیت وراثت میں گھر میں رہ کر لڑکپن سے ادبی ماحول ملا اور کسی حد تک تربیت بھی ملی۔

کہتے ہیں تخلیق کاروں کے لیے پیشہ ان کی بیوی کا رتبہ حاصل کرتا ہے جبکہ شوق ایک محبوب بن جاتی ہے۔ وہ تخلیق کار خوش بخت ہوتے ہیں جن کی محبوبہ ہی ان کی شریک حیات ہوتی ہے۔ چونکہ میں نے سول انجینئرنگ میں گریجویشن کیا ہے اس لیے سرکاری ملازمت کرنا ایک ضرورت بن گئی تھی۔ پھر بھی میں نے ۱۹۶۵ء میں اپنے ادبی سفر کی شروعات کی۔ اور اب تک ۲۶۰ عدد کہانیاں 'شاعر'، 'آجکل'، 'انتساب'، 'فنون'، 'رنگ و بو'، 'پیامِ اُردو'، 'خوشبو کا سفر'، 'ایوانِ اُردو' کے علاوہ تقریباً ۵۰ عدد جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈراموں کے دو عدد مجموعے بعنوان 'آخری دن' اور 'انسان'، دیوناگری لپی میں، ایک نظمیہ ناولٹ بعنوان 'کب بھور ہوگی'، اپنی مادری زبان کشمیری میں، افسانوں کا مجموعہ بعنوان 'علم'۔ چھ عدد اُردو کہانیوں کے مجموعے بعنوان 'فرشتے خاموش ہیں'، 'دوسری کرن'، 'بے چین لمحوں کا تنہا سفر'، 'آواز سرگوشیوں کی'، 'ایک ادھوری کہانی' اور 'اُفق' ہیں۔ 'دائرے' میرا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے۔ اُمید کہ قارئین پسند فرمائیں گے۔

جموں یونیورسٹی کی دو طالبات نے میرے افسانوی مجموعے 'بے چین لمحوں کا تنہا سفر' اور میرے ڈراموں کے مجموعے 'انسان' پر مقالے لکھ کر ایم فل (M.Phil) کی سند حاصل کر لی ہے۔ انعامات سے نوازا گیا ہوں مگر ایوارڈ سے زیادہ خوشی تب ملتی ہے جب اجنبی قارئین کے خطوط ڈاک میں ملتے رہتے ہیں۔

اگست ۱۹۸۸ء میں میری کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی، بچ تو گیا تھا مگر رفتہ رفتہ میرا انجینئرنگ کا پیشہ ڈوبتا گیا۔ میں چند سال بعد نہ بول سکا نہ چل پھر سکا۔ ہاں، علم کی دیوی نے میرے ہاتھ میں قلم اور سامنے قرطاس رکھا۔ میں لکھتا رہا اور لکھتا رہوں گا۔ دعا کرتا رہتا ہوں کہ میری آخری سانس تک میرے ہاتھ میں قلم رہے اور قرطاس سمیٹنے والا کوئی میرا قدرداں ہو۔

وریندر پٹواری